آغا صاحب

(ڈاکٹر آغا سہیل کی حیات و فن)



ڈاکٹر سید شبیہ الحسن

آغا صاحب

(ڈاکٹر آغا سہیل کی حیات وفن)

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن

الحسن پبلی کیشنز

۲۵۳ ـ ایف رحمان پورہ لاہور ـ پاکستان

۱۹۹۸ء

آغا صاحب

ڈاکٹر شبیہ الحسن

طابع

سید رونق رضا

مطبع

رضا سنز پرنٹرز، شمع پلازہ، لاہور

سرورق

سید علی رضا

کمپوزنگ

فاروقی کمپوزنگ سینٹر

خواجہ آرکیڈ وحدت روڈ لاہور ۵۸۶۸۰۶۴-۵۹۱۳۰۲

قیمت

۳۵۰ روپے

یکے از مطبوعات

الحسن پبلی کیشنز ۲۵۳-ایف رحمان پورہ لاہور

انتساب

جناب اظہار احمد

اور

جناب چودھری محمد اشرف

کی

علم دوستی کے نام

مندرجات

ڈاکٹر طیب الحسن

(۱)

شعر و ادب کی نامور ہستیاں اپنے فکری جلال و جمال کی وجہ سے حیات جاوداں کی حقدار ہو جاتی ہیں۔ ان کی تحریریں ان کی شخصیت کے متنوع پہلوؤں کی آئینہ دار ہوتی ہیں۔ ان کی معلومات و مشاہدات اور جذبات و احساسات کے طرز اظہار سے مصنف کے علاوہ اس دور کے پورے حالات کا نقشہ ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ ہر باشعور مصنف کی تحریر کا کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہوتا ہے اور یہی مقصدیت زندگی کی روح اور ادب کی جان ہوتی ہے۔ اسی سے مصنف کی پختہ کاری ' وسیع المشربی اور روشن ضمیری کا اندازہ ہوتا ہے۔

شاعر ہو یا ادیب وہ عوامی شعور سے اپنا ذاتی شعور منسلک رکھتا ہے۔ اس کی تخلیقات میں معاشرتی حالات و واقعات ' سماجی عیوب و محاسن اور تہذیب و ثقافت کی جھلکیاں دیکھی جا سکتی ہیں۔ عظیم شاعر اور اعلیٰ پائے کا مصنف اپنے شعور و ادراک کو اخلاقی قدروں سے جوڑ دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عظیم تخلیق کار کسی عہد یا خطے تک محدود نہیں ہوتا بلکہ اس کی تخلیق میں پوری کائنات کے مسائل موجود ہوتے ہیں اور وہ تخلیق پوری دنیا پر اپنے اثرات مرتب کرتی ہے۔ بظاہر تو وہ اپنے جذبات و نظریات کی پیش کش کرتا ہے مگر اس کی تحریریں اس دور کے ہر انسان کے دھڑکتے ہوئے دل کی ترجمانی کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ افسانے ہوں یا مقالات ' خاکے ہوں یا سفرنامے ' ناول ہوں یا مضامین سب کے سب ابلاغ فکر و نظر اور اظہار حسن عمل کے ذریعے ہیں۔ کور چشموں کی تو بات الگ ہے تاہم چشم معنی آشنا ان تخلیقات میں پوری انسانیت کا شعور جلوہ گر دیکھ سکتی ہے۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ عظیم فنکار کا اسلوب تحریر قاری کو متاثر کرنے کا سبب بنتا ہے۔ انسان سادگی ' بے تکلفی اور بے ساختہ انداز کا ہمیشہ رسیا رہا ہے اسے یہ باتیں جس مصنف کی تحریر میں نظر آتی ہیں وہ اسے

اپنا آئیڈیل بنا لیتا ہے۔ اب یہ مصنف کی صلاحیت اور ہنر مندی پر منحصر ہے کہ وہ آپ بیتی کو جگ بیتی بنا کر پیش کرے تاکہ اس کے حلقہ اثر میں اپنی ذات نہیں بلکہ کل کائنات آ جائے۔

یہ امر انتہائی ملال انگیز ہے کہ تقسیم برصغیر کے وقت ہمارا تہذیبی اور ثقافتی ورثہ زمانے کے ہاتھوں برباد ہو گیا۔ بجی سجائی تہذیب اجڑ گئی اور بیش بہا علمی اور ادبی سرمایہ برباد ہو گیا۔ نئی علمی اور ادبی مسند بچھانا اور نئی بساط فراہم کرنا صدیوں کا عمل ہے۔ اس صورت حال کا اظہار اردو شعر و ادب میں بار بار ہوا ہے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد ادیبوں نے کثرت سے اپنی تحریروں میں اس کرب اور بے چینی کا اظہار کیا ہے جس سے وہ براہ راست یا بالواسطہ متاثر ہوئے۔ مقام مسرت ہے کہ ہمارے ادیبوں نے بگڑی ہوئی ادبی صورت حال کو سہارا دیا اور بے سرو سامانی کے باوجود ایسے ایسے فن پارے تخلیق کیے جن کا عالمی سطح پر استحسان اور استقبال ہوا۔ آج انہی عظیم تخلیق کاروں کی بدولت پاکستان کا ادبی سرمایہ کسی بھی دوسرے ملک کے علمی و ادبی سرمائے سے کم نہیں ہے۔ پاکستان کے علمی و ادبی سرمائے کو سربلند، معتبر اور فزوں تر بنانے والے فنکاروں میں ایک معزز اور معتبر نام ڈاکٹر آغا سہیل کا بھی ہے۔

ڈاکٹر آغا سہیل لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور زوال آمادہ لکھنؤ کی رونقوں کو اپنی نگاہوں میں سمیٹ کر پاکستان آ گئے۔ یہاں آ کر انہوں نے لکھنوی تہذیب و ثقافت کو حرز جاں بنائے رکھا مگر جلد انہیں معلوم ہو گیا کہ پاکستانی تہذیب و ثقافت لکھنوی مزاج کو برداشت نہیں کر سکتی۔ آغا سہیل کا وصف یہ ہے کہ انہوں نے پاکستانی ثقافت کو تو دل و جان سے قبول کر لیا لیکن لکھنؤ کی نفاست اور نفاہت کو ترک نہ کیا۔ اس طرح آغا سہیل کی شخصیت میں لکھنؤ اور لاہور کی ثقافت کے جوہر یکجا ہو گئے ہیں۔

آغا سہیل کی ادبی زندگی کا آغاز تو لکھنؤ میں ہوا لیکن اس پر شباب لاہور میں آیا۔ ان کی تمام تصانیف لاہور میں طبع ہوئیں اور ان کی زندگی کا بیشتر حصہ اہل لاہور کی علمی و ادبی خدمت کرتے گزر گیا۔ آغا سہیل کی اعتراف عظمت کے لیے کئی تقاریب ہوئیں اور ان کی علمی و ادبی خدمات کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے کئی سیمینار منعقد ہوئے۔

برصغیر پاک و ہند کے تمام معتبر ناقدین نے آغا سہیل کی فنی ہنرمندیوں کا اعتراف کیا ہے درحقیقت یہ کتاب بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

اب ذیل میں آغا سہیل کے فن کے تمام نمایاں پہلوؤں کے حوالے سے چند معروضات پیش خدمت ہیں۔

(۲)

ڈاکٹر آغا سہیل اردو کے معروف افسانہ نگار ہیں وہ نصف صدی سے اس صنف کی آبیاری کر رہے ہیں۔ ان کے سینکڑوں افسانے معروف علمی و ادبی رسائل میں طبع ہو کر ارباب دانش و بینش سے خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ ڈاکٹر آغا سہیل کے افسانوں کے درج ذیل پانچ مجموعے بھی زیور طبع سے آراستہ ہو چکے ہیں۔

(ا)	بدلتا ہے رنگ آسماں	(۱۹۷۵ء)
(ب)	شہر نا پرساں	(۱۹۸۳ء)
(ج)	تل برابر آسمان	(۱۹۸۶ء)
(د)	اگن کنڈلی	(۱۹۹۱ء)
(ر)	بوند بوند پانی	(۱۹۹۵ء)

آغا سہیل لکھنوی تہذیب و تمدن کی چلتی پھرتی تصویر ہیں۔ انہوں نے اس تہذیب کو اجڑتے بلکہ مٹتے دیکھا ہے ان کی دیرینہ خواہش رہی ہے کہ اس بگڑتی تہذیب کی عظیم روایات کسی بھی قیمت پر محفوظ ہو جائیں۔ وہ عملی طور پر تو کچھ نہیں کر سکتے تھے لیکن علمی سطح پر انہوں نے اپنی تحریروں میں اس تہذیب کے نقش و نگار کو محفوظ کرنا شروع کر دیا جس طرح غالب نے مغلیہ تہذیب کو اپنی شاعری میں محفوظ کر دیا ہے بالکل اسی طرح آغا سہیل نے لکھنوی تہذیب و معاشرت اور عادات و رسومات کو اپنے افسانوں میں محفوظ کرنے کی شعوری کوشش کی ہے۔ آپ آغا سہیل کے لکھے ہوئے ابتدائی افسانے پڑھیئے زندہ لکھنؤ سے آپ کی ملاقات ہو جائے گی۔

آغا سہیل ترقی پسند تحریک سے عملی سطح پر متاثر بلکہ وابستہ رہے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ سماج کے بدلتے ہوئے رجحانات اور رویوں پر ان کی گہری نظر رہتی ہے۔ وہ عصری تحاریک' معاشرتی کشمکشوں' سیاسی اتار چڑھاؤ اور تمدنی تبدیلیوں سے بطور خاص آگاہ رہتے ہیں اور یہ تمام باتیں ان کے افسانوں میں نہایت فنکاری کے ساتھ جگہ بناتی ہیں۔ انہوں نے ہر ممکن کوشش کی ہے کہ اپنے افسانوں کو ترقی پسندانہ خیالات کا مظہر تو بنائیں لیکن نظریے کو نعرہ نہ بننے دیں۔ یہی سبب ہے کہ ان کے افسانوں میں ایک خاص ٹھہراؤ اور سکون کی کیفیت جلوہ گر ہے جو قاری کے دل و دماغ پر اپنے اثرات مرتب کرتی ہے۔

آغا سہیل کے افسانوں میں ایک ارتقائی سفر کا کھوج لگایا جاسکتا ہے۔ ان کے ابتدائی افسانوں میں مقامیت کا عنصر نمایاں ہے۔ وہ لکھنؤ کی تہذیب و ثقافت کے بیان میں اپنی بہترین صلاحیتیں صرف کرتے رہے ہیں۔ لکھنؤ سے ان کی جذباتی وابستگی میں اس وقت کمی محسوس ہوتی ہے جب وہ پاکستانی تہذیب و ثقافت کو ذہنی طور پر قبول کرلیتے ہیں۔ اس زمانے کے افسانوں میں مقامیت سے زیادہ وطنیت کا احساس جلوہ گر ہے اس کے بعد وہ وطنیت کا دائرہ توڑ کر بین الاقوامی سطح کو چھوتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں اس عہد کے افسانوں میں تیسری دنیا کے مسائل بطور خاص ان کا موضوع بنتے ہیں۔ انہوں نے اس دور میں مجبور و مظلوم اور بے کس عوام کے مسائل کو اپنے افسانوں میں جگہ دی ہے اس دور کے افسانوں میں آغا سہیل کا ذہنی افق وسیع سے وسیع تر ہو جاتا ہے۔ آغا سہیل کے افسانوی سفر کی اگلی منزل مابعد الطبیعاتی عناصر کی پیش کش ہے۔ ان کے بہت سے افسانوں میں روحانی اور مابعد الطبیعاتی عناصر کی گونج سنائی دیتی ہے۔ آغا سہیل کا یہ افسانوی سفر ہنوز جاری ہے اور ممکن ہے کہ کچھ عرصہ کے بعد اس میں کوئی خاص پڑاؤ ناقدین کی توجہ کا سبب بن سکے۔

آغا سہیل کے افسانوں میں نفسیاتی ژرف بینی بھی ملتی ہے۔ ان کے بیشتر افسانے نفسیاتی کشمکش کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ نفسیاتی کشمکش کبھی جنسی الجھاؤ کے سبب سے ظاہر ہوتی ہے اور کبھی اس کا محرک معاشرتی ہیجان خیزی بنتی ہے آغا سہیل ایک ماہر اور چابکدست افسانہ نگار کی طرح ان گتھیوں کو سلجھانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ بعض

اوقات قاری ان کے افسانوں میں سطحی جنسی جذبات بھی محسوس کرتا ہے لیکن اسے جلد ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ بین السطور میں کتنی بڑی بات یا حقیقت پوشیدہ رکھی گئی ہے۔

آغا سہیل کے افسانوں میں طرح طرح کے کردار ہمارے سامنے آتے ہیں' ان کے زیادہ تر کردار واحد متکلم ہوتے ہیں جو مصنف کی اپنی شخصیت کی عکاسی کرتے ہیں۔ آغا سہیل کے کردار وقتی طور پر تو قاری کے ذہن پر اثر انداز ہوتے ہیں لیکن وہ اپنا پائیدار نقش ثبت نہیں کرپاتے۔ یہی سبب ہے کہ آغا سہیل کے افسانوں میں کوئی ایسا جیتا جاگتا کردار خلق نہیں ہوا جو افسانوی تاریخ میں جگہ پاسکے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ آغا سہیل کے نسوانی کردار مردوں کی نسبت زیادہ جاندار اور پائیدار ہوتے ہیں اور وہ قارئین پر ایک گہرا تاثر چھوڑ جاتے ہیں۔ آغا سہیل کے افسانوں میں زبان کی کئی سطحیں ملتی ہیں تاہم سب پر لکھنؤی زبان کا سایہ ہے۔ آغا سہیل لکھنؤ کی ثقہ اردو بولتے اور لکھتے ہیں یہی سبب ہے کہ ان کے افسانوں کی زبان کوثر سے دھلی معلوم ہوتی ہے آغا سہیل کے افسانوں میں کومل اور نازک الفاظ بعض اوقات ثقیل خیالات کو بھی سادہ اور عام فہم بنادیتے ہیں آغا سہیل شعوری کوشش کرتے ہیں کہ ان کے افسانوں کی زبان موضوع کے عین مطابق ہو تاہم بعض اوقات فطری طور پر ان کی زبان ثقیل ہو جاتی ہے۔ آغا سہیل کی افسانوی لغت جان لینے کے بعد قاری پر سکون طریقے سے افسانے کے مزاج و اسلوب سے آگاہ ہو جاتا ہے۔

اب ذیل میں آغا سہیل کے افسانوں کے پانچوں مجموعوں پر ضمنی طور پر چند معروضات پیش خدمت ہیں۔

(۱) ڈاکٹر آغا سہیل کے افسانوں کا پہلا مجموعہ "بدلتا ہے رنگ آسماں" اقبال بک کارنر لاہور سے ۱۹۷۵ء میں شائع ہوا۔ یہ مجموعہ اردو کے معروف ترقی پسند شاعر حسن عابد کے نام معنون کیا گیا ہے۔ آغاز میں مصنف کے کوائف اور تصانیف کے نام درج ہیں۔ دوسرے مجموعوں کے برعکس یہ مجموعہ ملک کے معروف ناقدین کی آرا سے مزین ہے۔ کتاب کے ڈسٹ کور پر محمد علی صدیقی' الطاف فاطمہ' احتشام حسین' احمد ندیم قاسمی' خدیجہ

مستور' جون ایلیا' احمد جمال پاشااور ڈاکٹر شارب ردولوی کی آرا بھی پیش کی گئی ہیں۔ ۳۱۹ صفحات پر مشتمل یہ مجموعہ صوری اعتبار سے دلکش ہے۔

"بدلتا ہے رنگ آسماں" میں درج ذیل چوبیس (۲۴) افسانے شامل ہیں۔

پتنگا	سہ پہل	ہار
رشوت	رشتہ	ٹوٹی چٹنی
بازی گر	ٹھکانہ کہیں نہیں	سوروداروکوٹ
آخری مورچہ	شگاف در	مالکن
من ماں راکھوں	موئے آتش دیدہ	پان
پرچم	کنجی	بدلتا ہے رنگ آسماں
ڈبویا مجھ کو	محل سرا	قوم
دعا	زبان خنجر	آخری ہاتھ

"بدلتا ہے رنگ آسماں" کی اشاعت کے بعد ناقدین نے اس مجموعہ کے حسن و قبح پر روشنی ڈالی اور اس مجموعہ کو جدید اردو افسانے میں ایک سنگ میل قرار دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ آغا سہیل نے ان افسانوں میں ایک بدلتے ہوئے سماج کا قصہ چھیڑا اور ایک مٹتی ہوئی تہذیب کے نقوش اجاگر بلکہ محفوظ کرنے کی کامیاب سعی کی ہے۔ اس کتاب کا عنوان بھی آسمان کی اس گردش کا احاطہ کرتا ہے جو ایک زمانے' تہذیب اور تمدن کو ختم کر کے دوسرے دور کی تہذیبی اور تمدنی روایات کو ہمارے سامنے لاتا ہے اس حوالے سے ڈاکٹر سہیل احمد خان کی یہ رائے انتہائی وقعت کی حامل ہو جاتی ہے۔

The Short Stories of Agha Suhail take their shape from two spheres of experience. The dominant theme of these

stories is a pattern of life which is slowly vanishing away, some vivid characters with their cultural peculiarities, reminiscences of Lucknow and a set atmosphere of cultural values. The other side of Agha Suhail's fiction portravs the social changes of the recent past. Agha Suhail, with a disturbed vision looks at the moral degeneration, nugrations and clashes which are the product of recent historical situation of the sub-continent. The title of his book toc suggests this change and upheaval.

(The Pakistan Times, August 31, 1975)

اس افسانوی مجموعہ میں موضوعات کے ساتھ ساتھ آغا سہیل نے زندہ زبان استعمال کی ہے۔ مجموعی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ مخصوص موضوعات کو آغا سہیل نے عمومی موضوعات کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے اور زبان و بیان پر ان کی قدرت نے اسے چار چاند لگا دیے ہیں اس مجموعہ کے بارے میں احمد ندیم قاسمی کی رائے سن لیجئے۔

"آغا سہیل کے یہ افسانے موضوعات' کہانی کی بنت' زبان و بیان اور سلیس انداز اظہار کے لحاظ سے جدید افسانہ نگاری کے سنگ میل ہیں۔ بظاہر ننھے منے مگر معاشرتی' معاشی' تہذیبی اور سیاسی لحاظ سے نہایت بلیغ موضوعات کو اپنے افسانوں میں سمو کر آغا سہیل نے ایک نہایت باشعور فنکار ہونے کا ثبوت فراہم کیا ہے۔"

(رسالہ فنون لاہور دسمبر ۱۹۷۵ء)

"بدلتا ہے رنگ آسماں" میں آغا سہیل نے افسانوں کے مختلف ذائقوں سے قارئین کو روشناس کیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان کے اس مجموعے میں رنگا رنگ افسانے قاری کے ذہنی افق کو وسیع کرتے ہیں۔ اس حوالے سے ڈاکٹر انور سدید کی رائے ملاحظہ فرمایئے۔

"اس مجموعہ میں اردو افسانے کے بیشتر نئے اور پرانے رجحانات کی جھلکیاں موجود ہیں۔ بعض افسانے خالصتاً مشرقی ہیں اور ان میں مصنف کا اصلاحی جذبہ صاف دکھائی دیتا ہے۔ چند ایک افسانوں پر ترقی پسندیت غالب ہے اور ان میں افسانہ پروپیگنڈا کی سطح کو چھوتا ہوا نظر آتا ہے۔ کچھ افسانوں میں صرف ایک لمحاتی تاثر کو گرفت میں لینے کی کوشش کی گئی ہے جبکہ چند ایک افسانے علامتی طرز اظہار میں بھی لکھے گئے ہیں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آغا سہیل ادب کو کسی ایک خانے میں مقید نہیں کرتے بلکہ ہر نئے تجربے کو اپنانے کی کوشش کرتے ہیں۔"

(ڈاکٹر انور سدید۔ رسالہ اوراق لاہور نومبر ۱۹۷۵ء)

اس افسانوی مجموعہ کے بارے میں یوں تو ہر ناقد نے اپنے اپنے وقیع خیالات پیش کر کے اس کے مطالعہ کے نئے نئے گوشے دریافت کیے ہیں تاہم ڈاکٹر اعجاز راہی اس مجموعہ کے بارے میں رقمطراز ہیں۔

"بدلتا ہے رنگ آسماں" اس لحاظ سے ایک مختلف مجموعہ ہے کہ اس میں عصری تکنیک اور عصری فکر سے ایک حد تک گریز کا رویہ نمایاں نظر آتا ہے۔ ممکن ہے افسانہ نگار نے شعوری طور پر ایسا کیا ہو لیکن اس رویے نے ان کے افسانے کو تھکے ہوئے اس فریم میں فٹ کر دیا ہے جسے نیا دور کب کا رد کر چکا ہے۔ اسی

طرح فرسودہ تکنیک کو استعمال کرکے اپنے موضوعات کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ آغا سہیل نے بہت سے افسانوں میں بڑی بات کہنے کی کوشش کی ہے لیکن ان کا اسلوب اور افسانے کی بنت تاثر بڑھانے میں مانع رہی ہے۔ ان کا افسانہ "رشوت" "ٹوٹی چپنی" اور "آخری مورچہ" اسی ذیل میں آتے ہیں جہاں اسلوب اظہار میں رکاوٹ بنتا ہے۔

(ڈاکٹر اعجاز راہی رسالہ احساس پشاور ستمبر ۱۹۷۵ء)

مجموعی طور پر کہا جاتا ہے کہ یہ مجموعہ ڈاکٹر آغا سہیل کی پر اثر شخصیت اور مہذب اسلوب کی نمائندگی کرتا ہے آخر میں شبنم رومانی کی یہ رائے بھی سن لیجئے۔

"آغا سہیل میاں آدمی ہیں۔ نہایت صاف ستھرے' مہذب اور متین۔ وضعدار اور وفاشعار۔ جاں نواز اور مہمان نواز۔ ان کے چوبیس افسانوں کا نیا مجموعہ "بدلتا ہے رنگ آسماں" حال ہی میں آیا ہے۔ یہ افسانے زندگی کی اعلیٰ اقدار کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ہمیں محمد علی صدیقی صاحب کی اس رائے سے اتفاق ہے کہ آغا سہیل نے اپنے لہجہ میں بات کرنے کا ڈھنگ نکالا ہے اور ان کے افسانے بھی ان ہی کی طرح شریف زادے ہیں۔"

(شبنم رومانی۔ روزنامہ جنگ کراچی ۱۷ ستمبر ۱۹۷۵ء)

(ب) آغا سہیل کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ "شہر نا پرساں" پہلی مرتبہ ۱۹۸۳ء میں شائع ہوا۔ سنگ میل پبلی کیشنز کے مہتمم نیاز احمد نے اسے لاہور سے شائع کیا۔ ۱۷۶ صفحات پر مشتمل یہ افسانوی مجموعہ صوری اعتبار سے انتہائی جاذب نظر ہے۔ مصنف نے یہ مجموعہ افسانہ نگار شور صہبائی کے نام معنون کیا ہے۔ اس کتاب میں ابتداً مصنف کے کوائف ہیں

اور بعد میں مصنف کا تحریر کردہ پیش لفظ بھی ہے۔ ڈاکٹر آغا سہیل نے اپنے مزاج کے برعکس اس کتاب میں پیش لفظ شامل کیا ہے تاہم وہ اس میں رقم طراز ہیں۔

"میرے پہلے مجموعہ میں کوئی دیباچہ یا پیش لفظ شامل نہیں تھا۔ میں اب بھی اس کا قائل نہیں ہوں۔ میرے ناول غبار کوچہ جاناں میں بھی یہ تکلف موجود نہیں کیونکہ میں یہ چاہتا ہوں کہ قارئین براہ راست میری تخلیق سے رابطہ قائم کریں اور میرے نقطہ نظر سے مطلقاً کوئی اثر قبول نہ کریں۔ ناقدین اور مبصرین کو بھی مرعوب کرنا مجھے ناپسند ہے۔ رہا یہ کہ میرے نقطہ نظر کی وضاحت کیونکر ہو تو اس کے لیے مجھے عرض کرنے دیجیے کہ "ایاز قدر خود بشناس" کے مصداق مجھے اپنی طالب علمانہ حیثیت کا بخوبی احساس ہے اگر اس تخلیقی سفر میں بھی میرے مساعی مشکور ہوئے تو قارئین خود ہی تقاضہ کرلیں گے ورنہ معاملہ جوں کا توں ہی رہنا چاہیے۔"

(پیش لفظ۔ شہر نا پرساں ص ۵)

شہر نا پرساں میں درج ذیل اکیس (۲۱) افسانے شامل ہیں۔

(۱) فاصلہ	(۲) نئی بستی	(۳) جزاک اللہ
(۴) گینوی اے بی بی	(۵) پس دیوار	(۶) سرا
(۷) ہاتھی کے دانت	(۸) سانچ کی آنچ	(۹) اناللہ
(۱۰) گانٹھ	(۱۱) قرض	(۱۲) بڑا آدمی
(۱۳) کھویا ہوا بچہ	(۱۴) کارواں دل کا	(۱۵) اپنا آدمی
(۱۶) کہوں تو کھ جر جائے	(۱۷) شہر ناپرساں	(۱۸) کرسٹوفر
(۱۹) لمن الملک الیوم	(۲۰) وقت اٹھے گا	(۲۱) کھڑکی

ڈاکٹر آغا سہیل کے اس مجموعے میں افسانوں کی ایک قوس قزح ملتی ہے۔

مختلف موضوعات پر لکھے گئے ان افسانوں میں معاشرتی کرب بھی ملتا ہے اور ذاتی محرومیاں بھی۔ آغا سہیل نے ان افسانوں میں ان معاشرتی المیوں کا بطور خاص ذکر کیا ہے جنہیں عوام و خواص "عام" یا "معمولی" سمجھ کر چھوڑ دیتے ہیں۔ ان افسانوں میں آغا سہیل کا لہجہ بعض مقامات پر انتہائی ترش ہو جاتا ہے۔ مجموعی طور پر افسانوں کا یہ مجموعہ آغا سہیل کے فن اور فکر کے اعتبار سے انتہائی قابل توجہ ہے۔ اس مجموعہ کے حوالے سے ڈاکٹر سلیم اختر رقمطراز ہیں۔

> "شہر نا پرساں میں آغا سہیل نے اس صورتحال کا تجزیاتی مطالعہ کیا ہے جس نے پہلے معاشرے کو مفلوج کیا اور پھر جس کے زیر اثر افراد بے دست و پا ہو کر رہ گئے۔ نئی بستی' گینو ی اے بے بی' پس دیوار ہاتھی کے دانت' سانچ کی آنچ اور انا اللہ جیسے افسانے اس ضمن میں بطور مثال پیش کیے جا سکتے ہیں۔ ان سب افسانوں میں آغا سہیل نے معاشرے اور فرد کی اس EQUATION کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی ہے جس میں اگر نقطہ اعتدال نہ رہے تو یہ دونوں میزان کے دو پلڑے بننے کے برعکس چکی کے دو پاٹوں میں تبدیل ہو کر انفرادی خوشی' اقدار' عزت اور عزت نفس سب کو پیس ڈالتے ہیں۔ اسی انداز کے افسانوں میں آغا سہیل کا فن خوب نکھرتا ہے کیونکہ وہ اس انداز سے بات کرتا ہے گویا بات کی ہی نہیں جا رہی اور یہی وجہ ہے کہ ان سیدھے سبھاؤ کے افسانوں میں غضب کی کاٹ ملتی ہے۔
>
> (رسالہ فنون لاہور)

(ج) ڈاکٹر آغا سہیل کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ "تل برابر آسمان" سنگ میل پبلی کیشنز لاہور نے ۱۹۸۶ء میں شائع کیا۔ طباعت کے لحاظ سے یہ مجموعہ دوسرے مجموعوں سے

زیادہ جاذب نظر ہے۔ ایک سو سولہ صفحات پر مشتمل اس افسانوی مجموعہ کو معروف افسانہ نگار رام لعل اور معروف نقاد ڈاکٹر محمد علی صدیقی کے نام معنون کیا گیا ہے۔

"تل برابر آسمان" میں درج ذیل چودہ (۱۴) افسانے شامل ہیں۔

عہد زوال	جلا ہے جسم جہاں	حصار
کھڑکی	نوشتہ دیوار	تل برابر آسمان
تسمہ پا	لمن الملک الیوم	دابتہ الارض
روشنی	دروازہ بند ہے	بیعت
بے سمت راہیں	نظام	

آغا سہیل کے اس افسانوی مجموعہ میں متنوع موضوعات پر افسانے شامل ہیں۔ ان افسانوں میں ایک جانب تو آغا سہیل کا مخصوص کلاسیکی رنگ جھلکتا ہے اور دوسری جانب مخصوص طرز سے بچنے کا شعوری احساس بھی جلوہ گر ہوتا ہے۔ ان افسانوں میں پھیلاؤ سے زیادہ اختصار عمل نظر آتا ہے اس مجموعے کے حوالے سے مشہور کالمسٹ اریل (Ariel) کی ذرا طویل رائے ملاحظہ فرمائیے۔

> Our fiction writers would have to work hard to ensure that the techniques of surface action are wholly different from the techniques of inside journeys'. They would have to equip themselves to deal with the challang and that includes comprehensive absorption of vast reservoir of academic truths of a host of disciplines.
>
> Recently i went through Agha Sohail's latest collection of short stories "Till

Barabar Aasman," containing 14 stories. It was an unusual experience of coming across a case of total transformation. Aga Sohail seeks to have the criticism of surface action, fiction that he is, at the moment, the antithesis of what he has been so far.

From the first story Ahd_i_Zawal to Nizam one comes across and unusual atmosphere, reminding here and there of an abstract intellectual atmosphere, which is best left unexplained. The symbolism is flashed on our consciousness with such a speed that one wonders whether it is the turbulence of the writer himself or the turmoil inside his character. For a progressive short story writer like him the society appears to be transforming itself.. as if at the behest of those who stand to gain from the transformation itself. We have been used to the transformations of Intezar Husain but they are, at their best, a recoil from the fait accompli of modernity.

Agha Sohail, on the contrary, has

been taken aback at the rapidity with which the obscurantists are busy disinforming, making monsters of human beings in the process. Agha Sohail is in one way, the antithesis of Intezar Husain.

The stories "Till Barabar Aasman" "Khirki" and "Be Samt Rahain" form a triad round which the whole thought process revolves and there is no doubt that Agha Sohail has emerged as and accomplished craftsman who is equipped with the techniques of the inward journey.

Very few short story writers have worked towards a restatement of their creative prowess and it is heartening that we have in our midst a short story writer who has successfully dealt with the flux.

(Dawn _ Feb 6, 1987)

"تل برابر آسمان" کا عنوان آغا سہیل کی وسعت نظری کی خبر دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس مجموعہ کے افسانے آغا سہیل کے فکری کینوس کے پھیلاؤ کا احساس دلاتے ہیں اور یہی موضوعاتی تنوع اور رنگا رنگ اسلوب آغا سہیل کو عصر جدید کے افسانہ نگاروں میں ممتاز کرتا ہے۔ اس افسانوی مجموعہ کے حوالے سے ڈاکٹر وحید عشرت کی رائے ملاحظہ فرمایئے۔

"آغا سہیل کے یہ افسانے مختصر ہونے کے ساتھ ساتھ گہرائی اور وسعت لیے ہوئے ہیں۔ ان کی ہیئت اور فکر میں امتزاج بھی موجود ہے اور بیان میں شگفتگی، سادگی، سلاست اور تاثر ان کے افسانوں کے حسن کو دوبالا کیے ہوئے ہیں اور یہ ایک ایسا وصف ہے جو ان کے ہر افسانے کو مہکائے ہوئے ہے۔

(ماہنامہ شام و سحر لاہور جون ۱۹۹۳ء)

(د) ڈاکٹر آغا سہیل کے افسانوں کا چوتھا مجموعہ "اگن کنڈلی" ۱۹۹۱ء میں مکتبہ عالیہ لاہور سے طبع ہوا۔ اس مجموعہ کی کتابت و طباعت سطحی ہے اور اسی بناء پر یہ جاذب نظر قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس مجموعہ کی سب سے بڑی انفرادیت اس میں موجود ڈاکٹر طارق عزیز کا دیباچہ ہے۔ یہ آغا سہیل کی پہلی تصنیف ہے جس میں کسی ناقد کا دیباچہ موجود ہے۔ ڈاکٹر طارق عزیز نے نہایت محنت بلکہ فنکاری سے آغا سہیل کی افسانہ نگاری کے موضوعات و اسالیب پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ ایک سو چھبیس صفحات پر مشتمل یہ کتاب "چندا" کے نام معنون ہے

"اگن کنڈلی" میں درج ذیل اٹھارہ (۱۸) افسانے شامل ہیں۔

قصہ پانچویں درویش کا	قیامت کا انتظار	شکستہ پا
کھونٹی	روشنی کی لکیر	ماں
زنگی	تریاق	قاصد
آنکھوں کی سوئیاں	سایہ	سراب
بے چراغ قبر	اگن کنڈلی	روشنی کی تلاش
ساڑھی	میرا وطن	چندن بروا

ڈاکٹر آغا سہیل کے ان افسانوں میں معاشرتی کرب اور سماجی آشوب کے ساتھ

ساتھ فکری زوال کا بھی احساس ابھرتا ہے۔ دوسرے افسانوں کے برعکس آغا سہیل کےان افسانوں میں محو غم دوش ہونے کے بجائے فکر فردا کا احساس بھی ملتا ہے۔ آغا سہیل کے لب ولہجہ میں ایک ترشی بھی محسوس کی جا سکتی ہے "بدلتا ہے رنگ آسماں" میں جو ایک ارتعاش اور بے چینی کی کیفیت ابھرتی ہے وہ اگن کنڈلی میں پر سکون سطح کو چھوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ ان افسانوں میں آغا سہیل کا لب ولہجہ کہیں کہیں اصلاحی بلکہ تبلیغی ہو جاتا ہے۔ وہ معاشرے کے مسائل پر زور شور سے تنقید کرتے ہیں اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے پاکستانی مسائل کے حوالے سے علامتی رنگ میں بڑے بلیغ اشارے بھی کیے ہیں جو چشم معنی آشنا سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ اس مجموعہ کے حوالے سے ڈاکٹر طارق عزیز کی رائے بھی سن لیجئے۔

> "مقامی' قومی اور بین الاقوامی سطح کے بعد آغا سہیل کی نظریاتی اور موضوعاتی وسعت روحانی تناظر میں داخل ہوتی ہے۔ مجموعہ "اگن کنڈلی" روحانی اذیت کا وہ نقطہ آغاز ہے جب انسانی شعور کی قلب ماہیت ہو جاتی ہے۔ یہ چوتھا مرحلہ داخلی اور خارجی کیفیات کا مکمل امتزاج ہے۔ محتاط رہیے۔ میں آغا سہیل کو صوفی یا مابعد الطبیعاتی افسانہ نگار قرار نہیں دے رہا میرا اشارہ صرف روحانی کرب اور اس سے نجات کے عمل کی طرف ہے۔"

(دیباچہ اگن کنڈلی ۱۹۹۳ء ص ۱۶)

(ر) آغا سہیل کے افسانوں کا پانچواں مجموعہ "بوند بوند پانی" کے نام سے ۱۹۹۵ء میں طبع ہوا۔ یہ مجموعہ طاہر اسلم گورا نے گورا پبلشرز لاہور سے شائع کیا۔ اس مجموعہ کا انتساب قیصر تمکین کے نام ہے۔ ۹۴ صفحات پر مشتمل یہ افسانوی مجموعہ صوری اعتبار سے جاذب نظر ہے۔

"بوند بوند پانی" میں درج ذیل افسانے شامل ہیں۔

(۱) ساڑھی　　(۲) قاصد　　(۳) وراثت

(۴) کلاشنکوف　　(۵) قیمت　　(۶) تیسری آنکھ

(۷) دی مین ان سائیڈ　　(۸) وارث　　(۹) بوند بوند پانی

(۱۰) کیموفلاج　　(۱۱) حرامی پلا　　(۱۲) دانہ پانی

(۱۳): بر　　(۱۴) عرصہ محشر

آغا سہیل کے اس مجموعہ میں ایسے افسانوں کی کثرت ہے جو ہماری سماجی زندگی کے منفی رویوں کو اجاگر کرتے ہیں۔ یوں تو تمام افسانوں میں معاشرتی آشوب کی جھلکیاں مختلف صورتوں میں اپنا اظہار کرتی ہیں تاہم کلاشنکوف' وراثت' عرصہ محشر اور قاصد میں آغا سہیل نے معاشرے کی بے رخی اور ستم ظریفی کا حال دردناک انداز میں پیش کیا ہے۔ مصنف کے نزدیک اس مجموعہ کا نمائندہ افسانہ "بوند بوند پانی" ہے اور غالباً اسی افسانہ کی بنیاد پر اس کتاب کا نام بھی "بوند بوند پانی" قرار دیا گیا ہے۔ مجموعی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ آغا سہیل کے فن کو سمجھنے کے لئے یہ افسانوی مجموعہ انتہائی اہم ہے اس مجموعہ کی اشاعت پر اشفاق نقوی نے Lahore Literary Scens میں لکھا۔

In 1948, a young man with a master's degree in Urdu from Lucknow University embarked upon a literary career. He wrote short stories under the name Sohail Adeeb. Although they were published by various magazines, the author himself did not consider them to be of standard high enough to be published in book form.

It was only later that he collected the stories he had written between 1955 and

1974 and had them published in 1975. By then he was teaching at the F.C College, Lahore, had got a doctorate from the Punjab University and was known only as Agha Sohail. His first collection, if I remember correctly, was titled Shehr_i_Napursaan.

Now he has four more collections of stories, besides two travelogues and books on literary criticism... 14 in all. Many of his stories have been translated into English. His last collection of 14 absorbing stories was published earlier this year and was titled Boond Boond Paani. There is a gentle flow in all stories written by Agha Sohail and his choice of words is superb. The book carries no blurb; he wants the reader to assess the merit of his writings himself.

(Daily, Dawn, Nov 30, 1995)

(۳)

ڈاکٹر آغا سہیل ایک خلاقانہ ذہن کے مالک ہیں۔ چیزوں کو معروضی انداز سے پرکھنے کے ہنر نے انہیں تحقیق' تنقید اور تدقیق کی صلاحیتوں سے مالا مال کر دیا ہے۔ آغا سہیل کے بے شمار تحقیقی اور تنقیدی کارنامے ان کے استدلالی فکر اور معروضی نقطہ نظر کا

منہ بولتا ثبوت ہیں۔ انہوں نے ذاتی عناد اور مصلحت کوشی سے قطع نظر کرتے ہوئے عمر بھر تنقید و تحقیق کی خدمت کی ہے اور اسی بنا پر عصر حاضر کے تمام ناقدین ان کی صلاحیتوں کے معترف نظر آتے ہیں۔

آغا سہیل کی درج ذیل تخلیقات ان کی تحقیق اور تنقید کا مظہر ہیں:

ا) معارف سہیل (مقالات ۔۔ ۱۹۷۵ء)

ب) ادب اور عصری حسیت (مقالات ۔۔ ۱۹۹۱ء)

ج) اردو لسانیات کا مختصر خاکہ (تالیف ۔۔ ۱۹۸۰ء)

د) سرور سلطانی (مرتبہ ۔۔ ۱۹۷۵ء)

ر) دبستان لکھنؤ کے داستانی ادب کا ارتقاء (مقالہ ۔ ڈاکٹریٹ ۱۹۸۹ء)

ڈاکٹر آغا سہیل کی ان تخلیقات کے علاوہ راقم کی نظر سے ان کے بے شمار تحقیقی و تنقیدی مضامین بھی گزرے ہیں ان میں چند یہ ہیں:

۱) افسانہ اور عصری آگہی (مطبوعہ ماہنامہ شام و سحر لاہور۔ اکتوبر ۱۹۹۳ء)

۲) نیو ورلڈ آرڈر اور مجاز کی شعری متاع (مطبوعہ ماہنامہ شام و سحر جولائی ۱۹۹۱ء)

۳) ڈاکٹر فرمان فتحپوری کا تنقیدی شعور (مطبوعہ شام و سحر اگست ۱۹۹۳ء)

۴) ساحر کی شاعری میں عورت کا تصور (شام و سحر۔ فروری ۱۹۸۹ء)

۵) بہادر شاہ ظفر آزادی کی علامت (شام و سحر جولائی ۱۹۸۹ء)

۶) قیصر بارہوی کی غزل (شام و سحر مئی ۱۹۹۰ء)

۷) فراق کی رباعیوں پر ایک طائرانہ نظر (شام و سحر جولائی ۱۹۹۰ء)

۸) واقعہ کربلا اور اردو کا شعری ادب (شام و سحر اگست ۱۹۸۹ء)

۹) باقر علی شاہ کی غزل گوئی (شام و سحر۔ جولائی ۱۹۹۷ء)

۱۰) ممتاز حسین چند یادیں چند باتیں (شام و سحر ستمبر ۱۹۹۲ء)

۱۱) مرثیے کے اردو ادب پر اثرات (شام و سحر ستمبر ۱۹۹۰ء)

۱۲) نذیر قیصر۔۔چند تاثرات (شام و سحر جون ۱۹۹۲ء)

۱۳) ذکر اس پری وش کا (حسن عابد) (شام و سحر ستمبر ۱۹۹۲ء)

اس کے علاوہ آغا سہیل کے بے شمار دیباچے' فلیپ' اور تبصرے ان کی تنقیدی سوچ کے آئینہ دار ہیں۔ آغا سہیل کی تحقیقی اور تنقیدی تصانیف اور مقالات کے مطالعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ ایک واضح اور جچا تلا انداز اختیار کرتے ہیں۔ وہ شعر و ادب کو ایک خاص تہذیبی پس منظر میں دیکھنے کے عادی ہیں تاہم جدید فکری رویوں اور ترقی پسندانہ نظریات نے ان کے ذہنی افق کو وسیع کر دیا ہے۔ مجموعی طور پر ان کی تنقید جدت و کلاسیکیت کا حسین امتزاج ہے۔

ذیل میں ڈاکٹر آغا سہیل کی معروف تحقیقی اور تنقیدی تخلیقات کے حوالے سے چند معروضات پیش خدمت ہیں:۔

(۱) "معارف سہیل" آغا سہیل کے چند مقالات' خاکوں اور مضامین کا مجموعہ ہے۔ یہ مجموعہ اقبال بک کارنر لاہور سے ۱۹۷۵ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعہ کے آغاز میں مصنف کے کوائف اور تصانیف کی فہرست پیش کی گئی ہے اور آخر میں ڈاکٹر احراز نقوی اور سجاد حارث کی گراں قدر آرا شامل ہیں۔ ایک سو اڑسٹھ صفحات پر مشتمل یہ کتاب معروف ادیب و شاعر احمد ندیم قاسمی کے نام معنون کی گئی ہے۔ اس کتاب کی تسوید کے سلسلے میں ڈاکٹر آغا سہیل "حرف آغاز" کے عنوان سے رقمطراز ہیں:

> "یہ تفکر اور تعقل کا دور ہے۔ آنکھیں بند کر کے کسی راہ پر چلنا نہ افراد کے شایان شان ہے نہ اقوام کے۔ تیغ و ناسی سے گل نال اور تعمق کی ضرورت پہلے بھی تھی اور آج بھی ہے اور چونکہ دور حاضر کے افراد زیادہ ذی شعور' ذی حس اور ذی علم ہیں لہٰذا انہیں اور بھی اس بات کی بجا طور پر کھوج رہتی ہے کہ

کسی عقیدے کے اسباب و علل دریافت کیے جائیں اور اس پر عمل پیرا ہونے سے قبل اس کی صداقت و حقانیت دریافت کی جائے۔ کسی چیز کی صداقت دریافت کرنے کا سب سے اچھا طریقہ یہی نہیں ہے کہ محض اس کا تجزیہ کیا جائے بلکہ یہ بھی ہے کہ اسے تجربات کے تمام تر امکانی مراحل سے گزارا جائے۔ میرے ان ناچیز مضامین کو اسی روشنی میں دیکھیے اور معائب سے مجھے مطلع کیجیے تاکہ میری رہنمائی ہو سکے"

(معارف سہیل ص۵)

"معارف سہیل" میں آغا سہیل کے درج ذیل مقالات خاکے اور مضامین شامل ہیں۔

۱) احتشام حسین (در بغل دارو کتاب)
۲) سید سجاد ظہیر رضوی
۳) اثر لکھنوی
۴) جدید اردو غزل کی دروں بینی
۵) ابوالاثر بہزاد
۶) انار کلی پر ایک نظر
۷) اردو تنقید کا ارتقاء (حالی کے بعد ۱۹۳۶ء تک)
۸) محمد حسین آزاد کا طرز نگارش
۹) محمد حسین آزاد سیرت نگاری اور آب حیات
۱۰) غالب کی ظرافت
۱۱) سید آل رضا اور جدید مرثیہ

"معارف سہیل" میں ڈاکٹر آغا سہیل نے مقالات و مضامین کے ساتھ ساتھ

برصغیر پاک و ہند کی معروف شخصیات کے خاکے بھی شامل کیے ہیں۔ اس کتاب میں شامل تحقیقی اور تنقیدی مقالات کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ڈاکٹر آغا سہیل نظری اور عملی دونوں طرح کے موضوعات کے بیان پر قدرت رکھتے ہیں اور ان کے پیش کردہ نتائج غیر متوقع یا ناقابل قبول نہیں ہوتے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر اعزاز نقوی کی یہ رائے انتہائی وقیع ہے کہ:

> "وہ اپنی تنقیدی کاوش میں پورے انصاف اور خلوص کے ساتھ نتائج کا استخراج کرتے ہیں۔ ممکن ہے کہ آپ ان کی بعض آراء سے اتفاق نہ کریں مگر ان کے ادبی و علمی محاسن اور تنقیدی تجزیے اور معروضی نقطہ نظر کی صحت مندی سے انکار نہیں کر سکتے"

(فلیپ۔ معارف سہیل)

ڈاکٹر آغا سہیل تنقیدی بصیرت و بصارت کے مالک ہیں ان کی تخلیقی اپج انہیں نئے نئے موضوعات کی طرف مائل کرتی ہے اور ان کا منطقی رویہ ان کی تنقید کو اعتبار بخشتا ہے۔ آغا سہیل کا تنقیدی شعور اپنے اندر تخلیقی نمو رکھتا ہے یہی سبب ہے کہ ان کے تنقیدی افکار میں تخلیق کی خوشبو محسوس ہوتی ہے اس حوالے سے سجاد حارث کا یہ اقتباس ملاحظہ فرمایئے۔

> "فن و ادب کی دنیا میں بعض شخصیتیں ہمیں ایسی بھی نظر آتی ہیں جہاں تنقید اور تخلیق کے مابین مغائرت ختم ہو جاتی ہے۔ تنقیدی شعور تخلیقی قوت میں زور اور نکھار پیدا کرتا ہے اور تخلیقی قوت تنقیدی شعور میں آگہی اور بصیرت پیدا کرنے کی موجب بنتی ہے۔ پروفیسر آغا سہیل کی تحریریں تنقید اور تخلیق کا ایک ایسا ہی سنگم ہیں... ان کے تنقیدی مضامین میں تحقیقی کاوش اور قوت استدلال کے ساتھ ساتھ تخلیقی وجدان کی معتبر

راہنمائی کے آثار بھی نظر آتے ہیں"

(فلیپ معارف سہیل)

"معارف سہیل" کی اشاعت نے علمی و ادبی حلقوں میں ڈاکٹر آغا سہیل کو ایک نقاد کے طور پر روشناس کرایا۔ معروف دانشوروں اور ناقدین نے اس کتاب پر تبصرے کیے اور آغا سہیل کی اس تنقیدی کاوش کو سراہا۔ احمد ندیم قاسمی اس مجموعہ میں مقالات و خاکوں کو یکجا کرنے پر معترض ہیں تاہم وہ اس کتاب کی وقعت و اہمیت کا احساس کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

"..... یہ بات طے ہے کہ تنقیدی مضامین ہوں یا کرداری خاکے آغا سہیل نے دونوں اصناف کا حق ادا کر دیا ہے۔ آغا صاحب بنیادی طور پر تخلیقی فنکار ہیں اس لیے ان کی تنقیدی صلاحیتوں میں ان کے تخلیقی رویے کا بڑا ہاتھ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ مضامین تنقید کو تخلیق کے مرتبے پر پہنچادیتے ہیں۔"

(رسالہ فنون۔ لاہور دسمبر ۱۹۷۵ء)

مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ آغا سہیل کا یہ پہلا تنقیدی مجموعہ گوناں گوں صفات کا حامل ہے اور بقول رئیس امروہوی:

"آغا سہیل کا شمار اردو زبان کے معروف اہل قلم میں ہوتا ہے۔ معارف سہیل ان کی تازہ کاوش فکر و تراوش قلم ہے۔ یہ چند مقالات' خاکوں اور مضامین کا مجموعہ ہے۔..... یہ کتاب ہلکے پھلکے شگفتہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس کے مطالعہ سے دماغ بوجھل ہو جانے کی بجائے دل شگفتہ ہو جاتا ہے۔

(رئیس امروہوی۔ روزنامہ جنگ کراچی ۷ ستمبر ۱۹۷۵ء)

(ب) ڈاکٹر آغا سہیل کے تنقیدی مضامین کا دوسرا مجموعہ "ادب اور عصری حسیت" کے نام سے معرض وجود میں آیا۔ اس کتاب کے ناشر محمد جمیل النبی نے اسے مکتبہ عالیہ لاہور سے ۱۹۹۱ء میں شائع کیا۔ دو سو سولہ (۲۱۶) صفحات پر مشتمل یہ کتاب معروف نقاد ڈاکٹر شارب ردولوی کی من موہنی اور دل آویز شخصیت کے نام معنون کی گئی ہے۔

"ادب اور عصری حسیت" میں درج ذیل مضامین شامل ہیں۔

۱) اردو تنقید کا ارتقاء

۲) افسانہ اور عصری آگہی

۳) دبیر کی شعری لسانیات

۴) غالب کا نظریہ شعر

۵) جدید اردو غزل کی دروں بینی

۶) عدم اور فقیری

۷) جوش۔۔ شعلہ و شبنم

۸) آنگن اور خدیجہ مستور

۹) انار کلی پر ایک نظر

۱۰) ساحر کی شاعری میں عورت کا تصور

۱۱) نسیم امروہوی اور پیروی انیس

۱۲) فیض کی شاعری کا زندہ لفظ

۱۳) فیض کی متخیلہ

۱۴) فیض اور غالب

۱۵) فیض کی انقلابی شاعری تیسری دنیا کے تناظر میں

ڈاکٹر آغا سہیل ایک وسیع تر ذہنی افق کے مالک ہیں۔ یہی سبب ہے کہ اس تنقیدی تصنیف میں فکری موضوعات کا ایک سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ آغا سہیل نے قدیم و جدید موضوعات کو منتخب کر کے واضح کر دیا ہے کہ وہ کلاسیکی اور جدید رویوں کا حسین

امتزاج چاہتے ہیں۔ غالب و دبیر سے لے کر فیض و عدم تک کے تمام موضوعات دیکھ لیجئے ہر مقام پر آغا سہیل نے اپنی بیدار مغزی کا ثبوت فراہم کیا ہے۔

"ادب اور عصری حسیت" میں ڈاکٹر آغا سہیل نے "معارف سہیل" کے بعض مقالات بھی شامل کر لیے ہیں۔ معارف سہیل کی عدم دستیابی کی وجہ سے ان مضامین کی شمولیت نے اس کتاب کو دو آتشہ بنا دیا ہے اور یہ مضامین قند مکرر کا مزا دے رہے ہیں۔

آغا سہیل کی تنقید قاری کے ذہن رسا' عصری حسیت اور تخلیق کار کی متخیلہ کی مثلث پر استوار ہے۔ آغا سہیل کے نزدیک معاشرتی اور تاریخی شعور کے ادراک کے بغیر تخلیق کار کی متخیلہ اپنے طبعی جوہر نہیں دکھا سکتی اور ظاہر ہے کہ جب تخلیق کار غیر واضح اور غیر منطقی ہو جائے تو قاری سے اس کا فکری رشتہ منقطع ہو جاتا ہے۔ لہذا عظیم تخلیق اسی وقت معرض وجود میں آتی ہے جب یہ مثلث اپنا کام درست طریقے سے انجام دے سکے۔

آغا سہیل ایک ترقی پسند نقاد ہیں اسی بنا پر ان کی تنقید میں ترقی پسند تحریک سے منسلک ناقدین کے اثرات تلاش کیے جا سکتے ہیں' پروفیسر احتشام حسین کی تنقیدی بصیرت و بصارت کے آغا سہیل آج بھی معترف ہیں ان کا موقف یہ ہے کہ انہوں نے اپنے تنقیدی افکار و نظریات کے چراغ پروفیسر احتشام حسین کی تصنیف "ادب اور سماج" سے روشن کیے ہیں۔ ڈاکٹر آغا سہیل اور پروفیسر احتشام حسین کی تنقید میں اگر مماثلتیں ہیں تو بہت سے جزوی اختلافات بھی موجود ہیں اب چلتے چلتے پروفیسر سجاد حارث کی یہ رائے ملاحظہ کیجئے جو ہمارے موقف کی تائید کرے گی۔

> "پروفیسر احتشام حسین کی متوازن اور عالمانہ شخصیت نے زمانہ طالب علمی میں آغا صاحب کے ذہن پر جو گہرے نقوش ثبت کیے ہیں ان کا اظہار ان کے تنقیدی مضامین میں واضح موجود ہے.....
> احتشام حسین کی طرح وہ بھی اردو ادب کے کلاسیکی سرمائے کو بالخصوص اس کی صحت مند اور ترقی پسند روایات کو ایک وقیع

تہذیبی ورثہ سمجھتے ہیں۔"

(فلیپ معارف سہیل)

" ادب اور عصری حسیت" کی اشاعت نے ڈاکٹر آغا سہیل کے تحقیقی اور تنقیدی حیثیت کو استحکام بخشا ہے اور اردو تنقید میں انھیں معتبر مقام عطا کیا ہے

(ج) ڈاکٹر آغا سہیل کی تالیف "اردو لسانیات کا مختصر خاکہ" ۱۹۸۰ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب کے سرورق پر مصنف پروفیسر احتشام حسین اور مرتب آغا سہیل درج ہے۔ ستر صفحات پر مشتمل یہ کتاب سنگ میل پبلی کیشنز لاہور سے شائع ہوئی۔ اس کتاب کو مولف نے اپنے پیر بھائی ڈاکٹر عبادت بریلوی کے نام معنون کیا ہے۔ کتاب کے آغاز میں آغا سہیل کا سوانحی خاکہ اور تصانیف کے نام درج ہیں۔ اس کتاب کے آخر میں زبانوں کے آغاز و ارتقاء کے حوالے سے ایک چارٹ بھی شامل کیا گیا ہے جس سے کتاب کی تحقیقی اہمیت میں اضافہ ہوا ہے۔

"اردو لسانیات کا مختصر خاکہ" کے ابواب کے عنوانات درج ذیل ہیں:

۱) لسانیات کی اہمیت، مقصد اور مطالعے کے طریقے
۲) زبان کی ماہیت، آغاز اور تشکیل
۳) زبانوں کا فطری ارتقاء اور صوتی تبدیلیاں
۴) زبان کی ارادی تشکیل
۵) زبان کی گروہ بندی اور دنیا کی زبانیں
۶) دنیا کی زبانوں کا نقشہ
۷) ہند آریائی کا ارتقاء
۸) برصغیر کی جدید آریائی زبانیں
۹) اردو کی ابتدا اور ارتقاء
۱۰) دکن اور گجرات اور شمالی ہند میں اردو کا ارتقاء

۱۱) اختتام اور نتیجہ

اس تالیف کے آغاز میں "عرض مرتب" کے عنوان سے ڈاکٹر آغا سہیل رقمطراز ہیں:

"آج سے کوئی اٹھارہ بیس سال قبل بڑے چاؤ سے اس موضوع پر پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھنے کی ٹھانی تھی اور دو سال تک متواتر استاذی المعظم پروفیسر سید احتشام حسین مرحوم کی نگرانی میں کچھ کام بھی کرتا رہا تھا لیکن حالات نے مساعدت نہ کی اور یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی کیونکہ احتشام صاحب مرحوم الہ آباد یونیورسٹی تشریف لے گئے اور میں مستقلاً لاہور آگیا۔ اس موضوع پر جو شذرات اکٹھا کیے وہ جوں کے توں اب تک موجود ہیں اور یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان کے چھپنے چھپانے کی بھی کوئی سبیل نکلے گی یا نہیں۔ تاہم یہ دیکھ کر کہ ان شذرات میں استاد مرحوم کے کچھ ارشادات شامل ہیں، جو بجائے خود ایک مکمل مقالہ ہیں، میں نے سوچا کہ انھیں کتابی صورت میں کیوں نہ مرتب کر دوں۔"

ڈاکٹر آغا سہیل کی یہ تالیف دراصل ان شذرات پر مشتمل ہے جو ڈاکٹریٹ کے لیے خاکہ کے طور پر پروفیسر احتشام حسین کی نگرانی میں تیار کیے گئے آغا سہیل نے کسر نفسی سے کام لیتے ہوئے اپنی اس محنت کو استاد کی جھولی میں ڈال دیا ہے اس تالیف کی ترتیب و تشکیل میں پروفیسر احتشام حسین کی معاونت یقیناً رہی ہوگی۔ تاہم یہ عملی طور پر آغا سہیل کا ذاتی تحقیقی کام معلوم ہوتا ہے۔

عصر حاضر میں لسانیات کی اہمیت و افادیت سے کوئی ذی علم انکار نہیں کر سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ لسانیات کو اب سائنس کا درجہ حاصل ہو گیا ہے اور اس کی پھلتی پھولتی شاخیں اس کی روز افزوں ترقی کی خبر دیتی ہیں۔ آغا سہیل نے بہت اچھا کیا کہ اس موضوع

ایک مختصر سی سعی مگر تحقیقی تالیف تیار کر کے ماہرین لسانیات کو اس موضوع پر کام کرنے کے لیے آمادہ کیا۔ آغا سہیل کے بعض نظریات سے محققین اور ناقدین کو اختلاف بھی ہوگا لیکن یہ کیا کم ہے کہ پاکستان میں لسانیات کے شعبہ میں اس تالیف نے بحث و تمحیص کے نئے در وا کر دیے ہیں۔ یہ تالیف لسانیات سے دلچسپی رکھنے والے ان طلبہ و طالبات کے لیے بے حد مفید ہے جو لسانیات کو ایک مصیبت سمجھ کر اس سے کوسوں دور بھاگتے تھے۔ آغا سہیل نے سیدھی سادی باتیں دلکش اور خوش کن اسلوب میں بیان کر دی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلوب کی چاشنی نے اس خشک موضوع میں تر و تازگی پیدا کر دی ہے۔

ڈاکٹر آغا سہیل کی یہ تالیف تحقیقی اور تنقیدی اعتبار سے انتہائی اہمیت کی حامل ہے۔ اگر آغا سہیل اس تالیف کے آخر میں اس موضوع کے حوالے سے کتابوں کی فہرست بھی پیش کر دیتے تو اس تالیف کی وقعت میں مزید اضافہ ہو جاتا بہر حال اپنے موضوع کے اعتبار سے یہ کتاب انتہائی اہم اور قابل توجہ ہے۔

(د) ڈاکٹر آغا سہیل کی مرتبہ "سرور سلطانی" (رجب علی بیگ سرور) اکتوبر ۱۹۷۵ء میں طبع ہوئی۔ اس کتاب کے ناشر احمد ندیم قاسمی نے اسے مجلس ترقی ادب سے شائع کیا۔ چار سو پچیس (۴۲۵) صفحات پر مشتمل یہ کتاب آغا سہیل کے ذوق ترتیب و تدوین کی عکاس ہے۔ اس کتاب کے آغاز میں آغا سہیل کا ایک طویل مقدمہ بھی ہے جو ان کی تنقیدی اور تحقیقی بصیرت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

اردو کے کلاسیکی ادب میں رجب علی بیگ سرور کی معروف تصنیف "سرور سلطانی" کو ایک معتبر مقام حاصل ہے۔ سرور نے فسانہ عجائب کی طرح اس تخلیق میں بھی اپنے اسلوب بیان سے ایک خاص طرح کی شیرینی پیدا کر دی ہے۔ اس کتاب کی تشکیل کے حوالے سے آغا سہیل رقمطراز ہیں:

> "توکل بیگ حسینی کی "شمشیر خانی" جو غزنین کے حاکم شمشیر خاں
> کے ایما پر ۱۰۶۳ھ میں لکھی گئی 'شاہنامہ فردوسی کا خلاصہ ہے

اور سرور سلطانی اسی شمشیر خانی کا ترجمہ ہے۔ تاہم یہ کتاب شمشیر خانی کا لفظی ترجمہ نہیں ہے بلکہ سرور سلطانی کے ماخذ میں شمشیر خانی اور شاہنامہ فردوسی کے علاوہ کم از کم چھتیس (۳۶) حوالے اور بھی ملتے ہیں جن سے سرور نے استفادہ کیا ہے۔ ان میں سے بیشتر کا ذکر مقدمے میں موجود ہے"

(فلیپ سرور سلطانی)

سرور سلطانی کی ترتیب و تسوید میں آغا سہیل نے انتہائی عرق ریزی سے کام لیا ہے۔ انہوں نے اس کتاب کے موجود تمام نسخوں کو پیش نگاہ رکھتے ہوئے متن کی تصحیح بھی کی ہے۔ اس طرح اب یہ تصنیف اپنی نوعیت کے اعتبار سے انتہائی وقعت کی حامل ہو گئی ہے۔ اس تصنیف میں آغا سہیل کا مقدمہ ایک معرکہ کی چیز ہے۔ اڑتالیس صفحات پر مشتمل اس مقدمہ میں آغا سہیل نے معروضی انداز میں اس کتاب کے حسن و قبح پر روشنی ڈالی ہے۔ انہوں نے بعض مقامات پر ناقدین و محققین سے اختلاف کرتے ہوئے نئے تحقیقی مباحث چھیڑے ہیں۔ انہوں نے نہایت محنت کے ساتھ حواشی و تعلیقات مرتب کیے ہیں۔ ان حواشی و تعلیقات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر آغا سہیل نے انتہائی تلاش و جستجو کے بعد یہ کتاب مرتب کی ہے۔ سرور سلطانی کو ڈاکٹر آغا سہیل کی تحقیق کا خشت اول قرار دیا جا سکتا ہے۔

(ر) ڈاکٹر آغا سہیل کے ڈاکٹریٹ کا تحقیقی مقالہ "دبستان لکھنؤ کے داستانی ادب کا ارتقاء" ۱۹۸۸ء میں "مغربی پاکستان اردو اکیڈمی" لاہور کے زیر اہتمام شائع ہوا۔ دو سو چوہتر ۲۷۴ صفحات پر مشتمل یہ تحقیقی مقالہ آغا سہیل نے اپنی اہلیہ حشمت آراء بیگم کے نام معنون کیا ہے۔

"دبستان لکھنؤ کے داستانی ادب کا ارتقاء" نامی تصنیف درج ذیل ابواب پر مشتمل ہے:

(۱) دبستان لکھنؤ میں داستان کے اولین نقوش

(۲) لکھنؤ کی اہم اور غیر اہم داستانیں

(۳) تحسین اور نو طرز مرصع

(۴) مرزا رجب علی بیگ سرور اور فسانہ عجائب

(۵) پنڈت رتن ناتھ سرشار کا فسانہ آزاد' داستان داستانی عناصر اور لکھنویت کی نمائندگی

(۶) طلسمات و سمات کی داستانیں اور لکھنویت

(۷) دبستان لکھنؤ

اس تحقیقی مقالے کے بعض حصوں کو ڈاکٹر آغا سہیل نے اس کتاب میں شامل نہیں کیا ہے۔ اس حوالے سے وہ "ابتدائیہ" میں رقمطراز ہیں۔

"مغربی پاکستان اردو اکیڈمی نے ازراہ بندہ نوازی میرے ڈاکٹریٹ کے مقالے بعنوان "دبستان لکھنؤ کے داستانی ادب کا ارتقاء" کو شائع کرنے کا فیصلہ کر کے میری توقیر میں اضافہ کیا لیکن بعض اسباب کی بنا پر اس کا پہلا باب مقالہ ہذا سے منہا کر دیا گیا ہے جس کے سبب محسوس یہ ہوتا ہے کہ مقالہ ہذا کا باب دوم جو اب باب اول قرار پایا ہے' اپنی تمہید کی مبادیات سے محروم ہو گیا ہے اور وہ چند معروضات جو میرے نزدیک مقالے کا ضروری حصہ ہیں انہیں مجملاً یہاں پیش کر دینے سے مقالہ ہذا کا موجودہ باب اول بے ربط اور مبہم نہیں رہے گا"

ڈاکٹر آغا سہیل نے اس تحقیقی مقالے میں دبستان لکھنؤ کی داستانوں کے ارتقاء پر روشنی ڈالی ہے۔ آغا سہیل نے مختلف ناقدین اور محققین کی آراء کو پیش نظر رکھتے ہوئے لکھنوی داستان کے حوالے سے نئے مباحث چھیڑے ہیں۔ اپنی بحث کو سمیٹتے ہوئے انہوں

نے نہایت محتاط انداز سے نتائج کا استخراج کیا ہے۔ حقیقت یہ کہ آغا سہیل کے رگ و پے میں لکھنؤ اور اس کی خوشبو بسی ہوئی ہے۔ انھیں داستانوی ادب سے والہانہ لگاؤ ہے۔ اس مقالے میں لکھنؤ اور داستان کا حسین ملاپ ہو گیا ہے اور اغلب یہ ہے کہ اسی بنا پر آغا سہیل کا ذہن رسا انتہائی فعال طریقے سے نتائج کا استنباط کرتا ہے۔

آغا سہیل نے اس مقالے میں داستان کے خدوخال کا تعین کرتے ہوئے مشرقی و مغربی ادبیات سے کما حقہ' استفادہ کیا ہے۔ اسی طرح لکھنؤ کے باب میں بھی انھوں نے برصغیر پاک و ہند کے معروف محققین اور ناقدین کی تحقیقات کے حوالے پیش کر کے اپنے مقالے کی وقعت میں بے پناہ اضافہ کیا ہے۔ خاص طور پر ڈاکٹر صفدر حسین اور اسی قبیل کے دوسرے ناقدین آغا سہیل کے پیش نگاہ رہے ہیں اور انھوں نے اپنے موقف کی تائید میں ان کے طویل اقتباسات بھی پیش کیے ہیں۔ آغا سہیل نے کوشش کی ہے کہ وہ بنیادی ماخذ کا سہارا لیں۔ یہی سبب ہے کہ مقالے میں ثانوی ماخذات سے بہت کم استفادہ دکھائی دیتا ہے۔

آغا سہیل نے اس مقالے میں معروضی انداز بیان اختیار کیا ہے۔ ایک اچھے محقق کا خاصہ یہ ہے کہ وہ منطقی اسلوب اختیار کرتے ہوئے واضح اور دو ٹوک فیصلے کرے۔ آغا سہیل تحقیقی میدان میں اس کڑی شرط پر بھی پورے اترتے ہیں۔ ڈاکٹر آغا سہیل کے اس مقالے کی اہمیت و افادیت کو تمام ناقدین اور محققین نے تسلیم کیا ہے۔

(۴)

دانش مندوں نے سفر کو وسیلہ ظفر قرار دیا ہے۔ سفر کے تجربات' واقعات اور حادثات ہی مسافر کی زندگی کا ماحصل ہوتے ہیں۔ سفر کرنے والا اپنے دیس کا سفیر ہوتا ہے اور دوران سفر وہ اپنی تہذیب و ثقافت کے مختلف نمونے تلاش کرتا رہتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ معتبر سفرنامہ نگاروں نے سفر در سفر کا احساس اجاگر کیا ہے۔ ایک سفر دیس سے پردیس تک کا ہوتا ہے اور ایک تہذیب سے دوسری تہذیب تک کا سفر ہوتا ہے۔

ڈاکٹر آغا سہیل ایک معتبر سفرنامہ نگار ہیں۔ انھوں نے اپنے سفرناموں میں نہ تو نسوانی کرداروں کی ٹھونس ٹھانس سے چاشنی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اور نہ محیرالعقول

واقعات کے بیان سے اپنے سفرناموں کو ماورائے حقیقت بنانے کی کوشش کی ہے۔ ان کے سفرنامے مشرقی تہذیب و تمدن کے علمبردار کے سفر کی روداد ہیں۔ اس سفر میں ان کے ساتھ لکھنؤ کی تہذیب' لاہور کی رنگارنگی' پاکستان کی مجموعی صورتحال اور پورب کی زبان بھی ہمرکاب ہے۔

آغا سہیل کے سفرنامے ہمہ جہت ہیں اور یہ زندگی کے تمام شعبوں کو متاثر کرتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ وہ انگلستان اور ایران کی سیر میں پاکستان اور پاکستانیوں کو فراموش نہیں کرتے بلکہ وقتاً فوقتاً انہیں یاد کرتے رہتے ہیں۔ کہیں وہ پاکستانیوں کے طرز عمل کے محاسن گنواتے ہیں اور کہیں ان کے قبیح اعمال پر طنز کے تیر برساتے ہیں۔ دونوں صورتوں میں وہ توازن کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔

آغا سہیل ایک وسیع تناظر کے حامل ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان کے سفرنامے بھی ان کی وسیع النظری پر دال ہیں انہوں نے محض ایران اور انگلستان کی سیاحت کے قصے ہی بیان نہیں کیے بلکہ شعوری کوشش سے تیسری دنیا کے مسائل و معاملات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ آغا سہیل نے ایک ماہر سیاح کی طرح حالات و واقعات کو ایک خاص تاریخی پس منظر میں سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے اور یہی وہ خصوصیت ہے جو عصر حاضر کے سفرنامہ نگاروں میں انہیں معتبر مقام عطا کرتی ہے ذیل میں ان کے دو سفرناموں کے بارے میں چند معروضات پیش خدمت ہیں۔

(۱) ڈاکٹر آغا سہیل کا پہلا سفرنامہ "افق تا بہ افق" ۱۹۹۰ء میں زیور طبع سے آراستہ ہوا۔ پاکستان بکس اینڈ لٹریری ساؤنڈز لاہور کے مہتمم طاہر اسلم گورا نے اس کتاب کو شائع کیا۔ تین سو بیس صفحات پر مشتمل یہ کتاب ڈاکٹر آغا سہیل نے اپنی بڑی صاحبزادی مسرت اور داماد عابد کے نام معنون کی ہے۔ اس سفرنامے کی تشکیل و تسوید کے بارے میں مصنف کی رائے ملاحظہ فرمایئے۔

"کیا کیجئے کہ سفر شروع ہوتے ہی میرے حواس خمسہ کو تحریک اور

اپنے گرد و پیش کے حالات و واقعات اور مناظر کی نوعیت نے جو اندر ہی اندر تحریک پیدا کی اس نے خود بخود سفرنامے کی شکل اختیار کرنا شروع کردی اور لیڈز تک پہنچتے پہنچتے اتنا مواد جمع ہوگیا کہ میں قلم اٹھا کر لکھنے پر مجبور ہوگیا........ ساحل اور سمندر (احتشام حسین) ایک ایسا سفرنامہ ہے جس نے اکثر میرے اندر تحریک و تشویق پیدا کی کہ کاش میں بھی کوئی ایسا سفر کرتا اور ایسا ہی سفرنامہ لکھ سکتا کیونکہ مذکورہ سفرنامے کے پڑھنے سے قاری کے اندر جذبات و احساسات کی تہذیب ہوتی ہے اس کا ذہنی افق وسیع تر ہوتا ہے اس کی معلومات میں اضافہ ہوتا ہے اور اس کی فکر کے دائرے بھی پھیلتے ہیں جبکہ دوسرے سفرناموں میں غالباً یہ کیفیت موجود نہیں ہے۔"

(دیباچہ افق تا بہ افق ص ۱۰)

"افق تا بہ افق" درج ذیل تیرہ (۱۳) ابواب پر مشتمل ہے۔

(۱) سفر کی تیاری	(۲) روانگی	(۳) ابو ظبی
(۴) استنبول	(۵) لندن لیڈز	(۶) لیڈز' فریڈ فورڈ' لیڈز
(۷) ہاورتھ	(۸) اسٹریٹ فرڈ اپان ایون	(۹) برمنگھم
(۱۰) نیو کاسل کو روانگی	(۱۱) نیو کاسل سے روانگی	(۱۲) لندن نامہ
(۱۳) سفر تمام ہوا		

"افق تا بہ افق" ڈاکٹر آغا سہیل کے انگلستان کے سفر کی روداد ہے۔ آغا سہیل کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اپنے ذاتی سفر کو اجتماعی سفر بنا دیا اور قارئین کو بھی اپنے ہمراہ انگلستان لے گئے۔ آغا سہیل نے دوسرے سفرنامہ نگاروں کی طرح سطحی اور عامیانہ باتوں کے بیان سے گریز کیا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے یہ ایک باوقار اور سنجیدہ مشرق کا یورپ کی جانب سفر ہے۔ یورپ والے اپنی بغل میں بائیبل لیکر برصغیر میں وارد ہوئے تھے

اور آغا سہیل اپنے دل و دماغ میں برصغیر کی تہذیب و روایات سجائے یورپ پہنچے۔ یہی سبب ہے کہ اس سفرنامے میں عام سفرناموں کی طرح روایتی باتیں نہیں ملتیں بلکہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ ڈاکٹر آغا سہیل نے جذبات و احساسات کی تہذیب کا بیڑا اٹھا رکھا ہے۔ اس سلسلے میں پروفیسر جیلانی کامران کی یہ رائے بھی ملاحظہ فرمایئے۔

Dr. Agha Sohail's travelogue called the Horizons is very different from the writings on this interesting theme. He has seen England with the eyes of a scholar who intended to understand that great country which had shaped and redrawn the world map for more than two hundred years. But unfortunately like many others, he also could not come across the England of Sir Syed's days. The average Englishman he saw during his stay there, was as good or as bad as we are, and had nothing great or extra ordinary about him. But it is probably unwise to discover the England of our literary dream on the platforms of the railway stations in London or in the Piccadily Circus after midnight. Dr Agha Sohail had quite wisely tried to discover England in her tradition and was deeply fascinated by the true English character.

ڈاکٹر آغا سہیل نے اس سفرنامے میں محض انگلستان کے باغات، عجائبات اور پرفضا مقامات کا ذکر ہی نہیں کیا بلکہ انہوں نے قدیم و جدید انگلستان کے رویوں کا موازنہ بھی کیا ہے اور ایک پاکستانی کی نظر سے بین الاقوامی سطح پر رونما ہونے والے تغیرات کا احاطہ بھی کیا ہے۔ آغا سہیل ایک ترقی پسند انسان ہیں اور اسی بناء پر ان کے سفرناموں میں بھی ترقی پسندانہ خیالات بار بار جلوہ گر ہوتے ہیں اس حوالے سے ڈاکٹر انیس ناگی کی یہ رائے ملاحظہ فرمائیے۔

> His travelogue Ufaq Ta Ufaq may have to be read in the perspective of the Third World consciousness. Dr Suhail's travelogues are very diverse. They divulge information about not only the landscapes of Leeds or Birmingham but also reflect on the psychological reactions of a visitor from a Third World country looking at a well disciplined society with amazement and awe. The high economic growth and modern technology compels Dr. Suhail to compere life in England with his own life back home. The 320 pages travelogues consists of 12 chapters narrating the details of Dr. Sohails sojourn in England. The details of life in England seen from a distance are less interesting as Dr.Suhail, perhaps, out of nostalgia, has

preffered to meet his countrymen in England rather than meet the white man. Western imperialism and Philistinism of his countrymen abroad in vites scathing criticism of Dr.Suhail. His antipathy for the Arabs, because of their misdemeanour, is a frank expression of a person who refuses to be ridiculed. Dr Suhail is quite puritanical in depicting the life of the Britishers.

(The Nation Lahore, Dec 4, 1990)

افق تا بہ افق کا اسلوب بیان انتہائی دلکش ہے۔ آغا سہیل کی زبان دانی کا ایک زمانہ معترف ہے۔ اس سفرنامے میں بھی انہوں نے لکھنؤ کی پاکیزہ اور معطر اردو زبان استعمال کی ہے۔ برجستہ محاوروں اور طنزیہ لب و لہجہ نے اس سفرنامہ کو انفرادیت عطا کی ہے۔ مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ آغا سہیل اس سفرنامے کے ذریعہ ایک معتبر سفرنامہ نگار کے طور پر ادبی دنیا میں منظرعام پر آتے ہیں۔

(ب) ڈاکٹر آغا سہیل کا دوسرا سفرنامہ "ایران میں چودہ روز" ۱۹۹۳ء میں شائع ہوا۔ اس کتاب کے ناشر طاہر اسلم گورا نے اسے پاکستان بکس اینڈ لٹریری ساؤنڈز لاہور کی جانب سے طبع کرایا۔ کتاب کے آخر میں مصنف کی تصانیف کی فہرست شامل ہیں۔ ڈاکٹر آغا سہیل کی یہ واحد تصنیف ہے جو کسی کے نام معنون نہیں کی گئی۔

"ایران میں چودہ روز" ڈاکٹر آغا سہیل کے ایران کے ایک سفر کی روداد ہے۔ ڈاکٹر آغا سہیل کو ایرانی انقلاب کی دسویں سالگرہ کے موقع پر ایران تشریف لے جانے کی دعوت ملی تو وہ اپنے خوابوں کی سرزمین دیکھنے کے لیے بے تاب ہو گئے اور انہوں

نے یہ دعوت فوراً قبول کر لی۔ لاہور سے ان کے ساتھ ڈاکٹر رفیق احمد' انتظار حسین' ڈاکٹر انور سجاد اور اصغر ندیم سید بھی ہمرکاب تھے۔ ۳۰ جنوری ۱۹۹۰ء کو شروع ہونے والا سفر ۱۴ فروری ۱۹۹۰ء کو بحسن و خوبی پایہ تکمیل کو پہنچا۔

ڈاکٹر آغا سہیل کا یہ سفرنامہ دو اعتبار سے انتہائی وقیع ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ آغا سہیل ایرانی نژاد ہیں اور انہیں ایران سے جذباتی اور قلبی وابستگی ہے۔ یہی سبب ہے کہ ہمیں اس سفرنامہ میں جگہ جگہ جذباتی مناظر دیکھنے کو مل جاتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ ایران سے مذہبی عقیدت و ارادت نے آغا سہیل کے اس سفر کو ایک خاص طرح کی پاکیزگی عطا کر دی ہے۔ ان دونوں نکات کے باوجود آغا سہیل نے پورے سفرنامے میں چیزوں کو معروضی نظر سے دیکھنے کا ہنر برقرار رکھا ہے۔ وہ ایرانی علماء و سیاستدانوں کی انتہائی دلچسپ حلیہ کشی کرتے ہیں اور جہاں مناسب سمجھتے ہیں' ایرانیوں کے طرز عمل اور طرز احساس پر طنز کے تیر برساتے ہیں۔ ان کا اشہب قلم وہاں خوب رواں ہوتا ہے جہاں وہ ایرانی بادشاہ رضا شاہ پہلوی کا ذکر کرتے ہیں اور اس کے ظالمانہ طور طریقوں کو حقائق کی روشنی میں پیش کرتے ہیں۔ ایرانی تہذیب و ثقافت دیکھ کر آغا سہیل لکھنؤ کے کلچر کو یاد کرتے ہیں اور اشکبار ہو جاتے ہیں۔

مجموعی طور پر آغا سہیل کا سفرنامہ "ایران میں چودہ روز" اپنے موضوع اور اسلوب کے اعتبار سے قابل قدر ہے۔

(۵)

ڈاکٹر آغا سہیل داستانوی نثر سے خصوصی رغبت رکھتے ہیں۔ سرور سلطانی کی تدوین اور لکھنوی داستان کے ارتقاء پر تحقیقی و تنقیدی کام کرتے ہوئے ڈاکٹر آغا سہیل نے داستان میں چھپے ہوئے علامتی نظام کا بطور مطالعہ بھی کیا اور اس کی ترقی یافتہ شکلوں یعنی ناول اور افسانے سے اپنا رشتہ بھی مضبوط بنانے کی کامیاب سعی کی۔ داستان سے ناول تک کا سفر آغا سہیل کے لیے زیادہ کٹھن ثابت نہ ہوا۔ انہوں نے داستانوں سے حاصل ہونے

والی دانش و بینش کو اپنے ناولوں میں سمونے کی مقدور بھر کوشش کی ہے۔ یہی سبب ہے کہ آغا سہیل کے ناولوں کو بھی اردو ادب میں معتبر مقام حاصل ہے۔

آغا سہیل نے اپنا تخلیقی سفر ناول نگاری سے شروع کیا۔ ان کا پہلا ناول "غبار کوچہ جاناں" شائع ہوا تو برصغیر پاک و ہند کے معتبر ناقدین نے اس ناول کا خیر مقدم کیا اور اس ناول کے حوالے سے تحسینی کلمات رقم فرمائے۔ ملک کے معروف جرائد نے اس ناول پر تبصرے کیے اور اس ناول کو تشکیل پاکستان کے پس منظر میں لکھا جانے والا معتبر ناول قرار دیا۔ تاہم حیرت کی بات یہ ہے کہ اس قدر پذیرائی کے باوجود ڈاکٹر آغا سہیل نے اس صنف سے ہاتھ کھینچ لیا اور تقریباً ربع صدی کے بعد ان کا دوسرا اور آخری ناول منظر عام پر آیا۔

ڈاکٹر آغا سہیل ناول کے فن سے بخوبی آگاہ ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان کے ناولوں میں فنی محاسن یکجا ہو گئے ہیں۔ کرداروں کی تشکیل و تعمیر قصے کا ارتقا کرداروں کی نفسیاتی ہیجان خیزیاں اور زبان و بیان پر بے پناہ دسترس نے آغا سہیل کو صف اول کے ناول نگاروں میں شامل کر دیا ہے۔

ڈاکٹر آغا سہیل کے درج ذیل دو (۲) ناول زیور طبع سے آراستہ ہو چکے ہیں۔

(i) غبارِ کوچہ جاناں

(ii) کہانی عہد زوال کی

اب ذیل میں ان دونوں ناولوں کے حوالے سے چند معروضات پیش خدمت ہیں:

(۱) "غبارِ کوچہ جاناں" پہلی مرتبہ ۱۹۶۷ء میں فیروز سنز لاہور کے مہتمم عبدالحمید خان کی معاونت سے شائع ہوا۔ اس ناول کی پذیرائی دیکھتے ہوئے بعد میں اس کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے۔ دو سو چوراسی (۲۸۴) صفحات پر محیط یہ ناول کسی کے نام معنون نہیں کیا گیا ہے۔ اس ناول کے فلیپ پر احمد ندیم قاسمی کی رائے شامل کی گئی ہے۔

اردو میں قیام پاکستان کے حوالے سے کئی ناول لکھے گئے ہیں جن میں ناول نگاروں نے اپنے جذباتی رویوں کو نظریات کے لبادے میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ آغا سہیل کا یہ ناول تقسیم برصغیر کے حوالے سے لکھا گیا ہے اور مصنف نے اس ناول میں اپنے نظریات کو نہایت سلیقے سے پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے تو احمد ندیم قاسمی کی یہ رائے سن لیجئے:

" آغا سہیل اردو کے ان گنے چنے نوجوان اہل قلم میں سے ہیں جو الفاظ کے پراسرار اور دلاویز کردار سے بخوبی واقف ہیں۔ ادب کے جدید تقاضوں کے احترام کے ساتھ ساتھ زبان و بیان کے حسن کا اتنا لحاظ بہت کم اہل قلم کو ودیعت ہوا ہے اور آغا سہیل کے فن کی یہ نمایاں ترین خوبی ہے۔

"غبار کوچہ جاناں" ان کا ایک نظریاتی فن پارہ ہے جو لوگ نظریہ اور فن کو ایک دوسرے کی ضد قرار دے دیتے ہیں وہ آغا سہیل کا یہ ناول پڑھیں گے تو انہیں یہ خوشگوار تجربہ حاصل ہوگا کہ جب کسی نقطہ نظر کو فن کا لباس پہنا دیا جائے تو ایسے ادب کی نوعیت دو آتشہ اور اس کی گرفت ہمہ گیر ہو جاتی ہے۔

اس ناول میں نظریہ اور فن کا حسین امتزاج ہمارے ذہن میں ایک ایسے نظریے کی شکست و ریخت کا بھرپور تاثر پیدا کرتا ہے جو انفرادی فکر کی رو سے تو شاید دیانت پر مبنی ہو مگر جو روح عصر کے خلاف تھا اور تاریخ و تہذیب کے تیز دھارے کے مخالف سمت کو جانے پر مصر تھا۔ ناول میں یہ نظریہ ایک دھماکے سے نہیں ٹوٹتا بلکہ تاریخ کی بے رحم منطق کی زد میں آکر آہستہ آہستہ ریزہ ریزہ ہوتا رہتا ہے اور جب ناول ختم ہوتا ہے تو قاری کے ذہن میں کوئی الجھن باقی نہیں رہتی۔ اس پر حقیقت و صداقت کا

آفتاب طلوع ہو چکا ہوتا ہے۔"

(احمد ندیم قاسمی۔فلیپ۔ غبار کوچہ جاناں)

ڈاکٹر آغا سہیل کے اس نظریہ ساز ناول کی قارئین اور ناقدین دونوں نے پذیرائی کی۔ اس ناول کے کئی ایڈیشن کا چھپنا قارئین کی اس سے بے پناہ دلچسپی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اسی طرح ناقدین نے اس ناول کے بارے میں جن جذبات کا اظہار کیا ہے وہ بھی قابل توجہ ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے پروفیسر احتشام حسین کی رائے ملاحظہ فرمایئے۔

> "ناول میں بعض نظریات سے اختلافات کے باوجود آپ کی ہنر مندی اور ناول کی تکنیک پر مضبوط گرفت سے میں متاثر ہوا ہوں۔ زبان و بیان کی خوبیاں بھی ہیں اور کردار نگاری میں نفسیاتی الجھنوں کو مناسب مقام دیا گیا ہے۔ ناول کا انداز' منظر نگاری وغیرہ سب بہت خوبصورت ہیں۔ بحیثیت مجموعی مجھے ناول پسند ہے۔"

(احتشام حسین۔فلیپ۔بدلتا ہے رنگ آسماں)

ڈاکٹر آغا سہیل کا ناول غبار کوچہ جاناں موضوع کے ساتھ ساتھ زبان و بیان کا بھی حسین مرقع ہے۔ اس ناول کے کردار ماحول اور ضرورت کے تحت زبان بلاتے ہیں۔ آغا سہیل کی زبان دانی مسلم ہے یہی وجہ ہے کہ ان کا یہ ناول زبان و بیان کا انتہائی حسین مرقع بن گیا ہے۔ زبان و موضوع کی باہمی گرفت کے حوالے سے ڈاکٹر شارب ردولوی کی یہ رائے ملاحظہ فرمایئے۔

> "ناول پڑھ کر سارا لکھنؤ نظر میں گھوم گیا اس میں شک نہیں کہ ناول کے بعض حصے بہت اچھے ہیں اور جس موضوع کو تم لے کر چلے ہو ان موضوعات پر اب کوئی نہیں لکھتا۔ اس پر کچھ لکھنے کی واقعی ضرورت تھی تقسیم پر ہمارے سامنے اردو میں کافی ذخیرہ

موجود ہے لیکن اس کے بعد کی تکنیک کے حوالے سے یہ پہلا
ناول ہے"

(ڈاکٹر شارب ردولوی۔ فلیپ۔ بدلتا ہے رنگ آسماں)

مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ آغا سہیل کا ناول غبار کوچہ جاناں اردو ناول کی تاریخ میں ایک معتبر دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ آخر میں ڈاکٹر محمد علی صدیقی کی یہ رائے ہمارے موقف کی بھرپور تائید کرے گی۔

"He wrote his first novel Ghubar_i_Kocha_i_Janan in the classical mould. There is a story, a plot (which means that the effect has to be structured) characters and a moral. The novel has been written in the background of the decadent culture of the Oudhe but there is an unmustakable sign that he was not lamenthing the donwfall of former aristrocracy. He was only delineating the change in attitudes and behaviour patterns of those involved in the traumatic transition. The noval is a bit self_explanatory here and there but it dose not reflect writers diffidence in the readers intelligence. Perhaps it is in deference to the requirements of the craft as understood by him and his predecessors. The new funds, doing away with the plot, characters and the

viewpoint, had not arrived as yet was concerned. He did not write a lose sentence. Even his character who speak the colloquial have to be tied down to a certain minimum level of purity. it is not a no holds bar red approach. Many a progressive writers raised eyebrows on the dexterity which Agha Sohail practised with his concern for linguistic purity."

(Dr.M.A.Sidiqui, The Star June, 26 1991)

(ب) ڈاکٹر آغا سہیل کا دوسرا ناول "کہانی عہد زوال کی" ۱۹۹۱ء میں شائع ہوا۔ پاکستان بکس اینڈ لٹریری ساؤنڈز لاہور کے مہتمم طاہر اسلم گورا نے یہ ناول نہایت سلیقے سے شائع کیا ہے۔ آغا سہیل نے چار سو چھتیس صفحات پر مشتمل اس ناول کو اپنی اہلیہ اور بچوں کے نام معنون کیا ہے۔

"کہانی عہد زوال کی" ایک ایسے عہد کی کہانی پر مشتمل ہے جسے زوال آ چکا ہے۔ مصنف نے اس ناول کو اپنے گزشتہ ناول کی توسیع قرار دیا ہے گویا یہ ناول غبار کوچہ جاناں کا تتمہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر آغا سہیل ایک ترقی پسند تخلیق کار ہیں۔ انہوں نے اس ناول میں لکھنؤ کی اجڑتی ہوئی تہذیب کے نقش و نگار محفوظ کرنے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے پاکستان میں بنتی بگڑتی تہذیب کی صورت حال پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ یہ ناول دراصل ایک ایسے شخص کا المناک قصہ بیان کرتا ہے جو ایک خاص تہذیبی روایات کا علم بردار ہے لیکن اسے اس تہذیب و تمدن کو الوداع کہنا پڑتا ہے۔ نئی تہذیب اسے قبول نہیں کرتی اور وہ پرانی تہذیب سے کوشش کے باوجود پیچھا نہیں چھڑا سکتا۔ بعض ناقدین کا کہنا ہے کہ یہ ناول دراصل آغا سہیل کی ذاتی شخصیت کا عکاس ہے۔

"کمانی عہد زوال کی" میں آغا سہیل نے معاشرے کے تمام منفی رویوں پر طنز کے تیر برسائے ہیں۔ وہ استحصال کرنے والے افراد اور اداروں کے خلاف ترش لب و لہجہ اختیار کرتے ہیں۔ وہ ہر اس قوت کے خلاف صف آرا ہونے کا پیغام دیتے ہیں جو عوام الناس کو کسی بھی سطح پر مفلوج کرنے میں مصروف ہے۔ یہی سبب ہے کہ اس ناول میں نفی سے اثبات کی جانب سفر ملتا ہے۔

آغا سہیل زبان و بیان پر قدرت رکھتے ہیں اس ناول میں بھی ان کی شائستہ زبان خوب رنگ دکھاتی ہے۔ طنزیہ لب و لہجہ نے اس ناول کی شان کو دوبالا کر دیا ہے۔ مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ فکر و فن ہر دو اعتبار سے یہ ناول انتہائی وقعت کا حامل ہے اور اردو ناول کی تاریخ میں اس کا نام ہمیشہ جگمگاتا رہے گا۔

راقم الحروف نے آغاز میں یہ نکتہ باور کرنے کی کوشش کی تھی کہ آغا سہیل کے دونوں ناولوں میں پون صدی کا فاصلہ ہے۔ ۱۹۶۷ء سے شروع ہونے والا ناول کا سفر ۱۹۹۱ء میں مکمل ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ "غبار کوچہ جاناں" کے ذریعہ آغا سہیل نے جو قصہ شروع کیا تھا وہ "کمانی عہد زوال کی" میں مکمل ہو گیا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ آغا سہیل اس کمانی کو جاری رکھتے ہیں یا نہیں....

(۶)

ڈاکٹر آغا سہیل کی حیات و فن کے حوالے سے ایک کتاب مرتب کرنے کا منصوبہ راقم کے ذہن میں ایک طویل عرصہ سے خواب کی صورت میں موجود تھا جو بحمد للہ اب "آغا صاحب" کی شکل میں تعبیر بن کر سامنے آگیا ہے۔ اس کتاب کی تشکیل کے پس منظر میں درج ذیل نکات پیش نظر تھے۔

ا) آغا سہیل کی سحر انگیز شخصیت کے تمام پہلوؤں کو اجاگر کرنا

ب) آغا سہیل کے فن کے تمام رخوں کا احاطہ کرنا اور ہر پہلو کا بھرپور فکری و فنی جائزہ لینا

ج) آغا سہیل کی شخصیت اور فن کے حوالے سے لکھا جانے والا تنقیدی مواد یکجا کرنا

د) آغا سہیل کے کارناموں کو ایک دستاویز کی صورت میں محفوظ کرنا

اس چار نکاتی منصوبہ پر راقم ایک طویل عرصے سے کام کر رہا تھا۔ اس منصوبے کی پہلی منزل اس وقت مکمل ہوئی جب راقم نے ۱۹۹۳ء میں "ماہنامہ شام و سحر لاہور" کا "آغا سہیل نمبر" ترتیب دیا۔ اس نمبر کی شاندار پذیرائی نے راقم کا حوصلہ بڑھایا اور اس نے زیر مطالعہ کتاب کی تسوید کا ڈول ڈالا۔ راقم نے ہر ممکن کوشش کی کہ برصغیر پاک و ہند کے تمام معتبر ناقدین سے آغا سہیل کی حیات و فن کے حوالے سے مضامین لکھوائے جائیں۔ اس کتاب کی فہرست دیکھ کر ان کوششوں کا ثمر دیکھا جا سکتا ہے۔ راقم نے مقدور بھر کوشش کی ہے کہ ناقدین کی اصل تحریریں قارئین تک پہنچیں۔ یہی سبب ہے کہ اس نے کسی مقالے میں کمی بیشی نہیں کی تاہم اختلاف رائے کا حق محفوظ بھی رکھا ہے اور بعض مضامین کے آغاز میں اس کا واضح اعلان بھی کر دیا ہے۔ دراصل راقم کا واضح موقف یہ ہے کہ ہر ناقد کو اپنا نقطہ نظر پیش کرنے کا اختیار ہے اور نقاط نظر کے اسی اختلاف سے فکر و نظر کے نئے در روا ہوتے ہیں یہی سبب ہے کہ راقم نے اپنے دوستوں کے مشوروں سے اختلاف کرتے ہوئے بعض ایسے مضامین بھی کتاب میں شامل کیے ہیں جس میں ناقدین نے آغا سہیل کے فن پر تنقیصی حوالے سے بحث کی ہے۔ اب یہ قارئین کا کام ہے کہ وہ موجود مواد سے اپنا ذاتی نقطہ نظر وضع کریں۔

زیر مطالعہ کتاب کا نام تجویز کرنا بھی ایک مشکل مرحلہ تھا۔ راقم کی خواہش تھی کہ اس کا نام ایسا ہونا چاہیے جو ڈاکٹر آغا سہیل کی شخصیت اور فن کا مکمل احاطہ بھی کرے اور اس میں احترام کا جذبہ بھی ہویدا ہو۔ دوستوں سے مشورے کے بعد یہی طے ہوا کہ کتاب کا نام **"آغا صاحب"** رکھا جائے اور قوسین میں کتاب کی نوعیت واضح کر دی جائے۔ کتاب کا نام طے کر کے راقم کو دلی سکون حاصل ہو گیا ہے کہ ڈاکٹر آغا سہیل اب فیض صاحب اور باقر صاحب کے زمرے میں داخل ہو کر "آغا صاحب" ہو گئے ہیں۔

"آغا صاحب" کو ترتیب دیتے ہوئے راقم الحروف کے ذہن میں یہ بات موجود تھی کہ ڈاکٹر آغا سہیل کی شخصیت اور فن کے تمام پہلوؤں کا احاطہ ہو جائے۔ راقم نے اسی بنیاد پر ایک طویل مقدمہ تحریر کیا جس میں آغا سہیل کی تمام فنی جہتیں آشکار کرنے کی کوشش کی۔ اس کے بعد راقم نے کتاب کو درج ذیل حصوں میں تقسیم کر کے آغا سہیل کی حیات و فن قارئین کے سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔

ا) تعارف

ب) شخصیت

ج) خاکہ

د) افسانہ

ر) تنقید

س) سفرنامہ

ص) ناول

ط) گفتگو

ع) تبصرے

درج بالا حصوں میں تقسیم کرنے کے بعد راقم نے تمام ناقدین کے مضامین و تاثرات کو اسی ذیل میں تقسیم کر دیا ہے تاکہ آغا سہیل کی شخصیت کا ہر رخ اور ہر پہلو اجاگر ہو جائے۔

اس کتاب کو خواب سے تعبیر تک پہنچانے میں راقم الحروف کے تین دوستوں جناب عبدالکریم خالد' جناب نواز حسن زیدی' اور جناب عباس رضا کا کردار قابل رشک رہا ہے۔ ان احباب نے کسی بھی مرحلے میں راقم کو تنہا محسوس نہیں ہونے دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر ان اصحاب کی معاونت نہ ہوتی تو یہ کتاب اتنی جلدی معرض وجود میں نہ آتی۔ راقم ان حضرات کا صدق دل سے ممنون ہے اس کتاب کے مواد کے حصول کے لیے راقم جناب ڈاکٹر آغا سہیل اور جناب محسن سہیل کا شکر گزار ہے۔ ان حضرات نے وقتاً فوقتاً جس طرح

راقم کی دستگیری فرمائی ہے اس کی تفصیل کے لئے علیحدہ باب کی ضرورت ہے۔ اس کتاب کو وقیع اور معتبر بنانے میں جناب طاہر مسعود کا فراہم کردہ مواد نہایت سود مند ثابت ہوا۔ راقم ان کی کامیابی کے لیے دعاگو ہے۔ اس کتاب کو صوری اعتبار سے جاذب نظر بنانے میں جناب صفدر احمد فاروقی ' جناب شیخ عمران حیدر اور جناب بشیر عابد کا کردار قابل تعریف ہے۔ راقم الحروف ان تمام ناقدین و محققین کا بھی شکر گزار ہے جن کے مضامین ' مقالات ' کالموں انٹرویوز اور تبصروں نے اس کتاب کو معتبر بنایا۔ سب سے آخر میں راقم اپنے والد گرامی قدر جناب سید وحید الحسن ہاشمی کا شکر گزار ہے کہ یہ کتاب ان ہی کے فیضان نظر کی عطا ہے۔

راقم بطور خاص اپنی والدہ ' اہلیہ بچوں ایما ' اثنا ' اور بیٹے وجیہ الحسن کا شکر گزار ہے جنہوں نے ہر مرحلے میں راقم کی معاونت کی اور اسے ہر طرح سے سکون فراہم کیا۔ راقم اپنی اس کتاب کو اپنے دو علمی محسنین جناب اور جناب چوہدری محمد اشرف صاحب کے نام معنون کر رہا ہے کہ ایسے دوستوں سے علمی راہیں کشادہ ہو جاتی ہیں۔ راقم نہایت عجز و انکسار کے ساتھ اپنے واجب الاحترام استاد جناب ڈاکٹر آغا سہیل کی خدمت میں "آغا صاحب" پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہے کہ شاید اس سے شاگردی کا کچھ حق ادا ہو سکے۔

شبیہ الحسن

ڈاکٹر شبیہ الحسن

استاد شعبہ اردو

گورنمنٹ ایف سی کالج لاہور

۱۵ جولائی ۱۹۹۸ء

تعارف

❁ تعارف

آغا سہیل ۔ ایک نظر میں

ڈاکٹر شبیہ الحسن

آغا سہیل ۔ عہد بہ عہد

ڈاکٹر شبیہ الحسن

ڈاکٹر آغا سہیل -- ایک نظر میں

مرتب

۱۔ اسم: محمد آغا سہیل

۲۔ قلمی نام: (i) سہیل ادیب (ii) آغا سہیل

۳۔ ولادت: ۶ جون ۱۹۳۳ء لکھنؤ

۴۔ خاندان:

(i) پردادا: آغا محمد حسن اصفہانی

(ii) دادا: آغا محمد جعفر

(iii) نانا: ڈاکٹر مرزا وہاب الدین

(iv) والد: آغا محمد صادق (محمد صادق علی خان)

(v) والدہ: بختاور بیگم (مصطفےٰ بیگم)

(vi) اہلیہ: حشمت آرا بیگم

(vii) اولاد: (بیٹے) پروفیسر محسن سہیل' ڈاکٹر مسعود سہیل' معارف سہیل' احتشام سہیل۔

(بیٹیاں) ڈاکٹر مسرت عابد' پروفیسر طلعت سہیل۔ پروفیسر نصرت حماد' ڈاکٹر ندرت سہیل۔

۵۔ تعلیم:

(i) میٹرک: گردھاری سنگھ اندر کنور انٹر کالج

(ii) انٹرمیڈیٹ: جوبلی کالج' لکھنؤ

(iii) ادیب ماہر: جامعہ اردو علی گڑھ

(iv) بی اے: لکھنؤ یونیورسٹی لکھنؤ

(v) ایم اے: لکھنؤ یونیورسٹی لکھنؤ

(vi) پی ایچ ڈی: پنجاب یونیورسٹی لاہور

۶۔ ملازمت:

(i) مدرس شیعہ کالجیٹ سکول لکھنؤ

(ii) مدرس ایڈورڈز کالج، پشاور

(iii) معاون ریڈیو پاکستان پشاور

(iv) مدرس گورنمنٹ ایف سی کالج، لاہور

(v) ڈائریکٹر جنرل اردو سائنس بورڈ لاہور

۷۔ سبکدوش:

۶ جون ۱۹۹۳ء (بحیثیت صدر شعبہ اردو و ڈین آف آرٹس گورنمنٹ ایف سی کالج لاہور)

۸۔ تصانیف:

ا (مطبوعہ)

ناول

غبار کوچہ جاناں --- کہانی عہد زوال کی

افسانے

بدلتا ہے رنگ آسمان --- شہر نا پرساں --- قل برابر آسمان --- اگن کنڈلی --- بوند بوند پانی

تنقید و تحقیق

معارف سبیل (مقالات و خاکے) --- ادب اور عصری حسیت (مقالات) --- دبستان لکھنؤ کے داستانی ادب کا ارتقاء (مقالہ ڈاکٹریٹ) --- سرور سلطانی (تالیف) --- اردو کا لسانیاتی خاکہ

سفر نامہ

افق تا بہ افق (انگلستان) --- ایران میں چودہ روز (ایران)

(ب) زیر اتسوید

جوش --- ایک مطالعہ (تنقید)

سفرنامہ امریکہ (سفرنامہ)

گردِ پسِ کارواں (افسانے)

۹۔ اسفار:

بھارت ' ایران ' انگلستان ' ترکی ' ابو ظہبی ' امریکہ ' کینیڈا

۱۰۔ اعزازات:

۱۔ فیلو ہمدرد یونیورسٹی کراچی

۲۔ ایوارڈ ' تیسری بین الاقوامی لٹریری فیسٹیول لکھنؤ

۳۔ ایوارڈ ' اردو اکیڈمی ' دلی

۴۔ ایوارڈ ' غالب اکیڈمی ' دلی

۵۔ نیاز فتحپوری ایوارڈ ' کراچی

۶۔ خمینی ایوارڈ ' تہران

۷۔ فراق ایوارڈ: تہران

۸۔ مجاز ایوارڈ ' لکھنؤ

۹۔ فیض ایوارڈ ' کراچی

۱۰۔ وثیقہ اعتراف ' ہمدرد کراچی

۱۱۔ ادب پروری:

۱۔ سیکرٹری ترقی پسند مصنفین ' لکھنؤ

۲۔ ممبر حلقہ ارباب ذوق لاہور

۳۔ ممبر بزم ہم نفساں ' لاہور

۱۲۔ علم پروری:

(ڈاکٹر آغا سہیل کی نگرانی میں لکھے جانے والے ایم اے اردو کے تحقیقی مقالات)

۱۔ مقدمہ شعر و شاعری اور ہماری شاعری کا تقابلی مطالعہ

ناصرہ رحمان ۱۹۸۷ء

۲۔ محمد عظیم قریشی۔ حیات و فن

طاہر مسعود ۱۹۸۷ء

۳۔ خواجہ منظور حسین۔ شخصیت و فن

مرزا عبدالقدوس ۱۹۸۸ء

۴۔ ڈاکٹر ظہیر فتح پوری شخصیت و فن

صہیب انور رانا ۱۹۸۸ء

۵۔ لکھنؤ کے لسانی تحاریک اور ان کا اردو زبان و ادب پر اثر

طارق سلیم ۱۹۸۸ء

۶۔ پروفیسر ممتاز حسین شخصیت اور فن

باقر علی شاہ ۱۹۸۹ء

۷۔ ڈاکٹر مسعود رضا خاکی شخصیت و فن

رباب احسن ۱۹۸۹ء

۸۔ سیف الدین سیف شخصیت و فن

نوشیلہ فرحت ۱۹۸۹ء

۹۔ جیلانی کامران شخصیت و فن

عارفہ متین ۱۹۹۰ء

۱۰۔ حیات امروہوی شخصیت و فن

ثمرینہ کمال ۱۹۹۰ء

۱۱۔ شاہد نقوی شخصیت و فن

صبغہ فاروق ۱۹۸۷ء

۱۳۔ قیام:

۳۵۵۔ اے، جوہر ٹاؤن لاہور

فون: ۵۳۰۰۱۹۸۔ ۵۳۰۰۱۷۶

آغا سہیل -- عہد بہ عہد

مرتب

۱۹۳۳ء: ولادت' ۶ جون لکھنؤ۔

۱۹۳۴ء: برادران توام پیدا ہوئے اور وفات پاگئے۔

۱۹۳۵ء: کوئی غیر معمولی واقعہ نہیں ہوا۔

۱۹۳۶ء: چھوٹے بھائی کی ولادت ۱۳ فروری' والد کی وفات ۱۷ فروری۔

۱۹۳۷ء: رسم بسم اللہ از ناصر الملت مولانا سید ناصر حسین قبلہ۔

۱۹۳۸ء: قرآن ناظرہ از مولوی تصدق حسین اور ساتھ ساتھ دیگر ابتدائی کتب کا مطالعہ۔

۱۹۳۹ء: ماسٹر محمد باقر صاحب سے اردو' انگریزی اور ریاضی پڑھی۔

۱۹۴۰ء: -- ایضاً --

۱۹۴۱ء: داخلہ گردھاری سنگھ اندر کنور انٹر کالج لکھنؤ۔

۱۹۴۲ء: دادی کا انتقال ہوا' معاشی حالات دگرگوں ہوئے۔

۱۹۴۳ء: سکول میں مضمون نویسی کا آغاز ہوا۔

۱۹۴۴ء: رسائل و اخبار کا باقاعدہ مطالعہ شروع ہوا۔

۱۹۴۵ء: کہانیاں' داستانیں اور ناول پڑھنے شروع کئے۔

۱۹۴۶ء: کوئی غیر معمولی واقعہ ظہور میں نہیں آیا۔

۱۹۴۷ء: -- ایضاً ---

۱۹۴۸ء: پہلا افسانہ "راشی" لکھا۔

۱۹۴۹ء: الوارث بمبئی کے سیماب نمبر میں چھپا۔

۱۹۵۰ء: اینڈی سائنٹس میں مبتلا ہوا' فٹ بال اور کرکٹ کھیلنا ترک ہوا۔

۱۹۵۱ء: ستمبر میں شادی ہو گئی' پاکستان کا پہلا سفر۔

۱۹۵۲ء: مغربی ادب پڑھنے کا چسکا لگا' موپساں' وکٹر ہیوگو' گورکی' ٹالسٹائی' چیخوف اور او ہنری کے علاوہ کافکا کو پڑھنا اور سمجھنا شروع کیا۔

۱۹۵۳ء: اسکول سے تدریس کا آغاز ہوا۔

۱۹۵۴ء: ۱۹۵۰ء میں یو پی میں جو زمینداری کا خاتمہ ہوا' اس کے سبب بعض مقدموں میں پھنسا رہا اور پاکستان آتا اور جاتا رہا۔

۱۹۵۵ء: شوقیہ ادیب ماہر کا امتحان پاس کیا اور تعلیمی سلسلہ یونیورسٹی میں جاری رہا' سہیل ادیب کا قلمی نام ترک کیا۔

۱۹۵۶: وکٹر ہیوگو کے کچھ تراجم کئے۔

۱۹۵۷: نفسیات کا مطالعہ شروع کیا' فرائڈ یونگ اور ایڈلر کو پڑھنے اور سمجھنے کا آغاز کیا۔

۱۹۵۸ء: روسی اور فرانسیسی ادب کا مطالعہ شروع ہوا۔

۱۹۵۹ء: چیخوف اور او ہنری کے افسانے بطور خاص مطالعے میں رہے اور دستوفسکی پسند آنے لگا۔

۱۹۶۰ء: ایف سی کالج لاہور میں تقرر۔

۱۹۶۱ء: جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف سوشلسٹ نظام کی افادیت پر غور و خوض شروع ہوا اور مادی جدیدیت کے فلسفے کا فکری اور عقلی سطح پر قائل ہوا۔

۱۹۶۲ء: ۱۸ نومبر والدہ کا لکھنؤ میں انتقال ہوا' لاہور سے لکھنؤ جانے میں تاخیر کے سبب چہلم میں شرکت نہ کرسکا۔

۱۹۶۳ء: ہیگل کے مقابلے میں مارکس اور اینگلز کے فلسفہ کی فوقیت

۱۹۶۴ء: مارکس کو پلیخانوف کی تفسیری روشنی میں سمجھنے کی کوشش

۱۹۶۵ء: ناول "غبار کوچہ جاناں" لکھا' ۱۹۶۵ء کی جنگ کا پس منظر واضح ہوا

۱۹۶۶ء: سرور سلطانی مرتب کی اور مجلس ترقی ادب سے شائع ہوئی۔

۱۹۶۷ء: ناول "غبار کوچہ جاناں" چھپا

۱۹۶۸ء: تیسری دنیا پر پہلی دنیا کا استعماری نظام سمجھ میں آنے لگا' ذیابیطس کا مرض لاحق ہوا' جو جاری ہے۔

۱۹۶۹ء: مزاحمتی اور احتجاجی ادب کا مطالعہ شروع کیا۔

۱۹۷۰ء: مزاحمتی اور احتجاجی ادب کی تخلیق پر مائل ہوا۔

۱۹۷۱ء: مشرق پاکستان کے سقوط کے پس منظر میں لکھنا شروع کیا اور قومیتوں کے فلسفے پر غور کیا۔

۱۹۷۲ء: ایف سی کالج سمیت پاکستان بھر کے تعلیمی ادارے نیشنلائزڈ ہوئے۔

۱۹۷۳ء: پاکستان میں قومیتوں کے مسائل پر غور و خوض شروع ہوا۔

۱۹۷۴ء: اس حوالے سے لکھنا شروع کیا۔

۱۹۷۵ء: افسانوں کا پہلا مجموعہ "بدلتا ہے رنگ آسماں" چھپا۔

۱۹۷۶ء: مقالات کا پہلا مجموعہ "معارف سہیل" چھپا' ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی۔

۱۹۷۷ء: صدر شعبہ اردو بنا' (گورنمنٹ ایف سی کالج لاہور)

۱۹۷۸ء: ذیابیطس کے مرض میں اضافہ ہوا اور دس سال ہو گئے۔

۱۹۷۹ء: ۲۳ اکتوبر بڑی بیٹی کی شادی ہوئی۔

۱۹۸۰ء: تیسری دنیا کی محرومیوں کا جائزہ اور ادبی محاذ۔

۱۹۸۱ء: احتجاجی اور مزاحمتی ادب کا مطالعہ۔

۱۹۸۲ء: ایف سی کالج میں ایم اے اردو کا اجرا ہوا اور تدریسی عملے میں توسیع ہوئی۔

۱۹۸۳ء: احتجاجی اور مزاحمتی ادب کی تخلیق جاری ہے۔

۱۹۸۴ء: --ایضاً---

۱۹۸۵ء: انگلستان کا سفر کیا اور "افق تا بہ افق" سفرنامہ لکھا۔

۱۹۸۶ء: گریڈ ۱۹ میں پروفیسر شپ ملی اور بیٹی مسرت کو ڈاکٹریٹ ملی۔

۱۹۸۷ء: مطالعے اور مشاہدے کے دوائر وسیع ہو رہے ہیں۔

۱۹۸۸ء: فروری میں نانا اور مارچ میں دادا بنا' ذیابیطس کے مرض کو لاحق ہوئے بیس سال گزر گئے۔

۱۹۸۹ء: مطالعے کے نئے نئے گوشے دریافت ہوئے مادی جدلیت کے فلسفے پر روز بروز یقین پختہ ہوتا جا رہا ہے۔ اگرچہ روس کے سقوط کے آثار کے بعد دنیا میں افراتفری بھی ہوئی ہے لیکن یہ سوشلسٹ نظام فکر کی شکست نہیں ہوگی بلکہ روسی بیوروکریسی کی شکست ہوگی۔

۱۹۹۰ء: سفرنامہ انگلستان "افق تا بہ افق" شائع ہوا۔

۱۹۹۱ء: رسالہ ارتقا کراچی نے آغا سہیل کی شخصیت و فن پر ایک گوشہ مخصوص کیا' ستمبر میں شادی کی چالیسویں سالہ سالگرہ منائی۔ ناول "کہانی عہد زوال کی" شائع ہوا۔

۱۹۹۲ء: سقوط روس کے بعد سوشلسٹ دنیا کو دھچکا لگا۔

۱۹۹۳ء: ایف سی کالج لاہور سے سبکدوشی اور اردو سائنس بورڈ میں ڈائریکٹر جنرل کی حیثیت سے تقرر اور چھ ماہ بعد سبکدوشی' ماہنامہ شام و سحر کا آغا سہیل نمبر شائع ہوا۔ سفرنامہ "ایران میں چودہ روز" شائع ہوا۔

۱۹۹۴ء: امریکہ' کینیڈا اور یو کے کا سفر کیا۔

۱۹۹۵ء: افسانوں کا مجموعہ "بوند بوند پانی" شائع ہوا۔

۱۹۹۶ء: ایک حادثے کا شکار ہوا۔

۱۹۹۷ء: لکھنے پڑھنے کا عمل جاری رہا۔

۱۹۹۸ء: علالت کے باوجود تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری ہے۔ علم و ادب کی پیاس نہیں بجھی۔ بشرط حیات تخلیقی اور تنقیدی ادب کے محاذ پر کچھ منصوبے تکمیلی مراحل میں ہیں۔

شخصیت

❁ شخصیت

میں کون ہوں کیا ہوں
ڈاکٹر آغا سہیل

آغا سہیل چند باتیں چند یادیں
احمد ندیم قاسمی

آغا سہیل میرا دوست
شور صہبائی

میں کون ہوں، کیا ہوں

ڈاکٹر آغا سہیل

میرے جد اعلیٰ آغا محمد حسن اصفہان سے تعلق رکھتے تھے۔ قزلباش تھے اور غالباً اصفہان کے محلّے قزلباشاں سے تعلق رکھتے تھے۔ ابتدائی تعلیم اصفہان میں حاصل کر کے نجف اشرف چلے گئے اور پھر تحصیل علم کے بعد لکھنؤ آ گئے، جہاں تفسیر و حاشیہ پڑھانے لگے۔ یہاں حیدر بیگ خان کی پڑپوتی اور حسین علی خان اثر (تلمیذ ناسخ لکھنوی) کی پوتی اور نواب قاسم علی خان کی صاحبزادی سے شادی ہوئی۔ میرے دادا آغا محمد جعفر تولد ہوئے، ان کے دو بیٹے تھے۔ بڑے میرے والد آغا محمد صادق تھے، جن کے جدی اور پشتی نام کو ان کی والدہ نے بدل کر محمد صادق علی خاں کر دیا تھا۔ یہ محض ننھیالی بدعت تھی۔ میرے والد کے بیٹوں کی تعداد دس تھی، جن میں میرا نمبر ساتواں ہے، لیکن اس وقت ساتویں اور دسویں کے سوا سب وفات پا چکے ہیں۔ میری والدہ ڈاکٹر مرزا وہاب الدین کی صاحبزادی تھیں، جو بہادر شاہ ظفر مرحوم کے پوتے تھے۔ میں "پدرم سلطان بود" کا نہ قائل ہوں اور نہ حامی، لیکن یہ جانتا ہوں کہ میرے نانا بھی خود ساختہ اور جفاکش آدمی تھے۔ ان کے والد کو ایک شاہی باورچی نے انگریزوں سے چھپا چھپا کر رکھا اور پالا پوسا تھا اور وہاب الدین کی تعلیم و تربیت میں ان کے روشن خیال والد اور والدہ کا ہاتھ تھا کہ انہوں نے طب مغربی میں تعلیم مکمل کی اور لکھنؤ کے شاہی ہسپتال (واقع وکٹوریہ گنج) میں سول سرجن مقرر ہوئے، جہاں ان کے نام کی تختی آج بھی آویزاں ہے۔ میری خالہ اور میری والدہ اور میرے ماموں نے سرکار برطانیہ کی پنشن قبول نہ کی اور نہایت خودداری سے گزر بسر کی۔ اودھ کے شاہی خزانے سے شاہی ہسپتال چلتا تھا میرے نانا نے اس کی ملازمت قبول کی، مگر برطانیہ اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی کوئی اعانت قبول نہ کی۔ ہمارے ننھیال میں میٹکاف اور ہڈسن کے مظالم کا چرچا عام تھا۔ لہٰذا برطانوی استعمار کے خلاف خاندان کے بچے بچے میں نفرت کا جذبہ موجود رہا، جو آج بھی ہمارے لئے سرمایہ افتخار ہے۔

میں نے اپنی دادی کو اہل زبان کی طرح فارسی بولتے سنا لیکن گھر کے دوسرے

افراد اردو زبان بولتے تھے نوکر چاکر اردو اور پوربی میں گفتگو کرتے تھے۔ ہم لٹے ہوئے جاگیردار تھے۔ لیکن ٹھاٹ باٹ اور شان و شوکت وہی تھی' جو باپ دادا کے اجداد کے زمانے میں تھی' بھرا بھرتا اور جلا جلتا تھا۔ نوکروں کی ریل پیل تھی۔ مردانے اور زنانے میں نوکروں کی فوج ظفر موج موجود تھی' لیکن میرے بچپن ہی میں انحطاط کا عمل تیزی سے شروع ہوا۔ دادی کے انتقال کے بعد تو لاکھ کا گھر خاک ہوگیا۔ پاؤں تلے سے وہ بساط کھینچ لی گئی' نہ وہ محل رہے' نہ حویلیاں' نہ نوکر چاکر' نہ پیش خدمتیں اور نہ وہ راتیں' جب داستان سرائی ہوتی تھی' نہ وہ دن' جب محفلیں اور مجلسیں آراستہ ہوتی تھیں۔

۱۹۵۰ء کے زمینداری کے خاتمے کے بعد اور بھی مصائب ٹوٹ پڑے۔ دو وقت کی روٹی کے لالے پڑ گئے۔ چنانچہ میں اپنے نانا کی طرح ایک خود ساختہ آدمی ہوں' جس نے انتہائی مشقت اٹھا کر تعلیم کی تکمیل کی' جو بجائے خود ایک علیحدہ داستان ہے۔

ابتدائی تعلیم گردھاری سنگھ اندر کنور کالج سے حاصل کی اور انتہائی لکھنؤ یونیورسٹی سے' ڈاکٹریٹ پنجاب یونیورسٹی سے کی۔ میرے لڑکپن اور عنفوان شباب کے زمانے میں لکھنؤ کا ادبی منظر دو واضح منطقوں میں منقسم تھا اور دونوں طرف افراط و تفریط تھی۔ قدیم لکھنؤ کے دانشور انتہائی کٹر قسم کے رجعت پسند اور لکیر کے فقیر تھے اور دوسری طرف ترقی پسند ادبی تحریک کے زعما تھے۔ ان دونوں میں بھی مزید تقسیم یوں ہوئی کہ قدیم دانشوروں میں انتہا پسند بھی تھے اور میانہ رو بھی اور اسی طرح ترقی پسندوں میں بھی جوشیلے نوجوان بھی تھے' جو ہر پرانی چیز کو' پرانے اقدار اور روایات کو دریا برد کر دینا چاہتے تھے اور وہ میانہ رو بھی تھے' جو حسن و قبح میں امتیاز کرتے اور خوبیوں کو اپناتے اور خامیوں سے اجتناب کرتے تھے۔ قدیم لکھنؤ ثقات فرنگی محل اور ثقات کڑہ ابو تراب خاں کے علاوہ' زبان کے معاملے میں کسی اور کو نہ تسلیم کرتا اور نہ سند مانتا تھا۔ ترقی پسندوں کا جوشیلا گروہ نظریاتی سطح پر نہ صرف ہیگل کو مسترد کرتا اور جوش و خروش کے ساتھ مارکس اینگلز لینن پلیخانوف اور بعدہ اسٹالن تک کے نظریات کو اوڑھنا بچھونا بنائے ہوئے تھا۔ بلکہ ان کے خلاف ایک حرف سننے کا روادار نہ تھا۔ ڈاکٹر ملک راج آنند۔ سجاد ظہیر' سبط حسن' علی سردار جعفری' عبدالعلیم' احتشام حسین' آل احمد سرور کا طوطی بولتا تھا۔ ترقی پسند مصنفین

کے جلسے اولاً آل احمد سرور صاحب کے دولت کدے پر ہوتے اور بعدہ احتشام حسین کے مکان پر ہونے لگے۔ شوکت صدیقی' مجید پرویز' کمال احمد' محمد حسن' قمر رئیس' حسن عابد' سجاد ظہیر' رتن سنگھ' رام لعل' عارف نقوی' عابد سہیل' باقر مہدی' وارث کرمانی' اقبال مجید' سبط اختر' شور صہبائی' شارب ردولوی' رضیہ سجاد ظہیر' احمد جمال پاشا' مسیح الحسن' شوکت عمر' منظر سلیم اور راقم الحروف وغیرہ ان میں پابندی سے شرکت کرتے۔ مسیح الحسن' حسن عابد' راقم الحروف' عارف نقوی اور شارب تو انجمن ترقی پسند مصنفین کی لکھنؤ شاخ کے یکے بعد دیگرے سیکرٹری بھی مقرر ہوئے تھے۔

لکھنؤ کے ثقات میں مسعود حسن ادیب' اثر لکھنوی' علی عباس حسینی' علامہ اختر علی تلہری' علامہ نیاز فتحپوری' مولانا محمد رضا انصاری اور حیات اللہ انصاری شامل تھے اور مجھے ان سب حضرات کی خدمت میں حاضری دینے کا شرف حاصل تھا۔

استاذی سید احتشام حسین کی نظریاتی تنقید پر دوسری کتاب "ادب اور سماج" اسی زمانے میں شائع ہوئی' جس کے بیشتر مضامین نے میری فکری اور نظریاتی تربیت میں اہم کردار ادا کیا۔ مادی جدلیاتی اور تاریخ کے مادی جدلیاتی تصورات رفتہ رفتہ میرے دل و دماغ پر اثرات ڈال رہے تھے۔ تاریخی' عمرانی اور معاشرتی عوامل اور محرکات کا ادب پر اور ادب کی تخلیق پر کیا اثر پڑتا ہے' یہ بات دھیرے دھیرے میری سمجھ میں آنے لگی۔ روس کے سوشلسٹ انقلاب میں مارکس اور اینگلز کے فلسفے' لینن کی قیادت اور پلیخانوف کی تفسیریں جہاں تک میرے ہاتھ لگیں میں نے پڑھنے اور سمجھنے کی کوشش کی۔ عابد سہیل' ڈاکٹر عبدالعلیم سے مارکسی لٹریچر حاصل کیا کرتے تھے اور عابد سہیل سے میں کتابیں اڑا لایا کرتا تھا۔ اس زمانے میں میرے دل و دماغ میں بڑی ہلچل رہی۔ پرانی قدریں اور روایتیں ایک طرف تھیں اور ادب کا سماجی نظریاتی رشتہ دوسری طرف تھا۔ میرے اندر ہی اندر جو فکری کشاکش تھی' اس کا بیان ممکن نہیں۔ تیسری طرف میری جسمانی نشوونما کے سبب نفسیاتی الجھنیں بھی تھیں اور چوتھی طرف تخلیقی کشاکش تھی' پھر میرے معاشی مسائل پیدا ہو چکے تھے کچھ کچی پکی تحریریں بھی اندر سے زور لگا کر باہر آنے کا راستہ بنا رہی تھیں۔ چند افسانے اسی زمانے میں میں نے لکھ ڈالے اور وہ چھپ بھی گئے' لیکن احتشام صاحب نے

بعض بڑے تخلیق کاروں کو پڑھنے کا مشورہ دیا۔ گورکی' طالستائی' چیخوف' اوہنری داستوفسکی' موپساں وکٹر ہیوگو کے علاوہ انتہا یہ ہے کہ البرتو موراویا تک کو پڑھ ڈالا۔ دوسری طرف داستانوں اور اردو ناولوں کو بھی پڑھتا رہا۔ لکھنؤ کی ہنگامہ خیز ادبی محفلوں میں بھی شرکت کرتا رہا' چنانچہ اب تک برا بھلا جو کچھ بن سکا یا بگڑ سکا' وہ اسی ادبی ماحول کا اثر ہے۔ سنیت بیو اور طین کو اس وقت پڑھنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ فرائڈ' یونگ اور ایڈلر کو بھی بعد میں پڑھا اور ابھی تک پڑھنے اور سمجھنے کے مراحل طے کر رہا ہوں۔ افلاطون' ارسطو' ڈیوڈ ہیوم لان جائنیس سے لے کر مادام دی اسٹیل' شلیگل شیلنگ کروچے کو پھر سے سمجھ کر پڑھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ ایذرا پاؤنڈ' ٹی' ایس ایلیٹ سے لے کر اختر احسن تک کو پھر سے پڑھا ہے۔ اردو میں تمام نقادوں' فکشن لکھنے والوں اور شاعروں تک کو بار بار پڑھا اور سمجھنے کی سعی کی۔ میں متخیلہ میں جذبے خیال اور وجدان کو ایک حد تک اہمیت دیتا ہوں۔ لیکن فکری اور عقلی راستہ مجھے پسند ہے کہ بے لگام متخیلہ ماورائیت میں گم کر دیتی ہے۔ اور لایعنیت کا اس زندگی میں کوئی مقام نہیں ہے۔ میں تعصب کی عینک اتار کر ہر شخص کو پڑھتا ہوں لیکن غیر متعصب ہونے کا مدعی نہیں ہوں۔ میں نے کلاسیکی ادب بھی پڑھا اور اس سے کچھ نہ کچھ سیکھا ہے اور میں کلاسیک کا احترام کرتا ہوں' لیکن ترقی پسند ہوں اور انسان اور کائنات کے ارتقاء کا قائل ہوں۔ سماجی رکاوٹوں' استحصال اور استعمار کو سخت ناپسند کرتا ہوں اور دنیا کے ان تمام دانشوروں کا ہم نوا ہوں' جو صاف ستھرے استحصال اور استعمار سے پاک معاشرے کے قیام کے لئے کوشاں ہیں اور برائی کے خلاف مزاحمتی اور احتجاجی ادب تخلیق کر رہے ہیں۔

میں متقدمین اور معاصرین سب کی تحریریں پڑھتا ہوں' ان سے سیکھتا ہوں اور حظ اٹھاتا ہوں' لیکن خصوصیت سے' نظریاتی ادب سے کمیٹڈ (COMITTED) ہوں کہ اسی کے ذریعے انسان اور سماج کا ارتقاء ہے۔ نظریئے کے بغیر جو ادب تخلیق ہوتا ہے' وہ انسان اور معاشرے کو ایسی بند گلی پر لے جاتا ہے' جہاں اندھیرے کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ میں انسان اور معاشرے کو روشنی اور روشن خیالی کی طرف لے جانا چاہتا ہوں اس لئے مجھے مارکس اور اینگلز کا دکھایا ہوا راستہ زیادہ روشن نظر آتا ہے۔

ڈاکٹر آغا سہیل---- چند باتیں چند یادیں

احمد ندیم قاسمی

ڈاکٹر آغا سہیل صاحب اور میرے درمیان علم و ادب کا رشتہ تو ہے ہی، مگر جس رشتے نے روزِ اول سے ہمارے درمیان محبت اور رفاقت اور ہم نظری اور ہم جہتی کو فروغ دیا، وہ پروفیسر سید احتشام حسین مرحوم و مغفور کے ساتھ ہم دونوں کی روحانی اور وجدانی وابستگی تھی۔ ڈاکٹر آغا سہیل کو تو سید احتشام حسین کی شاگردی کا شرف حاصل تھا اور اگر کوئی سعادت مند شاگرد اپنے استادِ گرامی سے نہ صرف علم حاصل کرتا ہے، بلکہ اس سے والہانہ محبت بھی کرتا ہے تو ان دونوں کا باہمی قرب ایک اعزاز سے کم نہیں ہوتا اور ڈاکٹر آغا سہیل کو یہ اعزاز حاصل رہا ہے۔ سید احتشام حسین اور میرے درمیان تو ایک عجیب و غریب نادیدہ محبت کا رشتہ قائم ہو گیا تھا۔ ادبِ لطیف، سویرا اور نقوش کی ادارت کے دوران ان سے جو رابطہ رہا، وہ مدیر اور معاون کے عام رشتے سے کہیں گہرا اور کہیں وسیع تھا۔ خود سید احتشام حسین نے ہمارے درمیان اس رشتے کے بارے میں ایک بار ایک مضمون میں لکھا تھا:۔

"میں نہ تو نادیدہ عشق کا منکر ہوں اور نہ پہلی نگاہ کی محبت کا --- اور کیسے ہو سکتا ہوں، جبکہ احمد ندیم قاسمی کے معاملے میں خود اس جذبے کا شکار اور اس حقیقت سے آشنا رہا ہوں، مجھے مسرت اور اعتماد ہے کہ اس نادیدہ محبت میں مجھ سے غلطی نہیں ہوئی۔"

چنانچہ آغا سہیل اور میرے درمیان سید احتشام حسین محبت اور رفاقت کا مضبوط وسیلہ بنے اور اسی لئے ہمارے باہمی ربط میں سالہا سال سے کوئی معمولی سی الجھن بھی پیدا نہیں ہوئی۔ الجھن کا احتمال بھی کیسے ہو سکتا تھا۔ جبکہ نظریاتی لحاظ سے بھی ہم ایک دوسرے کے قریب ہیں اور تہذیبی لحاظ سے بھی ہم انسان کے احترام و وقار کی قدروں کو یکساں عزیز رکھتے ہیں۔

میری رائے میں آغا سہیل محبت کی تجسیم ہیں۔ جب بھی ملاقات ہوئی، اتنی والہیت سے ملے جیسے برسوں کے بعد مل رہے ہیں۔ پھر ان کی محبت محض زبانی کلامی نہیں

ہے' بلکہ عملاً - بھی وہ جس حد تک دوستوں کی مدد کر سکتے ہیں' اعلان کئے بغیر کرتے ہیں۔ ذاتی طور پر مجھے جب بھی ان کے تعاون کی ضرورت پڑی' انہوں نے یہ تعاون ایسی بے ساختگی کے ساتھ کیا' جیسے پہلے سے اس کے لئے تیار بیٹھے تھے۔ اس دور میں ذہنیتیں کچھ اس طرح حتی طور پر منقلب ہو چکی ہیں کہ میں اس دور میں ڈاکٹر آغا سہیل کے سے مہذب اور شائستہ انسان کا دستیاب ہونا خوارق میں شمار کرتا ہوں۔

افسانہ' تنقید اور تحقیق کے میدانوں میں بھی انہوں نے بڑے بڑے اہل الرائے سے اپنی اہمیت کو تسلیم کرایا ہے۔ میں خوش ہوں کہ مجلس ترقی ادب کی نظامت کے دوران ان کی ایک مرتبہ کتاب "سرور سلطانی" پر میرا نام بحیثیت ناشر درج ہے۔ ان کے تنقیدی مضامین کا انداز عموماً تجزیاتی ہوتا ہے اور وہ اپنے موضوع کی گہرائیوں میں اتر کر سلاست اور روانی کے ساتھ' بھاری بھرکم اصطلاحات سے حتی الوسع دامن بچاتے ہوئے' قارئین کے ذہنوں کے بہت قریب چلے جاتے ہیں۔ افسانوں میں انہوں نے بیشتر ایسے کرداروں کی نفسیات پیش کی ہے' جنہیں فیشن ایبل افسانہ نگار چھوتے ہوئے بھی گھبراتے ہیں' کیونکہ وہ اپنی طبقاتی سطح سے نیچے اتر کر ان کرداروں سے متعارف ہونے کو اپنی ہتک سمجھتے ہیں۔ آغا سہیل ایسی کسی "انہیبشن" میں مبتلا نہیں ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان کے افسانے بیشتر ملک کی پچاسی فیصد (۸۵ فیصد) آبادی کے مسائل سے متعلق ہوتے ہیں۔

زبان پر ڈاکٹر آغا سہیل کو جو قدرت اور عبور حاصل ہے' اس کی بہت کم مثالیں ہمارے ہاں باقی ہیں۔ میں تو احباب سے کہا کرتا تھا کہ اگر دلی کے لہجے سے فیضیاب ہونا چاہتے ہو تو حکیم نبی خان جمال سویدا سے ملو اور اگر لکھنؤ کے رسیلے محاورے اور روزمرے سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہو' تو ایف سی کالج چلے جاؤ اور ڈاکٹر آغا سہیل سے دو چار باتیں کرلو۔ تمہیں نہ صرف لکھنؤ کے لہجے پر بلکہ پوری اردو زبان پر پیار آنے لگے گا۔

اب ہماری یہ محبوب شخصیت درس و تدریس کے فرائض سے فارغ ہو رہی ہے۔ مگر مجھے امید بلکہ یقین ہے کہ اب ڈاکٹر آغا سہیل کے افسانے' تنقید اور تحقیق کے نئے اور بھرپور دور کا آغاز ہو رہا ہے۔ میری دعا ہے کہ وہ آئندہ کئی برسوں تک صحت اور سلامتی کے ساتھ لکھتے پڑھتے اور نئی نسلوں کو پڑھاتے' سکھاتے رہیں۔

ڈاکٹر آغا سہیل، میرا دوست

شور صہبائی

یہ نصف صدی کا قصہ ہے دو چار برس کی بات نہیں

ڈاکٹر آغا سہیل کی شخصیت پر قلم اٹھاتے ہوئے میں کشمکش میں مبتلا ہوں۔ ہماری نصف صدی کی دوستی میرے قلم کے راستے میں ایک سوالیہ نشان بنی ہوئی ہے۔ میں محسوس کر رہا ہوں کہ جیسے حسن عابد نے مجھے سلطانی گواہ کی مانند عدالت میں لا کھڑا کیا ہے۔

"بولو جو کچھ کہو گے 'سچ کہو گے' سچ کے علاوہ کچھ نہیں کہو گے۔"

بہرحال یہ ایک روشن حقیقت ہے۔ سہیل میرا دوست ہی نہیں بلکہ ایک پیارا انسان بھی ہے۔ میں سہیل کو اس وقت سے جانتا ہوں' جب اس نے ادبی دنیا میں آنکھ کھولی تھی اور سہیل ادیب کے نام سے لکھنا شروع کیا تھا۔ (حسن عابد نے سہیل ادیب کو اس کے اپنے نام آغا سہیل میں تبدیل کر دیا۔) لیکن یہ ادب کا نونہال گھٹنوں نہیں چلا بلکہ اس نے پلک جھپکتے ہی قد نکال لیا اور آج اس کی قد آور شخصیت ہمارے سامنے ہے۔ میں اس وقت سہیل کے فن پر بات کرنا نہیں چاہتا۔ معتبر نقاد اس فرض کو انجام دیں گے۔ میں تو صرف اس کی شخصیت کے حوالے سے بات کرنا چاہتا ہوں۔

کل کے بادشاہ نواب کی ظاہری شخصیت کی اگر تصویر کشی کی جائے تو شاہان اودھ کے خدوخال نمایاں نظر آئیں گے۔ اس کا خمیر لکھنؤ کی مٹی کا مرہون منت ہے۔ نتیجتاً لکھنؤی تہذیب کا بانکپن اس کے تمدن کا ٹھہراؤ آغا سہیل کی شخصیت کا نمایاں جزو ہے۔ بادشاہ نواب ۶ جون ۱۹۳۳ء کو لکھنؤ کے محلہ منصور نگر میں پیدا ہوا۔ بادشاہ نواب کے جد اعلیٰ آغا محمد حسن اصفہان سے ہجرت کر کے لکھنؤ تشریف لائے اور مستقل طور پر لکھنؤ میں بود و باش اختیار کی۔ آغا محمد حسن کی شادی حضرت ناسخ کے شاگرد رشید اور حیدر بیگ خاں صاحب کے بیٹے جناب حسین علی خان کی پوتی امراؤ بیگم سے ہوئی اور یہ خاندان اودھ کی آغوش میں پروان چڑھا۔

بادشاہ نواب کی شادی عنفوان شباب میں حشمت آرا بیگم سے ہوئی۔ بھابی حشمت آراء کے جد امجد سلطنت اودھ کے وزیر اعلیٰ سعید الدولہ تھے۔ جن کی کربلا آج بھی وکٹوریہ گنج ہسپتال کے روبرو واقع ہے۔ ان کی پردادی نواب پتن صاحب تھیں' جن کا تعزیہ لکھنؤ میں کافی شہرت رکھتا تھا۔ انہی کے بزرگوں میں نواب غلام حسین خان صاحب کا نام لیا جاتا ہے۔ لکھنؤ کے معززین میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ پنڈت موتی لال نہرو کی ان سے دوستی تھی اور اس لئے جواہر لال نہرو ان کو چچا کہتے تھے۔ ان کی کوٹھی اب کوئین میری ہسپتال میں تبدیل ہو چکی ہے۔ عشرت بھائی کی ننھیال اور میری دادھیال کا مرکز ایک ہے۔ یعنی نواب مہدی قلی خاں' جو نواب واجد علی شاہ کے معتمد خاص تھے۔ اور جن کا تعلق شاہی خاندان سے تھا۔ خان کا لقب ان کو عطا ہوا تھا' جو آج تک نواب مہدی قلی خان کے خاندان کی پہچان بنا ہوا ہے۔ بادشاہ نواب اور عشرت بھائی کے خاندانوں کا اگر ہم سرسری جائزہ لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں خاندانوں کا تعلق اس وقت کے خوش حال اور معزز خاندانوں میں سے تھا۔ انقلاب زمانہ کی ستم ظریفی نے اودھ کا نقشہ ہی بدل دیا۔ شام اودھ' شام غریباں میں تبدیل ہو گئی۔ وقت نے کروٹ لی تو کچھ سے کچھ ہو گیا۔ جن گھروں میں عیش و طرب کے شادیانے بجا کرتے تھے' وہاں خاموشی چھا گئی۔ جن گھروں کے سامنے ہاتھی جھولتے تھے۔ وہاں دھول اڑنے لگی۔ تابناک ماضی حال کے اندھیروں میں سسکیاں لینے لگا۔

بادشاہ نواب نے جب ہوش سنبھالا تو چمکتے ہوئے ماضی کی چاشنی سے بھی اپنے آپ کو محروم پایا۔ زندگی کا آغاز تنگ حالی اور پریشانیوں کی آغوش میں ہوا۔ آغاز سفر ہی میں اس نے محسوس کیا کہ وہ اپنے موجودہ نام کے ساتھ زندہ نہیں رہ سکتا۔ بقول سہیل:۔

"پدرم سلطان بود"

لہٰذا اس نے باپ دادا کا رکھا ہوا نام تبدیل کر دیا اور وہ بادشاہ نواب کے بجائے آغا سہیل کے نام سے پہچانا جانے لگا۔ اس نے نئے نام کے ساتھ نئے سفر کا آغاز کیا۔ ہر لمحہ وقت کی بھیانک تصویریں اس کو ڈراتی رہیں' مگر اس نے ہمت کا دامن مضبوطی سے

پکڑے رکھا اور وقت کی ہر ستم ظریفی کو شکست دیتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ اس کے لئے تعلیم حاصل کرنا تو بڑی بات ہے' زندہ رہنے کے وسائل بڑے محدود تھے۔ اس نے علم کا سودا کیا۔ وہ تعلیم دیتا اور تعلیم حاصل کرتا تھا۔ اس طرح اس نے بی اے کیا۔ زمانہ تعلیم ہی میں اس کو لکھنے لکھانے کا شوق ہو گیا تھا۔ اسی رشتے سے ہم ایک دوسرے کے قریب ہوئے۔ ہماری دوستی کا پودا منٹوں اور سیکنڈوں میں تناور درخت میں تبدیل ہو گیا۔ یہ غالباً اس زمانے کی بات ہے' جب پروفیسر احتشام حسین صاحب کے ادب کدے پر انجمن ترقی پسند مصنفین کی نشستیں ہوا کرتی تھیں۔ لکھنے والے بڑی لگن کے ساتھ وہاں جایا کرتے تھے۔ میں اور سہیل پانچ میل کا سفر پیدل طے کر کے وہاں پہنچتے تھے۔ ظاہر ہے ہم دونوں کی جیب میں یکے یا تانگے کا کرایہ نہیں ہوا کرتا تھا۔ سہیل کے لئے تو یہ فاصلہ تقریباً دوگنا ہو جاتا تھا' کیونکہ اس زمانے میں وہ محلہ منصور نگر سے محلہ حسین آباد میں منتقل ہو چکا تھا اور میں شیعہ یتیم خانہ کے سامنے کاظمین روڈ پر رہا کرتا تھا۔ جہاں سے حسین آباد کا فاصلہ تقریباً چھ سات میل تو ہو گا۔ وہ ہمیشہ حسین آباد سے پیدل چل کر کاظمین روڈ آیا کرتا تھا۔ اکثر سوچ کر مجھے تھکن کا احساس ہوتا' لیکن وہ بندہ خدا ہمیشہ مسکراتا ہوا نظر آتا۔ میرے پاس طویل سفر پیدل طے کر کے آنا' ایک ایسی ادا تھی' جس کو نصف صدی تک میں فراموش نہیں کر پایا اور ایسی ہی نہ معلوم کتنی پر خلوص اداؤں نے مجھے تیزی سے سہیل کے قریب کر دیا۔ یہ میری افسانہ نگاری کا ابتدائی اور فعال دور تھا۔ جب میں بہت زیادہ لکھ رہا تھا اور چھپ رہا تھا۔ اس زمانے میں اکثر ہماری کہانیاں رسائل میں ساتھ ساتھ شائع ہوتیں۔ ہم گھنٹوں ان پر تبادلہ خیال کیا کرتے۔ ہماری لکھنے کی عمر تقریباً ایک ہی ہے۔ اتفاق سے میرے ابتدائی تو افسانوں کا مجموعہ "کانٹوں" کے نام سے لکھنؤ کے ایک پبلشر "بھارتی اودوگ مندر" نے شائع کیا تو سہیل بہت خوش ہوا اور میری پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے بولا:-

"مبارک ہو' تم تو اب سکہ بند افسانہ نگار بن گئے"

اس نے اپنی خوشی کا اس انداز سے اظہار کیا' جیسے اس کو کوئی خزانہ مل گیا ہو۔ ایک لمحے کے لئے بھی اس نے اپنی کہانیوں کے بارے میں نہیں سوچا۔ دوستوں کی ہمت

افزائی اس وقت بھی اس کا شیوہ تھا' اور آج بھی یہ ادا قائم ہے۔

گردش زمانہ نے ہم کو ایک دوسرے سے دور کر دیا۔ میں لکھنؤ سے بمبئی چلا گیا اور فلمی زندگی جب راس نہ آئی تو ہجرت کر کے مشرقی پاکستان چلا گیا۔ چٹاگانگ میں کچھ عرصہ رہنے کے بعد کراچی آ گیا' سہیل لکھنؤ میں ہی تھا۔ میرے کراچی آنے کے چند سال بعد سہیل نے لاہور کا رخ کیا۔ اپنی ملازمت کا آغاز ایف سی کالج سے کیا اور تقریباً" تیس سال سے وہ ایف سی کالج سے وابستہ ہے اور اب شعبہ اردو کا انچارج ہے۔ اسے کراچی لانے کی اکثر کوشش کی گئی مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔ شاید کراچی کے بجائے اس نے لاہور کا انتخاب اس لئے کیا کہ لکھنؤ اور لاہور جڑواں شہر لگتے ہیں۔ لاہور کے گلی کوچوں میں گھومتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم لکھنؤ میں ہیں۔ لکھنؤ کی طرح لاہور نے بھی ادب کی نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔

لاہور میں جہاں بہت سے مقامات پر کشش ہیں۔ وہاں ۲۳ ایف سی کالج ایک خاص کشش کا حامل ہے۔ لاہور سے گزرنے والے ادب کے سیاح ۲۳ ایف سی کالج میں ضرور نظر آتے ہیں۔ پشاور سے لاہور آنے والے کراچی سے لاہور جانے والے قلمکار اور ہندوستان سے آنے والے ادیب و شاعر سہیل کے مہمان ضرور رہتے ہیں۔ میں ۲۳ ایف سی کالج کو سہیل کی کڑکی کہتا ہوں۔ مجھے اپنے بچپن کا ایک کھیل آج بھی اچھی طرح یاد ہے۔ باورچی خانے سے کوئی پرانی روٹی رکھنے کی ٹوکری لے لیتا تھا اور صحن میں ایک لکڑی کے سہارے اس کو ٹکا دیتا تھا' اور پھر لکڑی میں ڈوری باندھ کر ایک ہوشیار شکاری کی مانند دور بیٹھ جاتا تھا۔ ٹوکری کے نیچے روٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ڈال دیا کرتا تھا۔ جیسے ہی کوئی چڑیا ٹوکری کے نیچے آئی اور میں نے تیزی سے ڈوری کھینچ لی۔ گھنٹوں یہ مشغلہ رہتا تھا' مگر کوئی چڑیا کبھی بھی میرے ہاتھ نہیں آئی۔ وہ کمال ہوشیاری سے اڑ جایا کرتی تھی' لیکن سہیل کی لگائی ہوئی کڑکی سے کوئی بچ نہیں پاتا۔ مثال کے طور پر اپنا واقعہ سناتا ہوں۔ صدر ایوب خان کے چل چلاؤ کا زمانہ تھا۔ طویل عرصے کی گھٹن کے بعد عوام اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ کراچی میں ایوب خاں کو کرسی سے نیچے لانے کی تحریک زور پکڑ رہی تھی۔ کراچی جل رہا

تھا۔ مسلسل کرفیو سے تحریک کو دبانے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ مجھے لاہور ایک کانفرنس میں سندھ کی نمائندگی کرنا تھی۔ پورے پاکستان سے مندوبین بلائے گئے تھے۔ غرض کہ لاہور پہنچا تو کرفیو نے ہمارا خیر مقدم کیا۔ اسی دن وہاں بھی کرفیو لگ گیا۔ بمشکل لاہور ہوٹل پہنچا' جہاں ہمارے ٹھہرنے کا انتظام کیا گیا تھا۔ ظاہر ہے کرفیو کی وجہ سے کانفرنس ہونے کے امکانات تو کم ہی نظر آ رہے تھے۔ میں نے فوراً ہی فون کے ذریعہ سیسل کو اپنی لاہور آمد کی اطلاع دی۔ کرفیو کی وجہ سے میرا ایف سی کالج جانا ممکن نہیں تھا۔ موجودہ صورت حال سے سب پریشان تھے۔ حکومت کی نظر بھی ہمارے اوپر تھی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ہم لال قلعے میں قید کر دیئے گئے ہیں۔ فضا مکدر تھی۔ رات گیارہ بجے ایک ایس آئی مجھے تلاش کرتا ہوا ہوٹل میں داخل ہوا۔ میرے ساتھی یہ سمجھے کہ میری گرفتاری کا پروانہ آ گیا۔ لہٰذا میرے ساتھیوں میں سے جس کسی سے بھی وہ ٹکرایا اس نے میرے متعلق لاعلمی کا اظہار کیا۔ مجھے تلاش کرتا ہوا جب وہ ایس آئی ڈائننگ ہال میں پہنچا تو میں کھانا کھا رہا تھا۔ موصوف نے مجھ سے ہی میرے بارے میں دریافت کیا تو میں نے شور صہبائی ہونے کا اقرار کر لیا۔ وہ مجھے لینے کی غرض سے آیا تھا۔ میں کھانے سے فارغ ہو کر اپنے ساتھیوں سے رخصت ہوا اور پولیس وین میں بیٹھ گیا۔ اس وقت میری حیرت کی انتہا نہیں رہی' جب میں نے پولیس اسٹیشن کے بجائے اپنے آپ کو ۲۳ ایف سی کالج کے سامنے پایا۔ سیسل میرے انتظار میں ورانڈے میں ٹہل رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے سینے سے چمٹا لیا اور بولا:

"کیوں میاں مجھ سے بچ کر نکلنے کی سوچ رہے تھے' آخر میں نے گرفتار کرا لیا۔"

ظاہر ہے اس کی "کڑی" اپنا کام دکھا چکی تھی۔ عشرت بھابی اور بچے بھی بھاگے بھاگے آ گئے سب ہی میرے انتظار میں جاگ رہے تھے۔ یہ اس کی کڑی کے دوسرے کردار تھے' جو اپنے فرائض سے بخوبی واقف تھے۔ لہٰذا اسی وقت سے عشرت بھابی مصروف ہو گئیں۔ فوراً ہی گرم گرم کافی لے کر آ گئیں۔ میں شروع دن سے دیکھ رہا ہوں کہ عشرت بھابی کا زیادہ وقت باورچی خانہ میں گزرا ہے۔ وہ اپنے گھر آئے ہوئے مہمانوں کو اپنی باتوں

کی سویٹ ڈش کے علاوہ طرح طرح کے کھانے کھلایا کرتی ہیں۔ وہ مہمانوں کی خاطر تواضع بڑے شوق سے کرتی ہیں اور جب مہمان رخصت ہوتا ہے تو دونوں میاں بیوی شرمندہ شرمندہ نظر آتے ہیں' جیسے وہ حسب خواہش مہمان نوازی نہیں کر سکے۔ تماشا یہ ہے کہ خود موصوف کو آپ ایک پیالی چائے پلا کر دیکھ لیجئے۔ وہ گھنٹوں اس چائے کا قصیدہ پڑھے گا۔ وہ اس چائے کے کپ کو آسمان سے اترا ہوا من و سلویٰ گردانے گا۔ وہ لفظوں کے استعمال میں محتاط نہیں ہے' بیان میں اتنے زیادہ خوبصورت الفاظ کی سجاوٹ ہوتی ہے کہ مخاطب کو کبھی کبھی اس دوری کا احساس ہونے لگتا ہے۔ شاید وہ داستان سے زیادہ زیب داستان کا شوقین ہے۔ وہ دوسروں کی خوشنودی کی خاطر اتنا آگے چلا جاتا ہے کہ مبالغہ اور خانہ پری حقیقت کے پیرہن کو چاٹ جاتی ہے۔ سہیل کی یہ بات مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ کبھی کبھی میں بے تکان سناتا ہوں' لیکن جواب میں وہ ہمیشہ مسکرا دیتا ہے:۔

"ہاں' ہاں کہہ لو خوب دل کی بھڑاس نکال لو یہی سہیل ادب کے میدان میں بڑا محتاط ہے۔ اس کی مثال بھی اپنی ذات کے حوالے سے دیتا چلوں۔ "رشک بہاراں" شائع ہونے کے تقریباً دس سال بعد میں نے ایک ناول لکھا' جو بنیاد پرستی میں ترقی پسندی کی چاشنی پیدا کرنے کی ناکام کوشش تھی۔ میں اپنی تحریک سے خود مطمئن نہیں تھا۔ سوچا ڈاکٹر صاحب کو نبض دکھائی جائے' چنانچہ مسودہ سہیل کو روانہ کر دیا۔ بعد میں مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ سوچا حسب عادت عنقریب ناول کی تعریف میں' مقدمے کی صورت میں اس کا نثری قصیدہ آ جائے گا اور میں صائب رائے سے محروم رہوں گا۔ لیکن اس نے مجھے چونکا دیا۔ چھ ماہ بعد مسودہ آیا تو اس کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں لکھا تھا۔ خط میں صرف تحریر تھا:۔

"پیارے مرزا صاحب کے ذریعہ مسودہ واپس کر رہا ہوں' ملنے پر اطلاع دینا۔"

مسودہ کے بارے میں خاموشی اس کی رائے تھی۔ جو شخص دوستی میں اتنا فضول خرچ ہے' وہ ادب میں اتنا کنجوس ہے' میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

میں تو واقعات کی کرنیں اس کے چہرے پر ڈال رہا ہوں' تاکہ اس کی روشنی

میں آپ سہیل کو دیکھ سکیں۔ چند سال قبل کی بات ہے کہ وہ کراچی آیا اور پیارے مرزا صاحب کے گھر کا رخ کیا' کراچی میں ہمیشہ سہیل کا قیام پیارے مرزا صاحب کے گھر ہوتا ہے۔ پیارے مرزا سہیل کو بہت پیارے ہیں کیونکہ وہ عشرت بھائی کے حقیقی چھوٹے بھائی ہیں اور صرف نام کے ہی پیارے نہیں ہیں بلکہ پیاراپن ان کی شخصیت کا جزو ہے' کیا کیا جائے کہ سہیل کے اکثر دوست رقابت کے شکار ہیں۔ پروفیسر پیارے مرزا صاحب کے گھر سہیل کا مہمان رہنا اکثر دوستوں کو ایک آنکھ نہیں بھاتا' لیکن آندھی آئے یا طوفان' سہیل میاں ٹھہریں گے تو پیارے مرزا صاحب کے دولت کدے پر۔ ایسی صورت میں اس کا ایک رات میرے گھر ٹھہرنا معجزے سے کم نہیں ہے۔ غرض کہ سہیل چند دوستوں کے ہمراہ میرے گھر آگئے۔ رات کے کھانے تک غپ شپ رہی۔ رات کے کھانے کے بعد محمد علی صدیقی صاحب شاہد لکھنوی صاحب' راحت سعید اور حسن عابد رخصت ہو گئے۔ ہم میں سے کسی نے کھانے کے متعلق سوچا بھی نہیں مگر سہیل تقریباً آدھے گھنٹے کھانے کی تعریف اور پکانے والوں کی زحمت پر لیکچر دیتے رہے۔ میں نے کئی مرتبہ موضوع تبدیل کیا' مگر وہ کہاں خاموش ہونے والے۔ ایک وقت کھانا کھایا تھا۔ یہ کوئی معمولی بات تھوڑے ہی تھی۔ جب رات کے تقریباً گیارہ بج گئے تو میں سہیل کو ورانڈے سے لے کر کمرے میں آگیا۔ کچھ دیر میری بیوی عابدہ اور بچوں سے بات ہوتی رہی اور پھر سونے کا پروگرام بنا۔ کیونکہ صبح کی فلائٹ سے اس کو واپس لاہور جانا تھا۔ صبح جیسے ہی میری آنکھ کھلی سہیل بھی انگڑائی لیتے ہوئے بستر پر بیٹھ گئے اور آنکھیں ملتے ہوئے کہا:۔

"شورا ایک گلاس پانی تو منگوانا۔"

"خیریت"

"بھئی رات سے پیاسا ہوں' گھر کا کونا کونا چھان مارا' کہیں پانی نہیں ملا۔"

ایک چھناکا ہوا اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے ان گنت گلاسوں کے شیشے ٹوٹ کر میرے سارے جسم میں پیوست ہو گئے۔ غصہ تو بہت آیا۔ یہ ہے ایک بے تکلف دوستی کا کردار۔ مگر اس سے قبل کہ میرے اوپر کوئی رد عمل ہو' وہ بھانپ گیا اور مسکراتے ہوئے

میری پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے بولا:۔

"چلو پانی نہیں تو کوئی بات نہیں' گرم گرم چائے ہی منگوا دو' دراصل رات بھابی نے اتنے مزے مزے کے کھانے تیار کئے تھے' پیٹ سے بہت زیادہ کھا گیا' کمبخت رات پانی پیتے گزری۔"

وہ تو لفظوں کا بے تاج بادشاہ ہے' حقیقت تو صرف اتنی تھی کہ اس نے کسی کو نیند سے بیدار کرنا مناسب نہیں سمجھا اور تمام رات شدید گرمی میں پیاسا رہا۔ چار سال قبل میں نے اپنی بڑی بیٹی ادیبہ کی شادی کی تاریخ نکاح سے چھ ماہ قبل سہیل کو پروگرام کی اطلاع دی۔ جواب میں اس نے لکھا کہ وہ شادی میں مع بھابی اور بچوں کے شرکت کرے گا وہ اس چھ ماہ کے عرصے میں کئی مرتبہ اپنے کراچی آنے کے بارے میں لکھتا رہا۔ مجھے بھی سہیل کے آنے کا یقین ہو گیا' لیکن نکاح سے ایک دن قبل کوریر سے اس کا ایک لفافہ ملا۔ معذرت نامہ تھا اور گھر کے بچے بچے کے نام سے ادیبہ کے شوہر کی سلامی کے بینک ڈرافٹ تھے۔ میں بہت دیر تک سوچتا رہا یہ کونسی ادا ہے۔ دل میں کہا' سہیل کو سمجھنا میرے لئے ایک مسئلہ ہے۔ وہ کونسی حرکت کس جذبے کے تحت کرتا ہے۔ یہ سمجھنا بھی کبھی میرے لئے بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ میں تو اکثر اس کی ڈرامائی سوچ سے ہکا بکا رہ جاتا ہوں۔

ایک مرتبہ میں اپنے کسی دفتری کام سے لاہور گیا اور ہمیشہ کی طرح سہیل کے گھر ٹھہرا۔ اس کی "کٹزی" اتنی کرشمہ ساز تھی کہ لاہور میں کسی دوسری جگہ ٹھہرنا میرے لئے ممکن نہیں تھا۔ بہرحال ایک دن سہیل کے بڑے بیٹے محسن سہیل نے کہا:۔

"چچا آج رات کا کھانا آپ ہمارے ساتھ کھائیں گے۔"

"بھئی یہ کونسی بات ہوئی' ہم تو روز تمہارے ہی ساتھ کھاتے ہیں۔"

"میں پاپا اور امی کی بات نہیں کر رہا ہوں' روز تو آپ ان کے ساتھ کھانا کھاتے ہیں۔ میرے اچھے چچا آج میری خوشی کی خاطر میرے ساتھ چائنیز میں رات کا کھانا کھالیں۔"

محسن میاں نے کچھ اس انداز میں کہا کہ میں اس کی بات ٹال نہیں سکا۔ محسن

میاں کے ساتھ ہوٹل چلتے وقت میں نے سہیل سے ہمراہ چلنے کو کہا تو وہ بولا:۔

"میاں بن بلائے تو خدا کے یہاں بھی نہیں جاؤں گا' دعوت صرف چچا کو دی گئی ہے' لہٰذا تم جاؤ۔"

اور میرے ہمراہ وہ نہیں گیا۔ میں اور محسن چلے گئے' واپس آیا تو سہیل' بھابی اور بچے گھر میں موجود نہیں تھے۔ کچھ دیر بعد سہیل اور بچے بھی آ گئے۔ سہیل میری طرف دیکھتے ہوئے مسکرایا:۔

"میاں کہاں چلے گئے تھے' ہم تو لاہور کے تمام ہوٹلوں کا چکر لگا کر آ رہے ہیں۔"

اس وقت تو میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ حقیقت کیا ہے۔ بعد میں معلوم ہوا' اس رات سہیل کی مع اہل خانہ کے کہیں دعوت تھی' جس کا اس نے مجھے کانوں کان علم نہیں ہونے دیا اور وہ اپنے ڈرامے میں کامیاب ہو گیا۔

یہ کہتے ہوئے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتا یا تو سہیل کی شخصیت اتنی خوبیوں کا مرقع ہے کہ قریب سے گزرنے والا اسی کی دوستی کا کلمہ پڑھنے لگتا ہے یا پھر وہ اپنے نزدیک آنے والے کے کان میں آہستہ سے اپنے ڈرامائی انداز میں کہہ دیتا ہے:۔

"میں صرف تمہارا ہی دوست ہوں۔"

یہ بات آج تک اس نے کسی بنت حوا سے نہیں کہی۔ جہاں تک میں جانتا ہوں' عشرت بھابی ہی اس کی پہلی اور آخری محبت ہیں۔ میں نے آج تک اس کی محبت کی کوئی داستان نہیں سنی۔ یہ بات میں عشرت بھابی کے خوف سے نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ یہ حقیقت ہے۔ میں اس کی زندگی کے اس راز سے واقف نہیں ورنہ اس کا ذکر برملا کرتا۔ سہیل سے انتقام لینے کا بھلا اس سے مناسب وقت اور کونسا ہو سکتا ہے۔ میرا اس پر ایک قرض ہے یہ قرض اس وقت کا ہے جب میں اپنی شادی کے فوراً بعد عابدہ کے ہمراہ لاہور گیا اور تقریباً ہفتہ دس دن سہیل کے گھر قیام کیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے' سہیل نے اپنی تمام تر مصروفیات میرے لاہور پہنچنے کے بعد بالائے طاق رکھ دیں۔ حد یہ ہے کہ ایف سی کالج سے بھی ایک

ہفتے کی رخصت لے لی اور پھر لاہور کا کونا کونا ہم کو گھمانے میں لگ گیا۔ گھومنا اور باتیں کرنا ہمارے پاس صرف دو ہی کام تھے۔ عابدہ سہیل سے مل کر بہت خوش ہوئیں اور سہیل کے بارے میں اپنی رائے اس انداز میں دی:۔

"سہیل بھائی تو آپ کے بہت پیارے دوست ہیں' سچ جانئے مجھے بہت اچھے لگے۔"

میں نے بھی فخر سے سربلند کر لیا' میری بیوی کو میرا دوست اچھا تو لگا۔ اتفاق سے اسی دن سہیل نے اپنی اداکاری کا جوہر دکھایا۔ عابدہ کو وہ شیشے میں اتار ہی چکا تھا' ایک ہفتے میں اس نے عابدہ کے ذہن کا مطالعہ بھی کر لیا تھا۔ وہ اچھی طرح سمجھ چکا تھا کہ عابدہ کو کسی بھی بات کا یقین دلانا بہت آسان ہے۔ لہٰذا اس کا تیر نشانے پر بیٹھا۔ وہ عابدہ کو یقین دلانے میں آسانی سے کامیاب ہو گیا کہ میں کسی زبیدہ کے عشق میں گرفتار ہوں۔ اکثر زبیدہ سے ملنے لاہور آتا رہتا ہوں اور اس مرتبہ بھی آنے کا مقصد زبیدہ سے ملاقات ہے۔ اور بس' سہیل نے اس خوبی کے ساتھ اداکاری کی کہ آج تک کوشش کے باوجود زبیدہ مری نہیں ہے۔ بلکہ عابدہ کے دماغ کے کسی کونے میں دبکی بیٹھی ہے۔

احمد جمال پاشا مرحوم اپنے انتقال سے ایک سال قبل کراچی آئے۔ حسن عابد کے گھر ملاقات ہوئی تو بے ساختہ اس کے لبوں کو حرکت ہوئی:۔

"آؤ بھئی آؤ مرحوم شور صہبائی' میں تو عرصہ ہوا تمہاری فاتحہ دلا چکا تھا۔"

اور یہ حقیقت ہے' عرصے سے میں کچھ نہیں لکھ رہا ہوں۔ میں نے شور صہبائی کو مکان کے گیٹ پر لگی ہوئی نام کی تختی کے نیچے دفن کر دیا ہے۔ لیکن سہیل مجھے زندہ کرنے کی جستجو میں لگا رہتا ہے۔ اس کو میری ادبی موت پر رنج ہے' جس کا اظہار اس نے اپنے دوسرے افسانوں کے مجموعے "شہر نا پرساں" کے پیش لفظ میں کیا:۔

"شور صہبائی میرا پرانا دوست ہے اور مجھ سے پہلے سے اس صنف نثر کی کوچہ گردی کر رہا ہے۔ ۱۹۴۷ء میں اس کے افسانوں کا ایک مجموعہ "کانٹے" چھپا تھا' پھر آج تک دس دس' پانچ پانچ سال کے وقفوں سے اس کے افسانے چھپتے رہے۔ بیشتر قارئین افسانہ

اس کا نام تک فراموش کر چکے ہیں' لیکن میں اپنے اس دوسرے مجموعے کو اپنے اس دیرینہ ہم سفر کے نام معنون کرنے کی عزت حاصل کر رہا ہوں' جس نے میرے ساتھ اس کوچے کے بہت سے ہفت خوان طے کئے اور آج اردو افسانے کا ایک گمنام اہرام بنا بیٹھا ہے' جو نہ منہ سے بولتا ہے اور نہ سر سے کھیلتا ہے۔"

جب بھی ملاقات ہوتی ہے' وہ میرے ہاتھ میں قلم دیکھنے کی خواہش کرتا ہے۔ آج میں نے قلم اٹھایا تو ہے مگر معلوم نہیں وہ اس پر خوشی محسوس کرے گا یا...

سہیل کی ذات تین حصوں میں تقسیم ہے گھر' دوست اور ادب' ہر جگہ آپ اس کو کامیاب پائیں گے۔ اس نے اپنی زندگی کو سنوارنے میں ہی سعی مسلسل نہیں کی' بلکہ اپنی پھلواری کے ہر پودے کی تراش خراش میں بھی وہ اپنی پوری توانائی بروئے کار لایا۔ اس کی آبیاری میں اپنا خون دیا۔ اس نے ایک کامیاب مالی کی طرح دن رات محنت کی۔ آج جب وہ شاداب مسکراتے ہوئے غنچوں کے درمیان نظر آتا ہے' تو مجھے اس کے ماضی کی ایک ایک قربانی یاد آتی ہے۔ اس سلسلے میں عشرت بھابی کا کردار بھی بہت اہمیت رکھتا ہے۔ میرے خیال میں ان کے بغیر سہیل کا خواب کبھی شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکتا تھا۔ انہوں نے سہیل کو کبھی مایوس نہیں کیا۔ قدم سے قدم ملا کر زندگی کی پرخار وادی میں آگے کی جانب بڑھتی رہیں۔ بچوں کی تربیت میں بھی جہاں سہیل کی مسلسل جدوجہد کو دخل ہے۔ وہاں عشرت بھابی کا بھی بہت بڑا ہاتھ ہے۔ آج ان کے تمام بچے زیور تعلیم سے آراستہ ہیں۔

میں نے جیسا کہا کہ سہیل ایک اچھا مالی اور ایک کامیاب کسان ہے۔ زرخیز زمین ہو یا بنجر' وہ اچھی فصل اگانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ وہ بڑھاپے کی طرف گامزن ہے مگر اس کی انگلیوں کی توانائی میں جوانی کا سا دم خم ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وقت اس کے آگے سر جھکائے کھڑا ہے۔ نہ معلوم کیونکر سارے کام ایک ساتھ خوش اسلوبی سے انجام دیتا ہے۔ اس کے کمرے میں ہر طرف آپ کو کتابیں نظر آئیں گی' جن کی کوئی ترتیب نہیں ہے۔ ان کے رکھنے میں کسی سلیقے کو دخل نہیں ہے۔ انہی کتابوں کے درمیان ایک بستر پر سہیل بھی نظر آئے گا۔

ادب نے ڈاکٹر آغا سہیل کو اور سہیل نے ادب کو کیا دیا۔ اس کا فیصلہ کرنے کا اپنے آپ کو اہل نہیں پاتا۔ یہ فیصلہ تو کل کا نقادی کر سکتا ہے۔ میں تو درحقیقت سہیل کی شخصیت پر لکھنے کے لئے اپنے بچھڑے ہوئے ماضی کو تلاش کر رہا تھا' جس کے نقوش اتنے دھندلے ہو گئے ہیں کہ میں اپنے آپ کو بھی پانے میں ناکام ہوں۔ پھر سہیل کو کیونکر دریافت کروں۔ میں نصف صدی کی روشنی میں سہیل کی شخصیت کو پیش کرنے بیٹھا تھا۔ مگر میرے ذہن نے میرا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔

خاتمة

❁ خاکے

آغا سہیل --- پورٹریٹ

احمد جمال پاشا

آغا سہیل پہلے بڑے سرخ و سپید' ایرانی حسن و جمال کے مالک تھے۔ انتہائی دھان پان' پُراسرار سیاہ عینک لگاتے' چیخ چیخ کر ناک میں بولتے اور اچھل کر بات بات پر ہاتھ ملاتے۔ یہ ذکر غالب کی جوانی اور ہمارے بچپن کا ہے۔ ان کے سکندر اعظم فرخ نواب عرف نواب چھنو یعنی کاظم علی خان کا سسرال اور ہمارے گھر کے درمیان فقط ایک دیوار کا پردہ ہے۔ آغا صاحب کی نہ سہی' ان کی ہمشیرہ محترمہ کی سسرال بھی اسی جغرافیے میں شامل ہے۔ نواب چھنو پریوں کی کہانیوں والے روایتی دیو کی طرح اکثر چیختے چلاتے نازل ہوتے۔ ایک دن انھوں نے باہر سے نعرہ لگایا۔

"اماں! زندہ ہو؟ بھائی دیکھو تو کسے ملانے لائے ہیں؟"

اس زمانے میں یہ حضرت دیو سے زیادہ معشوق لگتے' ہرچند کہ سوٹ اور فلیٹ ہیٹ میں پاسنگل شو کا' کارٹون بنے رہتے اور اپنی ہونے والی سسرال کے چکر کاٹنے کے بہانے ڈھونڈنے میں ان کی ایک پناہ گاہ خانہ انوری بھی تھی۔ نواب چھنو کی آواز سنتے ہی ہم کھٹ سے برآمد ہوئے تو یہ مارے خوشی کے چلائے:۔

"صفدر حسین صاحب کے یہاں مجلس میں بادشاہ نواب بھی آگئے' سوچا کہ تم سے بھی ملوا دوں۔ بیٹا ان کے سامنے ذرا سنبھل کر بولنا۔ رکاب گنج پار کے ہو نا؟ ابھی تمھاری زبان پکڑلیں گے۔ بہت ہی بڑے ادیب اور افسانہ نگار ہیں۔ یہی آغا سہیل ہیں۔"

ان سے نہایت تپاک سے مصافحہ کرتے ہوئے دریافت کیا:۔

"آغا حشر آپ کے.....؟"

"جی ہاں! جی ہاں! میرا ہی شاگرد ہے نالائق۔" ہم فوراً آدھونس کھا گئے۔ فرخ ہم دونوں کو مجلس میں لے گئے۔ پھر دیر تک کھسر پھسر کرتے رہے۔ اس کے بعد ادبی نشستوں میں سرور صاحب اور احتشام صاحب کے یہاں ملاقاتیں ہونے لگیں۔

بادشاہ نواب کی نوابی کا حال آگے آئے گا۔ یہ حضرت پہلے کسی سرکاری دفتر میں ملازم ہوئے' کسی افسر سے کہا سنی ہو گئی۔ آغا کا جلال' کرسی اٹھا کر اسی کے سر پر دے ماری (کیونکہ ان سے میز نہ اٹھ سکی) پھر دوسری چیز جو اس کے سر پر ماری' وہ ان کا استعفیٰ تھا۔ "کاظمین" میں بچوں کو پڑھانے لگے' پھر "شیعہ اسکول" میں۔ اس زمانے میں ان کے جگری دوستوں میں فرخ نواب' ہز ہولی نس مولانا محمد طاہر جرولی' مولانا حافظ علی صابر اور ان کے مفتی گنج کے پڑوسی مولانا سید علی ظہیر ہوا کرتے تھے اور یہ خود' مولوی' ترقی پسند اور ادیب کا معجون مرکب تھے۔

قبلہ سید سعید الملت مجتہد کے یہاں ہمارے نواب صاحب نے ایک "بزم انیس" بھی قائم کی' جس میں ہمارے دوست سید ضیاء الحسن موسوی کو استقبال بھی پیش کیا گیا تھا۔ "بزم انیس" میں خالص ایرانی تہذیب برتی جاتی۔ قہوے سے تواضع ہوتی۔ ہمیں بھی یہ اس کی نشستوں میں لے گئے۔ پہلے یہ "انجمن ترقی پسند مصنفین" کے جلسوں کی رپورٹ تیار کرنے میں مدد کرتے' پھر یہ خود رپورٹ تیار کرنے اور بحیثیت سیکرٹری کے سنانے لگے۔

یہ زمانہ بادشاہ نواب کی مالی اور ذہنی پریشانیوں کا تھا۔ کثیر العیال تھے۔ اکثر احاطہ مرزا علی خاں میں واقع ان کی حویلی پر ہم بھی حاضری دیتے۔ حویلی کا معاملہ یہ تھا کہ ہاتھی گزر چکا تھا صرف اس کی دم رہ گئی تھی' جو نوابی کا نوحہ تھی۔ یہ محبت کے تو بہت ہیں مگر خودداریوں کے دور میں بڑی ناک والے ہوا کرتے تھے۔ ضرورت سے زیادہ خود اعتماد ایک بات پر بلا تحقیق ہم سے بھی چڑ گئے۔

ہوا یوں کہ ہمارے عزیز دوست مرزا اسلام بیگ چنگیزی یادگار استاد رفیع احمد خاں اپنے ایک عزیز رضوان کو ہمارے حوالے کر گئے کہ اسے پڑھنے کا شوق ہے۔ یہ میرے

ہم جماعت بھی تھے۔ رضوان حسین نے شاہد صدی کو ایک دن صبح ناشتے پر بلایا۔ اس پر تکلف ناشتے میں گرما گرم جلیبیاں بھی شامل تھیں۔ بھئی پیسے کا کوئی ذکر نہیں مگر ناشتہ تو اسی کا تھا۔ اس دوران غضب یہ ہوا کہ بادشاہ نواب نے آواز دی' میں نے بہت زور دیا کہ:۔

"انہیں اوپر بلالوں۔"

مگر رضوان نہ مانا اور کہنے لگا:۔

"نیچے بٹھالو......!"

یہ کڑوا کریلا یوں نیم چڑھا کہ ٹھن گئے۔ توس' انڈے' چائے اور گرما گرم جلیبیاں حضور نواب صاحب کے سامنے سے گزریں۔ ناشتے کے بعد ہم لوگ ہنستے ہوئے برآمد ہوئے۔ سلام دعا ہوئی۔ یہ حضرت ہم سے کچھ کھنچے کھنچے اور بجھے بجھے سے تھے۔ شاہد صدی ملنے کی چیز تھے۔ آئی اے ایس میں تو وہ بعد میں آئے مگر اس وقت بھی کسی طرح وار سے کم نہ تھے۔ یہ ان سے بھی بڑی رکھائی سے ملے۔ بات یہ تھی کہ رضوان کھاتا بہت تھا۔ اس زمانے میں کھانا اس کی کمزوری تھی۔ ناشتے پر ہم دونوں نے برائے نام کھایا۔ نواب کو شامل نہ کرنے کی وجہ سے میرا موڈ بگڑا ہوا تھا۔ شاہد بھی رضوان کو کھلا رہے تھے۔ خود باتیں زیادہ کر رہے تھے۔ مگر یہ غصہ اس بات پر تھا کہ:۔

"تم دونوں سب کھا گئے اور وہ بھوکا رہ گیا۔"

غرض نواب صاحب کے جذبات کو ٹھیس پہنچ چکی تھی۔ ان حضرات کا خیال تھا کہ:۔

"مجھے محض غریب سمجھ کر ناشتے میں شامل نہیں کیا گیا۔"

میں بھی نواب کے تیور بھانپ گیا۔

ہر چند کہ قسمت ہم دونوں پر مسکرا رہی تھی کہ نواب تم سے کتنا آگے نکل جائے گا' چنانچہ اب ان کی باری تھی۔ تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ اس تاریخی ناشتے کے بعد' جس میں یہ ناحد عو تھے' ادبی نشستوں میں ملاقات کا وہ انداز تھا' جس میں خلا سا محسوس ہوتا۔ اٹھتے بیٹھتے گرما گرم جلیبیوں کا طعنہ اور ہر بار ہمارا بیان صفائی بدتر از گناہ بن کر ہمیں پسپا کر

دیتا۔ یہ عجب قدرت کا نظام ہے کہ مستقبل کے بڑے لوگ کھانے کے لئے لڑتے ہیں۔ افواہ ہے کہ لطیف صدیقی کو جب عابد سہیل نے ان کی من پسند شے نہیں کھلائی تو باوجود عابد کے منانے کے عابد و رند کے اس جوڑے میں پھر نہ پٹ سکی۔ یہاں تک کہ دونوں نے مشترکہ افواہ بازی جیسے مفید مشغلے تک سے کنارہ کر لیا۔ ہرچند کہ بالائی کا کوئی ذکر نہیں مگر گرما گرم جلیبیوں کے لئے سند ضرور بن گئی۔

ہمارا ہیرو ناپ کر کے غربت اور بے سروسامانی میں جب ہجرت کرنے لگا تو بے بسی میں ایک ایک عزیز' دوست اور قرض خواہ سے لپٹ لپٹ کر رویا' مگر ہمارے پاس اس لئے نہ آیا کہ جلیبیوں کی خلیج اس قدر گرم ہو چکی تھی کہ اسے وہ پار نہ کر سکتا تھا۔ بقول ملا نصیرالدین کے:۔

"اگر ولی کے بلانے سے کوئی اس کے پاس نہ جائے تو ولی خود اس کے پاس چلا جائے۔"

چنانچہ ہم خود روتے پہنچے پہنچے۔ انہوں نے گلے تو نہ لگایا مگر رومال سے اس طرح ہمارے آنسو پونچھے گویا شیرہ نکال رہے ہوں۔ یہ رخصت ہو گئے' کیا ان کا اسباب بے سروسامانی تھا۔ رخت سفر میں سوائے عزم کے کچھ نہ تھا۔ سو ان کے "فتراک" سے بندھا تھا۔ پشاور بے ٹکٹ پہنچے اور پھر چندے سے ٹکٹ خرید کر لاہور کا رخ کیا۔ ایف سی کالج میں آسامی تھی۔ امیدواروں میں انتظار حسین بھی شامل تھے۔ ایسے جغادریوں میں بھلا ان کو کون منہ لگاتا' نہ سورس' نہ سفارش' نہ مال مگر صحت' اب قابل رشک تھی۔ حلیہ انگریزوں سے ملتا جلتا۔ ایک چیز ان کے پاس ضرور تھی۔ وہ لکھنوی اردو اور ان کا اہل زبان ہونا۔ غرضیکہ اس ہفت خواں کو بھی انہوں نے زباندانی سے پار کر لیا' جیسے ریس کا گھوڑا رکاوٹوں کو پار کر لیتا ہے اور یہ ایف سی کالج میں استاد ادبیات قرار پائے۔ اس دوران ان کے ہمارے سر پھرے دوست شور صہبائی نے "عکس لطیف" نکالا۔ ابھی جلیبیاں ٹھنڈی نہیں ہوئی تھیں۔ چنانچہ ہماری تصنیف لطیف "اندیشہ شہر" جس پر ہمیں بڑا ناز تھا۔ اس کے انہوں نے پرزے اڑا دیئے۔ دبے لفظوں میں گرما گرم جلیبیوں کا نوحہ

اس جواب آں غزل میں شامل تھا۔ جسے ہم اس ناشدنی ناشتے کی طرح ہضم کر گئے۔

زور بیان میں پیارے پڑھنے والو ہم بہت آگے بڑھ گئے۔ آپ کے گردش ایام کے تعاقب میں پیچھے کی جانب پلٹیں۔

آغا سہیل جب لکھنؤ یونیورسٹی کے ہونہار طالب علم تھے۔ تو چور ان کی خاندانی سائیکل چرا کر لے گئے' جس کے سلسلے میں ایک مذاق یہ بھی تھا کہ :۔

یہ روتے پیٹتے ہمارے پاس پہنچے۔ مسئلہ بڑا ٹیڑھا تھا۔ روزانہ سات میل احاطہ مرزا علی خاں سے یونیورسٹی پیدل جانا اور آنا وہ بھی پیٹ پر پتھر باندھ کے۔ چونکہ ان کا یہ دعویٰ ہے کہ یہ نواب محمد علی خاں بادشاہ اودھ کی جائز اولادوں کے مستند سلسلے سے ہیں' اور وثیقہ یاب ہیں۔ اس لئے حضور نواب صاحب کو دو ایک دن کو ملاحظہ کرتے ہوئے گزر گئے کہ یہ ہمارا حسین آباد کا امام باڑا ہے۔ یہ گھنٹہ گھر خاندانی ہے۔ یہ آصف الدولہ کا امام باڑا' بزرگوں کی باقیات الصالحات میں سے ہے۔ یہ جنون کی مسجد ہے' جس میں مخالفین بیٹھ کر ہمارے بزرگوں کے خلاف سفلی کے عمل کرتے۔ یہ دریائے گومتی ہے' جس کے کنارے پر کئی پشت ہم نے حکومت کی اور موجودہ پشت فاقے کر رہی ہے۔ غرض یہ خاندانی دیار و امصار سے دل بہلاتے یونیورسٹی پہنچ جاتے' بلکہ واپس گھر تک چلے جاتے۔ تین چار دن بعد پاؤں خاندانی عظمت کے آگے جواب دینے لگے۔ جب یہ ہمارے پاس پہنچے تو حسن عابد جو نہایت رقیق القلب واقع ہوا ہے ہم سے زبردستی "نوری ہوٹل" میں چائے پی رہا تھا۔ جبراً اس لئے کہ چائے کی فرمائش جب پوری ہوگئی تو اسی نے سلائس منگوا کر ان پر مکھن لگوایا' آملیٹ بنوایا اور ہمیں چھونے تک نہ دیا' بس قہقہے لگا رہا تھا کہ :۔

"پیسے تو تم ہی کو دینے ہیں' اس لئے تم کھانے کے آداب سیکھو
کہ کھاتے کیسے ہیں؟"

حسن عابد ایک دم سنجیدہ ہوگیا۔ اس نے ان کی داستان غم قسطوں میں سنی۔ قسطوں میں اس لئے کہ توس آملیٹ سب کا بھونپا بنا کر اپنے منہ میں داخل کرنے کے لئے بار بار اسے پانی پینے کے لئے جانا پڑا۔ میرا رویہ اس لئے خاصا نرم تھا کہ میرے ذہن میں آغا کی

گرم گرما جلیبیاں تھیں، فی الحال کوئی دوسرا بیانہ لینے پر تیار نہ تھا۔ حسن عابد نے اپنی خدمات پیش کر دیں کہ:۔

"وہ اپنی سائیکل پر انہیں گھر سے یونیورسٹی لے جایا اور گھر پہنچایا کریں گے؟"

اول تو حسن عابد کی سائیکل کے لئے ایک پہلوان کی ضرورت تھی اور پہلوان بھی ایسا جسے سرکس میں سائیکل چلانے کا وسیع تجربہ ہو۔ جو اس کی سائیکل کا ہینڈل پکڑ کر چلے۔ اس سائیکل پر یہ آلو کے بورے کی طرح ڈال دیئے جائیں اور ساتھ ساتھ بزور بازو اسے حسن عابد بیلنس کرتے چلیں۔ دوسرے حسن عابد یونیورسٹی کے لئے اگر صبح گھر سے نکلتے تو رات کو بھی واپس پہنچ جاتے تو غنیمت سمجھا جاتا۔ یہ ٹھہرے بال بچے دار، بیوی کے عاشق، ہر سال کیلنڈر بدلنے والے، اس لئے ان کا آفریاد شاہ نواب نے بڑی حقارت سے ٹھکرا دیا۔ بقول حسن عابد:۔

"اس نے خدمت کا آخری موقع بھی نہیں دیا۔"

بولے:۔

"حسن عابد! تم پہلے اپنی سائیکل کی مرمت تو کرالو۔"

حسن عابد نے کہا:۔

"مرمت! مرمت اور اس سائیکل کی؟ اس سے کم پیسوں میں تو نئی سائیکل مل جائے گی۔"

میں نے کہا:۔

"پھر کیا صورت ہو؟"

بولے:۔

"اس سنگین مسئلے کا واحد حل صرف نئی سائیکل کا خریدا جانا ہے۔"

پوچھا: "سردست آپ کے پاس کتنے روپے ہیں؟ بولے:۔

"ایک دوست سے دست گراں دس روپے مل سکتے ہیں۔"

پوچھا:۔ "کون دوست؟"

زور دے کر بولے۔ "...... تم!"

پھر چراغوں میں روشنی نہ رہی۔ تینوں درویش بہت دیر تک غور و فکر میں غلطاں و پیچاں رہے تھوڑی تھوڑی دیر بعد سر اٹھاتے' بے بسی سے دوسرے کو دیکھتے' پھر غور و فکر کا سلسلہ شروع ہو جاتا' میرا دماغ ہر طرف گھوڑے کی طرح دوڑ رہا تھا' اچھا خاصا ریس کورس بنا ہوا تھا۔

میرے والد کے دوست سیٹھ بشیر احمد تھے' جن کا "پاپولر سندھ ریسٹورنٹ" کے پیچھے بہت بڑا "پنجاب سائیکل ورکس" تھا۔ وہ سائیکل قسطوں پر دیتے' انھیں لے کر "پنجاب سائیکل ورکس" پہنچا۔ سیٹھ صاحب بڑی محبت سے ملے۔ لسی پلوائی' ہمارا دکھڑا سننے سے پہلے انھوں نے ایک نئی سائیکل کسوا کر بادشاہ نواب کو سونپ دی۔ میں نے عرض کیا:۔

"چچا! ہر ماہ نواب صاحب دس روپے دے دیا کریں گے۔"

سیٹھ بشیر احمد بولے۔ "انشاء اللہ۔"

ہم لوگ سلام کر کے "پنجاب سائیکل ورکس" سے اس طرح نکلے کہ سیٹھ جی کہیں آدمی دوڑا کر سائیکل واپس نہ لے لیں۔ شرافت ملاحظہ ہو کہ فقط دس روپے میں سائیکل دے دی اور سائیکل کی نصف قیمت پیشگی جمع کرنے کی شرط سے بھی مستثنیٰ کر دیا۔ یہ تھا ایک قادیانی کے اخلاق کا مظاہرہ۔

آغا سہیل اب احاطہ مرزا علی خان سے یونیورسٹی تک اس طرح سائیکل دوڑاتے' جیسے نیلی جھیل میں راج ہنس تیر رہا ہو۔ مگر جلیبیاں اب بھی ان کے دماغ کے کڑھاؤ میں ابل رہی تھیں۔ ابھی سائیکل کے ٹائر نہیں میلے ہوئے تھے کہ یہ ایک دن روتے پیٹتے فریادی ماتم کرتے پہنچے اور چلا کر کہا:۔

"جمال! رات چور دیوار پھاند کر داخل ہوا' اندر کا دروازہ کھول کر آنگن میں تالا لگی میری سائیکل اٹھا لے گیا۔"

جب یہ سائیکل کی داستان حیات بیان کر چکے' جو افسانہ حیات سے بھی مختصر تھی' تو بہت دیر تک ہم دونوں ایک دوسرے کو بے بسی سے دیکھتے رہے۔

اچانک آغا سہیل نے میز پر گھونسا مار کر پرعزم انداز میں کہا:۔

"میں نے فیصلہ کیا ہے کہ سائیکل کی قسطیں پابندی سے ادا کرتا رہوں گا اور پیدل یونیورسٹی جایا کروں گا۔"

میں نے کہا:۔

"مگر یار غور تو کرو......"

آغا سہیل نے باوقار عربی فارسی آمیز نہایت گاڑھے نوابی لہجے میں زور دیتے ہوئے کہا:۔

> "ہم جو فیصلہ کرچکے اس کے پابند رہیں گے۔ یہ فیصلہ وقت اور حالات کا ہے' جس سے سردست انحراف ہمارے لئے ممکن نہیں۔"

اور وہ چل دیا۔ آغا سہیل چلتا رہا' چلتا رہا۔ احاطہ مرزا علی خاں سے یونیورسٹی' حضرت گنج' امین آباد' ادیبوں کے یہاں' ادبی نشستوں' میرے گھر اسی طرح آتا' جیسے کہ سائیکل پر آتا تھا۔ اس نے پیدل مار کر بی اے کیا' ایم اے کیا اور پھر چل دیا۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ اس گیارہ نمبر کی سواری کے بعد اس نے کبھی کسی سے سائیکل کے لئے لفٹ بھی مانگی ہو۔ پیدل چلتے چلتے ایک دن وہ ریل پر سوار ہو کر اپنے دلدر دور کرنے کے لئے اس پار نکل گیا اور اس کے دلدر دور ہو گئے' جن میں ہم بھی شامل تھے۔

اس زمانے میں "انجمن ترقی پسند مصنفین" کی نشستیں بڑی دھواں دھار ہوتیں۔ ایک سے ایک چیزیں پڑھی جاتیں۔ بحث ایسی گرما گرم ہوتی کہ آستینیں چڑھ جاتیں۔ منہ سے کف جاری ہو جاتے۔ لکھنے پڑھنے اور بحث میں حصہ لینے والوں میں آغا صاحب پیش پیش رہتے یہ تنقیدی مضامین اور افسانے سناتے' زیادہ تر افسانے۔ پہلی بار جب یہ سرحد پار سے لوٹے تو ان کی واپسی سے ہمیں یہ فائدہ ہوا کہ ان میں اور احراز نقوی میں کھٹ پٹ ہو چکی تھی' اس نے کہیں کہہ دیا کہ:۔

"جو ٹائی آغا سہیل باندھے ہوئے ہیں' وہ اس کی ہے اور اسے ٹائی تک باندھنا

نہیں آتی۔"

خدا کا شکر ہے کہ یہ تائی کے آگے جلیبیاں تک بھول گئے۔ دونوں الگ الگ ایک دوسرے کا رونا روتے اور میں دونوں کو ٹھنڈا کرتا۔ مقامی پیچیدگیوں کے آگے میری "ارتھنگ" بھی بیکار تھی۔ دونوں اب خوب پیٹ بھرے تھے اور خواہ مخواہ ایک دوسرے کے سینگ مار رہے تھے۔

اسی دوران پھر ایک ایسا سانحہ ہو گیا کہ یہ حضرت ہم سے پھر کچھ کھنچ سے گئے۔ ہوا یہ کہ سہ پہر کو یہ "قومی آواز" کے شعبہ ادارت میں پہنچے۔ میں شفٹ پر تھا۔ یہ شفٹ انچارج کی میز پر کمال بے تکلفی سے بیٹھ گئے۔ چیف ایڈیٹر عشرت علی صدیقی قاعدے قانون اصول اور ضابطے کے آدمی تھے۔ اگر وہ یہ خوفناک منظر دیکھ لیتے تو ہمیں حسب معمول ہفتوں دوڑاتے۔ اس لئے موصوف کے خوف سے ہم نے کرسی پر بیٹھنے کے لئے ان سے اصرار کیا اور یہ برا مان گئے۔ انہیں برابر کرنے میں برسوں لگ گئے۔ آغا سہیل نے جب ڈاکٹریٹ بھی کر لی تو انہوں نے دھڑا دھڑ تنقیدی مضامین لکھنے شروع کر دیئے۔ ابتداء میں لہجہ سخت تھا، مگر رفتہ رفتہ اعتدال پر آ گئے۔ اسی کے ساتھ ان کی افسانہ نگاری نے ترقی کے منزلیں طے کرنی شروع کر دیں۔ "بدلتا ہے رنگ آسماں" سے ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے، جب ان کے فن کا راکٹ "شہرنا پرساں" تک پہنچا تو ان کا شمار اردو کے صف اول کے افسانہ نگاروں میں ہونے لگا۔ یہ اپنی خوبصورت کتابیں بھی پابندی سے ہمیں بھیجتے رہے۔ وقت اور فاصلے نے ہماری محبتوں میں چار چاند لگا دیئے جب بھی معلوم ہو جاتا کہ آغا سہیل آنے والے ہیں تو ہم سیوان سے لکھنؤ پہنچ جاتے۔

جب ہم کراچی گئے تو یہ لاہور کے اخباروں میں روزانہ ہماری آمد کی خبریں چھپواتے۔ اسلام آباد میں ان کا دھمکی آمیز فون آیا:۔

"سیدھی طرح لاہور آتے ہو یا....."

اسلام آباد میں ہم میاں بیوی جب فلائنگ کوچ سے تقریباً ۹ بجے دن کو لاہور پہنچے تو ہمارے استقبال کے لئے ابصار عبدالعلی کھڑے ہوئے تھے۔ آغا سہیل کو نہ دیکھ کر غصہ

تو آیا' مگر ابصار نے بتایا کہ آغا صاحب ہسپتال میں ہیں۔ میں نے کہا:۔

"ہندوستان میں بھی یہ شخص ہر سال ہسپتال میں پایا جاتا تھا۔
پاکستان میں بھی ہسپتال کا پیچھا نہیں چھوڑا۔"

ابصار ہنستے ہوئے بولے:۔

"بھابی کے چوٹ آگئی ہے' اسی سلسلے میں انہیں لے کر گئے ہیں۔"

ہم نے پوچھا:۔

"اضافہ آبادی کی چوٹ؟"

بولے:۔

"اس کام سے تو دونوں کبھی کے فارغ ہو کر کنٹرول آبادی میں مصروف ہیں۔"

غرض ابصار اپنے یہاں لے گئے اور کچھ دیر بعد آغا صاحب بھی آگئے اور شام کو "پاک ٹی ہاؤس" لے گئے۔ جہاں سلیم اختر' انتظار حسین اور دوسرے شاعروں' ادیبوں سے خوب گپ کی۔ واپسی میں آغا صاحب مستقل ہماری قابلیت کا قصیدہ پڑھ رہے تھے۔ زندگی میں پہلی بار وہ اپنے علاوہ کسی اور سے متاثر ہوئے تھے' پھر انہوں نے "جنگ" کا وہ تاریخی انٹرویو کروایا' جس میں ہماری روح قبض کرنے کے لئے انتظار حسین اور عطاء الحق قاسمی بھی پینل میں شامل تھے۔ انٹرویو کے بعد انہوں نے ہمیں گلے لگایا اور بولے:۔

"بہت اچھی چوکھی لڑے۔"

ابصار عبدالعلی نے جو زبردست ادبی نشست کی' اس میں بھی ایک ایک سے ہمیں ملایا اور مجھے اندازہ ہوا کہ آغا سہیل مجھ سے کیسی ٹوٹ کر محبت کرتا ہے۔ یہاں تک تو راوی چین لکھتا ہے۔ ابصار نے چپکے سے کہا کہ:۔

"آغا صاحب کی موٹر پر سیر ضرور کرنا' مگر وہ خود چلائیں۔"

دوسرے دن ہم لوگ آغا صاحب سے ملنے ایف سی کالج کے شاندار کمپاؤنڈ میں داخل ہوئے۔ آغا صاحب کا بنگلہ کیا کہنا' بالکل عمر خیام کی رباعی ہے۔ ان کے گھر کا ماحول مریضانہ تھا۔ بھابی واقعی بیمار پائی گئیں۔ ان کی مزاج پرسی اور لکھنؤ کی باتیں ہوتی رہیں۔ پھر

آغا صاحب کی دعوت شیراز سے ہم لطف اندوز ہوئے۔

آغا صاحب سے ہم نے موٹر پر سیر کرنے کی فرمائش کی بھڑک گئے مگر ہماری ہالک ہٹ پر ہنسے۔ اب ہم لوگ آغا صاحب کی موٹر پر روانہ ہوئے۔ غالباً محسن یا ان کا بھتیجا موٹر چلا رہا تھا۔ اس کے بعد ان سے موٹر چلانے کی درخواست کی گئی اور آغا سہیل نے موٹر چلائی' جس کے ہم چشم دید گواہ ہیں۔ موٹر ناؤ کی طرح ڈگمگ ڈول رہی تھی اور بالکل اسی انداز سے چل رہی تھی' جیسے لڑکے اکثر ہاتھ چھوڑ کر سائیکل چلاتے ہیں۔ کبھی موٹر سامنے ٹکرانے والی ہوتی تو لڑکا سنبھال لیتا۔ کبھی یہ پیچھے خراش لگا کر پوچھتے:۔

"سب ٹھیک ہے نا؟"

یہاں تک کہ سڑک آگئی اور ڈرائیور بدل گیا۔ یہ موٹر میں با آواز بلند چلاتے ہیں۔ سڑک کے اس پار بھی کوئی ہو تو یہ آواز دیں گے:۔

"بھیا سڑک چھوڑ دو"

جواب آیا:۔ "فٹ پاتھ پر ہیں"

فرمایا "فٹ پاتھ چھوڑ دو"

موٹر اور زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں' غرض جب تک وہ چلاتے رہے' ہم سب خوفزدہ ہنسی ہنستے رہے۔ جب ہم لاہور ہوائی اڈے کو الوداع کہہ رہے تھے تو آغا سہیل کی آنکھ میں آنسو بھر آئے اور کہنے لگے:۔

"ارے ارے دل کو مضبوط رکھو۔" اور میں دل کو مضبوط کرنے کے لئے آگے بڑھ گیا۔

آغا سہیل کی لاہور بلکہ پاکستان میں بڑی دھاک ہے۔ لوگ بڑے احترام سے نام لیتے ہیں۔ یہ وہاں سند کا درجہ رکھتے ہیں۔ بڑے مقبول بلکہ ہر دلعزیز ہیں اور خوشی کی بات یہ ہے کہ بڑے مزے میں ہیں۔ دوستوں میں ہم کو بھی ہر موقع پر یاد رکھتے ہیں۔ فاصلہ جتنا بھی ہو مگر دلی قربت اس کا احساس بھی نہیں ہونے دیتی اور جب خیال آتا ہے کہ آغا سہیل موٹر چلا رہے ہونگے تو جی خوش ہو جاتا ہے۔

ٹو سر ود لو

(TO SIR WITH LOVE)

ڈاکٹر سلیم اختر

پہلے جو بات میں مذاق میں کہتا تھا' وہ میرے لئے اب تلخ حقیقت کی صورت اختیار کر چکی ہے' یعنی نقاد اور ادیب کی بے غرض اور پر خلوص دوستی ممکن نہیں' جب تک تعریف کی ٹافیاں کھلاتے رہو' ادیب خوش' اس کے احباب خوش اور دوستی برقرار' لیکن جس دن تنقید کی دال میں تعریف کا تڑکا کم ہوا' اسی دن گفتار کا اسلوب تبدیل ہو جائے گا اور دوستی کی نیا ڈانواں ڈول ہو جائے گی۔ میرے لکھنے کی عمر تو تیس پینتیس برس بنتی ہے' مگر فی برس تو کجا' میں پانچ برس کے حساب سے بھی دوست نہ بنا پایا۔ البتہ مختصر ترین تاریخ اور سالانہ ادبی جائزے کی وجہ سے مخالفین اور دشمنوں کی تعداد بڑھانے میں میں خود کفیل ہوں۔ اس تلخ حقیقت کے ساتھ یہ بھی ایک خوشگوار حقیقت ہے کہ "آغا سہیل" میرے ان پر خلوص دوستوں میں سے ہیں' جن سے دوستی کا رشتہ پختہ سے پختہ تر ہوتا گیا ہے' اس لئے کہ آغا سہیل ان معدودے چند لوگوں میں سے ہیں' جو صرف دوست کی دوستی سے غرض رکھتے ہیں۔ اس کے نقاد ہونے' افسر ہونے' ایڈیٹر ہونے یا کچھ اور ہونے یا نہ ہونے سے فرق نہیں پڑتا۔ اب یہی دیکھ لیجئے کہ آج کی تقریب میں ان کے حق میں کلمہ خیر کہنے کو کیسے کیسے دوست جمع ہیں کہ ان کی مقبولیت کی دلیل میں آج کی محفل کے شرکاء ہی کافی ہیں۔ میں پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو مجھے یاد نہیں آتا کہ ان سے پہلی ملاقات کب اور کہاں ہوئی تھی۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ ملاقات سے پہلے ان کی تحریروں سے نہ صرف یہ کہ متعارف تھا' بلکہ "بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے" کو پڑھ کر حیران بھی ہو چکا تھا۔

یہ ملاقات والی بات اس لئے بھی لکھی کہ بعض لوگ کھڑاک والے ہوتے ہیں' وہ کسی محفل میں جائیں تو انداز کچھ "آدم بو آدم بو" جیسا ہوتا ہے۔ ایسے شخص سے اولین تعارف ہمیشہ یاد رہتا ہے مگر آغا صاحب نرم لہجے کے نرم خو انسان ہیں' پھر کم آمیز بھی ہیں اور گفتار کے غازی بھی نہیں ہیں۔ فقرہ بازی' لطیفہ گوئی اور جگتوں کے معاملے میں بھی

تہی دست ہیں۔ اس لئے متعدد ملاقاتوں کے بعد کہیں جا کر یہ احساس ہوتا ہے کہ ہم تو آغا سہیل کے دوست بن چکے ہیں اور پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تعلقات کی اساس مستحکم ہوتی جائے گی۔ آپ ان کے بارے میں توصیفی کالم لکھتے ہیں یا نہیں' ادبی ایڈیشن میں ان کی تصویر شائع کرتے ہیں یا نہیں' اپنی تنقید یا مقالے میں ان کا تذکرہ کرتے ہیں یا نہیں اس سے انہیں کوئی فرق نہیں پڑے گا' اور یہ آپ کو مسلسل دوست سمجھتے رہیں گے' حتیٰ کہ شکایت ہونے پر بھی حرف شکایت زبان پر نہ لائیں گے۔

ان کی شخصیت میں شرافت' رواداری' مروت اور تحمل شامل ہے۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے آغا سہیل۔ یہ چار عناصر ان میں کوٹ کوٹ کر بھرے ہیں اور اس وافر تناسب سے کہ کبھی کبھی تو طبیعت الجھنے لگتی ہے کہ اب ایسی بھی کمبختی رواداری کس کام کی کہ انسان کبھی کسی سے لڑائی بھی نہ کرے' چلیں لڑنا بری بات ہے تو بدخوئی اور عیب جوئی تو کر ہی لیا کریں۔ انسان نہ کرے مگر ادیب کو تو اس فن تعریف کا ماہر ہونا چاہئے کہ عیب جوئی کے بغیر تو زبان کی "ال" بھی نہیں اترتی' مگر اپنے آغا صاحب ایسے ادیب ہیں کہ نہ قلم کو آلودہ کرتے ہیں اور نہ زبان کو اور شاید اسی لئے متنازعہ ادیب بننے میں ناکام رہے ہیں۔ یہ خوبی بھی ہے اور خامی بھی ہے' فرق انداز نظر سے پڑتا ہے۔

جن دنوں میں دو پہیوں کا سوار تھا تو سارا لاہور میرے پیڈلوں کی زد میں ہوتا تھا اور گرمی ہو یا سردی میں لاہور میں کسی آوارہ ہوا کی مانند گھومتا تھا۔ ان دنوں میں آغا صاحب کے ہاں بہت آتا تھا' نہر کے کنارے مزے مزے سے سائیکل چلاتا ہوا ایف سی کالج کے خوش منظر کیمپس کی سیر کرتا ہوا ان کے ہاں پہنچتا۔ سردیاں ہوتیں تو یہ مجھ سے پوچھے بغیر ہی کافی بنانے کو کہہ دیتے اور اس کے بعد دو چار گھنٹے کی نشست یقینی ہوتی تھی' جس میں دنیا جہان کی باتیں ہوتیں مگر حیف کہ وہ تمام گفتنی ہوتیں۔ مجھے ان سے ناگفتنی سننے کی حسرت ہی رہی۔ اب آپ تو جانتے ہی ہیں کہ میں برا بھلا جیسا بھی ہوں' بس نفسیاتی نقاد ہوں۔ اب اگر مجھے Feel کرنے کو بچپن کی غلط کاریاں' جوانی کے سکینڈلز اور بڑھاپے کی بلڈ پریس نہ ملیں تو نفسیاتی تجزیے پر مقالہ کیسے قلمبند ہوا اور خاکہ بارہ مسالہ کی چاٹ میں کیسے تبدیل

ہو گا۔ اگر یہ خاکہ آپ کو مونگ کی دال کی کھچڑی جیسا محسوس ہو رہا تھا تو یہ میرا نہیں۔ بلکہ خود قبلہ آغا صاحب کا قصور ہے' جو لانڈری سے دھلے لٹھے جیسی صاف شفاف شخصیت کے مالک ہیں کہ نہ داغ' نہ دھبا' نہ سیاہی' تر دامنی کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

اگر انداز گفتگو کے لحاظ سے آغا صاحب بہت "پولے پولے" لگتے ہیں' تو اسلوب حیات کے لحاظ سے بہت ہی "بیبے" واقع ہوئے ہیں' لیکن بیبے ہونے کا مطلب موم کی ناک بننا نہیں۔ چنانچہ سیاسی اور ادبی تصورات کے اظہار میں بے باک ہی نہیں' بے لچک بھی ہیں۔ میں متعدد ایسے مواقع کا گواہ ہوں' جہاں انہوں نے محفل کی عمومی فضا کے برعکس جس بات کو حق جانا' بلا جھجھک اس کا اظہار کر دیا۔ اسی لئے انہوں نے نامصلحت پسندی کو شعار بنایا۔ ان کے مزاج میں عدم مفاہمت کے جو جوہر ملتے ہیں' انہوں نے تحریر کے ساتھ ساتھ ان کی شخصیت کے عمومی رویوں کے تعین میں بھی خاصا اہم کردار ادا کیا ہے۔

اب یہی بات کیا کم ہے کہ ہم پنجابی جھگوں کے ساتھ عمر بتانے کے باوجود بھی آغا صاحب نے لکھنؤ کی روایتی وضع داری' رکھ رکھاؤ اور گفتگو کی مٹھاس برقرار رکھی ہے حالانکہ اب تو سرنا رتھیوں اور سکھ ٹیکسی ڈرائیوروں کی وجہ سے اصل لکھنؤ میں بھی یہ سب عنقا ہے۔ بس فلموں میں روایتی لکھنؤ کی کچھ جھلک نظر آ جاتی ہے۔ ایسی جھلک جو بسا اوقات تو اصل لکھنؤ کی پیروڈی معلوم ہوتی ہے۔ ایسے میں آغا سہیل کا گھر لاہور میں منی لکھنؤ معلوم ہوتا ہے۔

بحیثیت انسان اور ادیب عزت کمانے کے علاوہ آغا سہیل نے بطور استاد شاگردوں سے جو احترام' محبت اور عقیدت حاصل کی' وہ ہر استاد کو میسر نہیں کہ اب تو زمانہ ایسا آ گیا ہے کہ غالباً استاد جی ہی کی یہی عزت ہوتی ہو گی باقی اساتذہ کرام تو بس پیٹ پال رہے ہیں۔ کلاس میں سے ماتھے کا پسینہ پونچھتے باہر نکلو تو یہ دھڑکا کہ کہیں کلا جھکوف کی بھگی گولی ہی نہ چاٹ جائے۔ ایسے میں آغا صاحب کو اپنے طلبہ سے جو عزت' احترام اور محبت ملی اس میں ان کی شخصیت کے رکھ رکھاؤ کے ساتھ ان کا علم و فضل بھی شامل ہے۔

ایف' سی کالج کے "پرنسپل صاحب" اور اساتذہ کرام اور طلبہ مبارک باد کے

مستحق ہیں کہ ایک بہت بڑے قابل، محنتی اور محبت کرنے والے استاد کو محبت، عزت اور احترام کے ساتھ رخصت کر رہے ہیں۔ ہمارے ہاں زندگی میں عزت کرنے کا رواج نہیں، اس لئے ہم "قاسمی صاحب" کے الفاظ میں:۔

"عمر بھر کی سنگ زنی کر کے مرنے کے بعد اعزاز کے ساتھ دفناتے ہیں، یہ ہماری قومی سائیکی کے عین مطابق ہے۔"

میں اور آغا صاحب اب عمر کے اس دور میں ہیں جہاں ہمارا سب سے بڑا اور انقلابی قدم ہماری دوسری شادی نہیں بلکہ ریٹائرمنٹ ہے، سو آغا صاحب نے یہ منزل سر کرلی ہے، ہم بھی ان کے پیچھے پیچھے چلے آ رہے ہیں۔ آج آغا صاحب ریٹائر ہو رہے ہیں تو مجھے یقین ہے کہ یہ اس اطمینان کیساتھ رخصت ہونگے کہ میں نے اپنی بہترین صلاحیتیں اس تعلیمی ادارے کے لئے وقف کئے رکھی ہیں۔ گزشتہ دنوں مجھے سڈنی پوائٹر کی مشہور فلم "To Sir With Love" دیکھنے کا اتفاق ہوا تو آخری منظر پر میری آنکھیں بھیگ گئیں، اس احساس سے کہ میں ایسا نہ بن سکا۔ لیکن آغا سہیل اس کڑے معیار پر پورے اترتے ہیں اس لئے دوست ہونیکے باوجود میں بھی شاگردانہ محبت سے آغا سہیل کی خدمت میں اس مضمون کا تحفہ پیش کرتا ہوں، یہ کہتے ہوئے۔

"ToSirWithLove."

"ایک نستعلیق آدمی --- آغا سہیل"

رحیم گل

ایک بار ڈاکٹر وحید قریشی نے مجھ سے کہا:

"تم اکثر جونیئر کے خاکے لکھتے ہو؟۔"

عرض کیا:۔ "اس لئے کہ میں بزرگوں سے گستاخی نہیں کر سکتا۔"

ایک اور صاحب نے کہا:۔ "ان کے باغ کے سارے "کینو" سلمان بٹ کھا جاتا ہے' خاکہ بھی وہی لکھیں گے۔"

فرمایا.... "آپ رشوت لے کر خاکے لکھتے ہیں؟۔"

عرض کیا:۔ "ہاں .... میں محبت کی رشوت کا بھوکا ہوں۔ جس کے دامن میں محبت نہیں ہے' میرے پاس ان کے لئے الفاظ ختم ہو جاتے ہیں۔"

ایک اور صاحب نے کہا:۔ "ڈاکٹر انور سدید خاکے کے لئے موزوں آدمی ہیں۔"

عرض کیا:۔ "صرف موزوں نہیں' موزوں ترین آدمی ہے' بس موڈ کا انتظار ہے۔"

ایک صاحب.... "ڈاکٹر آغا سہیل کا خاکہ لکھیں؟"

عرض کیا:۔ "میں شریف آدمیوں کے خاکے نہیں لکھتا۔"

لیکن آج میں قلم کاغذ لے کر بیٹھ گیا ہوں' اپنے آپ کو آزمائش میں ڈال رہا ہوں اور اس شریف آدمی کو خاکہ بند کر رہا ہوں۔

ڈاکٹر آغا سہیل' ڈاکٹر ہے' ایم بی بی ایس نہیں' لٹریچر کا' بچوں کو پڑھاتا ہے.... سکول میں نہیں' کالج میں' چھوٹا قد' بڑا ذہین' گھنے بال' گورا رنگ' بتیسی نے کام بگاڑ دیا ورنہ خوبصورت آدمی ہوتا.... پھر بھی خوبصورت آدمی ہے....!

مرنجاں مرنج' بذلہ سنج' خوش مزاج' خوش گفتار' بس چلے تو اچھائی کرتا

ہے' مگر بس چلے تو برائی نہیں کرتا..... اچھا دوست ہے' اچھا آدمی ہے' اچھا شوہر ہے' اچھا باپ ہے' اچھا استاد ہے' اچھا افسانہ نگار ہے' اچھا تنقید نگار ہے اور تنقیدی اجلاسوں کا اچھا صدر ہے..... دودھ اور پانی کی مقدار کو سمجھنے والا' پانی کہاں مرتا ہے' اس کا شعور رکھتا ہے۔ بات کو سمیٹنا جانتا ہے' بات کو آگے بڑھانا بھی جانتا ہے' چونکہ نستعلیق قسم کا آدمی ہے' مہذب اور شریف' ظاہر ہے ہمارے ادب میں شریف آدمی ذرا کم چلتا ہے بلکہ کارنر کر دیا جاتا ہے..... اس کے باوجود آغا سہیل ٹھیک ٹھاک چل رہا ہے' ادبی حلقوں میں بھی دکھائی دیتا ہے' ادبی پرچوں میں بھی نظر آتا ہے۔

لوگ اسے سلام کرتے ہیں' پیار بھی کرتے ہیں' مگر کوئی کمی ہے' جس کا ڈاکٹر کو ادراک ہوا ہے کچھ چھیڑ چھاڑ کا شوق' دکھتی رگ پر انگلی رکھنے کا عمل کچھ مدت سے محسوس ہو رہا ہے کہ ڈاکٹر مصلحت اندیشی کے خول سے نکل آیا ہے' گو یہ نکلنا عاقبت نااندیشی کی حدود میں نہیں آتا۔ البتہ یہ "سچ" کے قریب ہونے کا کوئی عمل ہے..... سچ کہنے میں ہمیشہ مشکل کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور آدمی نستعلیق بھی نہیں رہتا آغا سہیل بھی ان دنوں ایسے ہی مرحلے سے گزر رہا ہے۔ وہ سچ کہہ رہا ہے اور اس کے دوستوں میں کمی آ رہی ہے..... جوں جوں اس کی تنقید میں گہرائی آتی جا رہی ہے' توں توں اس کی پذیرائی میں کمی آ رہی ہے۔

آج کل وہ امتحان دے رہا ہے' نصاب کا نہیں' رویوں کے تعلق کا' کچھ عرصہ پہلے وہ محتاط تھا' کتاب پر رائے دینے سے پہلو تہی کرتا' صاحب کتاب کی اوقات کو دیکھتا' قدوقامت کو' ادبی جسامت کو اگر بندہ لنڈھور ہے اور کتاب لنڈوری؟ تو گول کر جاتا' محفل میں نہ آتا' بعد میں معذرت کرتا..... موسم شدید تھا' سکوٹر ورکشاپ میں تھا' تاریخ بھول گیا تھا' وقت یاد نہیں رہا تھا' حافظہ کمزور ہو گیا ہے..... وغیرہ وغیرہ۔

شریف آدمی ہے' لوگ اس کی بات کا یقین کر لیتے ہیں' لیکن جب باردگر' باردگر یہ عمل جاری رہا تو لوگوں کو شک ہو گیا..... اور پھر ظاہر ہے' شک کا علاج تو لقمان حکیم کے پاس بھی نہیں تھا!

ڈاکٹر کب تک پہلو تہی کرتا' بالآخر میدان میں آ گیا..... مرد میدان بننے کے لئے

بڑے استقلال کی ضرورت ہوتی ہے' تھپیڑوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے' اٹل رہنا پڑتا ہے....!

برے کو برا کہنا اتنا مشکل نہیں ہوتا' جتنا اچھے کو اچھا مان لینا' اس لئے بڑے ظرف کی ضرورت ہوتی ہے.... ڈاکٹر نے اس کا ثبوت دیا' اس نے بیچ محفل میں وہ کچھ کہا جو لوگ پس پشت کہتے ہوئے بھی کتراتے ہیں۔

یہ بڑے دل گردے کی بات تھی....!

ڈاکٹر نے پچھلے چند مہینوں میں کتابوں پر جتنے مضامین پڑھے' بہت متنازعہ تھے' متنازعہ اس شکل میں کہ لوگوں نے تالی بجائی مگر صاحب کتاب کی آنکھوں میں دھند آئی۔

ایک طرف پسندیدگی' دوسری طرف آزردگی' جنہوں نے سنا' خوش ہوئے' جنہوں نے بلایا' پشیمان ہوئے۔ عذرا اصغر ناراض ہوئی تو انور جاوید بھی گئے.... ڈاکٹر نے بیک وقت دو رد عمل دیکھے۔ ایک داد و دہش کا' دوسرا شکوہ شکایت کا.... وہ ایسے دوراہے پر کھڑا ہے کہ ایک طرف سچ کا بورڈ لگا ہوا ہے' دوسری طرف مصلحت کا.... کوئی ہم جیسا ہوتا تو آگے بڑھ جاتا اور وہ کر گزرتا' جو اس کا وجدان کہتا.... مگر ڈاکٹر باشعور پروفیسر ہے.... دیکھتے ہیں رکتا ہے یا آگے بڑھتا ہے' بہنے والے پانی اور رک جانے والے پانی کا فرق تو بہرحال ڈاکٹر کو معلوم ہے.... دوست بنانا اور دوست گنوانا بھی آج کل ایک فن ہے۔

یہ دور جا رہا ہے کہ لوگ بہت سوچ کر دوستیوں کے بیج بوتے ہیں' پھر پودے کو سینچتے ہیں' درخت بن جاتا ہے تو اس کے سائے میں بیٹھتے ہیں' اس کا ثمر کھاتے ہیں اور دوستوں کے گھر بھیجتے ہیں' یوں شہر کے گوشے گوشے میں کلمہ خیر کہنے والوں کے گروپ پیدا ہو جاتے ہیں اور ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے ایک دوسرے کو نوازتے ہیں۔

ڈاکٹر آغا سہیل کو اس سطح پر آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ آئے گا بھی نہیں۔ کیونکہ بہرحال اس کا ایک معیار ہے' وہ ٹھوس آدمی ہے' شرفاء میں ان کا شمار ہوتا ہے....!

بحیثیت مجموعی بھی ڈاکٹر وضع دار آدمی ہے' ٹال مٹول والا رویہ نہیں رکھتا۔ جتنا کام کر سکتا ہے' اتنے کی حامی بھرتا ہے اور کر بھی دیتا ہے۔

سماجی ربط ضبط میں ٹھیک ٹھاک' رکھ رکھاؤ میں لکھنوی انداز' دستر خوان کا

بھی ماتھا نہیں .... اور پھر سب' سوا یہ کہ 'گھر کی آب و ہوا معتدل' خوشگوار' سلجھے ہوئے طور طریق .... چیلے سے گرو تک سلیقہ مند' اٹھنا بیٹھنا' چلنا' بات کرنا' ہنسنا' ہر معاملے میں لے اور سر کی ہم آہنگی..!

مگر پتہ نہیں' مجھے یہ کیوں پسند ہے کہ کبھی کبھی آدمی بے سرا ہو جائے' بالکل سائنٹیفک رویہ منجمد کر دیتا ہے کبھی کبھی کا انتشار اچھا لگتا ہے' جیسے پہاڑوں' ندیوں' گھاٹیوں اور درختوں کی بے ترتیبی میں حسن ہوتا ہے۔ فطرت کی کجیوں کو بالکل ہی مفلوج کر دینے سے زندگی کی رونق ختم ہو جاتی ہے .... تو پھر' ڈاکٹر سر اٹھاتا ہے تو کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ عذرا اصغر کو حوصلے سے کام لینا چاہئے۔ سائرہ ہاشمی تو خیر توں ماں کر کے خاموش ہو گئی.....!

ہمارے ہاں منیر نیازی ہے' کبھی کبھی غلط سر پر انگلی رکھتا ہے تو کتنا اچھا لگتا ہے .... انیس ناگی بھی ہے' گھاس تو خیر کسی کو کیا ڈالے گا' تنکے کی جگالی بھی برداشت نہیں کرتا' گھر بیٹھے بیٹھے رو استاد کے حکم نامے جاری کرتا ہے تو سارے لاہور میں زندگی کی لہر دوڑ جاتی ہے۔

اب ایسی بھی کیا احتیاط و تدابیر' آدمی ڈاکٹر کیمین بن جائے اور پھر جب سے باجی بانو قدسیہ نے ادیبوں میں کمینگی کا سراغ لگایا ہے تو ہر آدمی اس کے مظاہرے پر تلا ہوا ہے' کیونکہ بقول بانو:۔

"کمینگی ایک اضافی کوالیفیکیشن ہے' جو جتنا کمینہ ہے' اتنا بڑا ادیب ہے۔"

بانو کے اعلان سے جہاں سائرہ ہاشمی کو دکھ ہوا کہ اپنی معصومیت کی وجہ سے بڑی ادیبہ نہ کہلا سکیں' وہاں مجھے خوشی ہوئی کہ خاکہ لکھتے وقت تھوڑی بہت کمینگی کا مظاہرہ کرتا ہی رہتا ہوں' یوں نہایت آسانی سے صف اول میں آ گیا ہوں.....!

ڈاکٹر آغا سہیل کے لئے لمحہ فکریہ ....؟ اب اگر بانو قدسیہ اور ان کے میاں کو بھی بڑے ادیب کہلوانے کا شوق ہے تو ظاہر ہے' کمینگی کا اعتراف بھی کرنا ہو گا

ویسے اگر بانو کے اس فارمولے کو تسلیم کر لیا جائے تو ہمارے ادب میں کمینگی

کی دوڑ شروع ہو جائے گی' میں تو بانو کے فارمولے کو اس لئے بھی تسلیم کرتا ہوں کہ اس میں آنے والی نسل کے لئے رہنمائی کا اصول بھی متعین ہو گیا ہے.... ا

اب بھاری بھرکم تخلیقات کی بھی ضرورت باقی نہیں رہی۔ بڑا ادیب بننے کے لئے تھوڑی بہت کیننگی کا نسخہ تیر بہدف ہو گا۔

تو تان یہاں آکر ٹوٹی کہ معذرت خواہانہ رویہ اختیار کرنے کا دور ختم ہو چکا ہے.... ڈاکٹر آغا سہیل کو اگلی صف میں آتا ہے یا تیسری صف میں رہتا ہے' یہ ان پر موقوف ہے.... ہم نیک و بد حضور کو سمجھاتے رہتے ہیں۔

آغا سہیل

احمد شکیل روہی

آدمی کے لئے اگر آئس برگ کا استعارہ استعمال کیا جائے تو اس کے لئے موزوں ترین آدمی ڈاکٹر آغا سہیل ہیں۔ جغرافیہ دان کہتے ہیں کہ سطح سمندر پر آئس برگ کا صرف ایک حصہ نظر آتا ہے باقی چھ حصے پانی کے اندر ہوتے ہیں سمندر کی منہ زور لہریں اس ایک حصے کو محض آئس برگ جان کر راستہ لینے کے لئے ہاتھ پاؤں مارتی ہیں مگر قطرہ قطرہ ہو کر ہوا میں تحلیل ہو جاتی ہیں۔ آغا سہیل کا چھوٹا قد سب کی نظر میں ہے لیکن ان کی شخصیت کے باقی چھ حصے جو وقت کے سمندر کی تہہ تک چلے گئے ہیں ان سے صرف وہی لوگ واقف ہیں جو خبر کے ساتھ ساتھ نظر کا علم بھی رکھتے ہیں۔

آغا سہیل آئس برگ کی طرح شانت' پر سکون' خاموش' —— نرم ایسے کہ مکھن بن کر بال کو راستہ دے دیں۔ سخت ایسے کہ پتھر ٹکرائے تو چور چور ہو جائے۔ متوازن رفتار' نہ بہت تیز نہ بہت ست' مسلسل بے کراں سمندر کو چیرتے ہوئے آگے بڑھ رہے ہیں۔ خود سر لہریں' بے ہنگم شور و غل کرتی موجیں اگر کبھی متحد ہو کر حملہ آور ہوئیں بھی تو ان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گئیں اور ہواؤں نے انہیں اٹھا کر بادلوں میں تحلیل کر دیا۔

آغا سہیل میں ایک ایسے اداکار کی صفات موجود ہیں جو ایک سے زیادہ کردار خوش اسلوبی سے ادا کر سکتا ہے۔ آئس برگ (ICEBERG) کے وہ سارے حصے جو سمندر کے پانی میں چھپے ہوئے ہیں۔ آغا سہیل نے انہیں مختلف کرداروں کے روپ دے کر زندگی کے اسٹیج پر لا کھڑا کیا ہے اور یہ تمام کردار اپنا اپنا رول بڑی خوبصورتی سے نبھا رہے ہیں۔

یونانی المیے کا آغاز ہوا تو تھیسپس (THESPIS) نامی ایک اداکار نے المیے میں مکالمے اور کردار کی بنیاد ڈالی۔ کہتے ہیں کہ تھیسپس (THESPIS) مختلف ماسک (MASK) پہن کر چالیس سے زیادہ کردار ادا کیا کرتا تھا۔ آغا سہیل نے صرف سات

کرداروں پر اکتفا کیا ہے اور یہ سارے کردار وہ مختلف ماسک پہن کر ادا کرتے ہیں۔

آغا سہیل نے انڈین پیپلز تھیٹریکل ایسوسی ایشن یعنی اپٹا (IPTA) کے زیر اہتمام بھیل رائے' بلراج ساہنی اور کامنی کوشل کے ساتھ مل کر بہت ڈرامے کئے۔ ایک دن کہنے لگے۔

"ہندوستان کی ایک بہت مشہور ہیروئن ہم میں دلچسپی لینے لگی تھی۔"

میں نے پوچھا

"نام تو بتا دیجئے"

آغا صاحب اپنا چشمہ اتار کر اپنی دائیں آنکھ ہتھیلی سے ملنے لگے اور کہنے لگے

"چھوڑیے عقیل روبی صاحب اب نام بتانے سے کیا فائدہ۔"

میں نے بھی اس لئے زور نہیں دیا کہ اب وہ بچاری بوڑھی ہو چکی ہو گی نام پوچھنے سے کیا فائدہ۔ اپٹا (IPTA) میں ڈرامے کرنے کا آغا سہیل کو ایک فائدہ ضرور ہوا۔ انہوں نے ماسک پہن کر میر تقی میر کی طرح بہت بھیس بدلے اور اپنے کردار میں ایسا ڈوب کر کام کیا کہ دیکھنے والوں نے نقل کو اصل قرار دے دیا۔ پہلا اہم' مشکل اور قابل ذکر کردار شوہر کا کردار تھا۔ کامیاب' مثالی' اور روایتی شوہر کا کردار' شادی کے بعد آغا صاحب نے دل کی طرف کھلنے والے سب دروازے بند کر لئے صرف ایک کھڑکی کھلی رکھی ان دروازوں پر نرم ہاتھوں نے لاکھ دستکیں دیں مگر آغا صاحب نے سب دروازوں پر بیوی کے نام کا قفل لگا کر چابی انہیں تھما دی جو اب تک بھابی کے پاس ہے۔

ان کا دوسرا کردار جو انہوں نے ماسک پہن کر کیا وہ باپ کا کردار ہے۔ اس کردار میں دوست کے ضمنی کردار کو شامل کر کے بچوں سے دوستی کی ہیمنگ وے کے ناول (OLD MAN AND THE SEA) کا بوڑھا بن کر اپنی اولاد کو اپنے ارد گرد بٹھایا طوفانوں سے کھیلنے کے گر بتائے' مچھلی پکڑنے کے ڈھنگ بتائے' اچھے برے کی تمیز سکھائی' اپنے تجربے کی بھٹی سے آنچ لے کر آہن نرم کو سختی سہنے کا عادی بنایا۔ پڑھایا لکھایا۔ کھیلنے کو چاند سورج دیئے۔ مختلف راستوں کی نشان دہی کی۔ اپنے ماسک سے لیکچرر' پروفیسر' ڈاکٹرز

اور انجینئر کے ماسک بنا کر مسرت' نزہت' طلعت' ندرت' محسن' مسعود' احتشام اور معارف کے چہروں پر لگا دیئے اور ان کے بازوؤں پر امام ضامن باندھ کر اپنے اپنے کردار ادا کرنے کے لئے دنیا کی اسٹیج پر چھوڑ دیا اور خود اپنے کردار کی YOUNG TO OLD ایکسٹینشن کر کے دادا اور نانا کا ملا جلا کردار کرنے لگے۔ اپنی پوتی اور نواسہ تو اسی میں ان کی حد درجہ مقبولیت اور ہر دل عزیزی اس چیز کی دلیل ہے کہ وہ اس کردار میں بے حد کامیاب ہیں۔

اپنی پوتی کو سکول' بہو اور بیٹی کو کالج پہنچا کر جب وہ ایف۔ سی۔ کالج کے ڈی بلاک میں داخل ہوتے تو وہ اپنی زندگی کے اہم اور مقدس ترین کردار کے روپ میں ڈھل جاتے۔ اور یہ ایک ذمے دار اور شفیق استاد کا کردار ہے۔ اثر لکھنوی' پروفیسر احتشام حسین' احسن فاروقی' آل احمد سرور کی صحبت سے جو حاصل کیا وہ ایمانداری سے اپنے شاگردوں میں تقسیم کرتے۔ پڑھانا اگر عبادت ہے تو آغا سہیل نے گزشتہ ساری عمر یہ عبادت کی۔ علم و فن کے موتی زبان و بیان کی طشتریوں میں سجا کر طالب علموں کے سامنے یوں پیش کئے کہ طالب علموں کی آنکھیں حیرت میں کھلی کی کھلی رہ جاتیں اور وہ سوچتے کہ فلک کے نجوم زمین پر کیسے اتر آئے۔ آغا صاحب نے ایک طویل عرصہ بنجر ذہنوں کی آبیاری کی ہے۔ ملک میں جس طرف نکل جایئے کسی نہ کسی موڑ پر' محفل میں کسی مجلس میں' کسی نہ کسی پھول سے آغا صاحب کی مہک ضرور آئی ہو گی۔ آغا صاحب کا نام سن کر کوئی نہ کوئی شاگرد تحفہ سعادت پر لب عقیدت ثبت کرتا نظر آئے گا۔ ڈرامہ' افسانہ' غالبیات' تنقید لسانیات' تحقیق' تنقید سب کچھ ان کے لب و لہجہ میں آ کر یکجا ہو گئے ہیں۔ آغا صاحب زبان کے دھنی ہیں۔ لسانیات کے ماہر ہیں۔ حسن رضوی نے کہا تھا کہ آغا سہیل اردو زبان کی ڈکشنری ہیں لیکن میں یہ کہتا ہوں کہ ان کا مقام چپ' ساکت' خاموش گتے میں جکڑی ڈکشنری سے زیادہ ہے۔ آغا صاحب ایک لسانی ادارہ ہیں بولتی ڈکشنری ہیں۔ جہاں یہ بیٹھے ہوں وہاں صرف یہی بولتے ہیں۔ باقی سب سنتے ہیں۔ بولتے اس لئے نہیں کہ ناحق زیر' زبر اور تلفظ کی گرفت میں نہ آجائیں۔

دو کردار وہ دروازہ بند کر کے تماشہ کرا دا کرتے ہیں۔ یہ افسانہ نگار اور نقاد کا گروار ہے۔ افسانہ کے کردار میں وہ شطرنج کا مہرہ نہیں کھلاڑی ہیں۔ معاشرے سے کردار چنتے ہیں۔ لفظا اپنے 'فارمیٹ اپنا' کردار دوسروں کے لیکن ان کی حرکات و سکنات پر اختیار ان کا۔ افسانے لکھتے ہیں' سنے جاتے ہیں' چھپتے ہیں اور پڑھے جاتے ہیں۔ نقاد کی حیثیت سے تنقیدیں لکھ کر لوگوں کے فنی قد کو بڑھایا ہے۔ ہمارے عہد میں فلیپ نگاری ہوائی چپل اور ایک بینڈ کے ٹرانسسٹر ریڈیو کی طرح عام اور بے وقعت ہو گئی ہے۔ لکھنے والے ادیب اور شاعر کا نام بدل کر ایک فلیپ کئی کئی کتابوں کی زینت بن چکے ہیں۔ آغا صاحب نے بھی کئی کم اہم لوگوں کے فلیپ مروت میں لکھے ہیں آخر دین کے ساتھ ساتھ دنیا بھی تو رکھنا پڑتی ہے۔

ان چھ کرداروں کا فٹ نوٹ (FOOT NOTE) یہ ہے کہ ان کے مضبوط کاندھوں پر بندوق رکھ کر بہت سے لوگوں نے نشانے لگائے ہیں۔ شرافت کی انتہا یہ ہے کہ آغا صاحب کو خبر تک نہیں ہوئی۔ مروت اور وضع داری کبھی کبھی یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ جس کا فلیپ لکھتے ہیں اسے پریس اور کاتب کا پتہ بھی بتلاتے ہیں۔ بل میں رعایت کی چٹ بھی لکھ کر دیتے ہیں۔ ڈرپوک اتنے کہ جب ان کا بیٹا مسعود سہیل ٹھیٹھ پنجابی میں مجھ سے تو تڑاک کرتا ہے تو خود ڈرتے ہیں کہ کہیں وہ میری تکریم میں کوئی الٹی سیدھی بات نہ کہہ دے۔ بڑوں کا ذکر ہو تو عقیدت و احترام کا عنوان قائم کرتے ہیں۔ چھوٹوں کی روئیداد ہو تو پیار اور محبت کے زیر عنوان بات چیت ہوتی ہے جس درخت کی جڑیں لکھنوی تہذیب کی زمین میں دور تک چلی گئی ہیں اس کی شاخوں سے اترے پھل لاہور کے لوگ مزے لے کر کھاتے ہیں۔

فرخ کا لکانے انشورنس کمپنی کی ملازمت کے دوران ایک کلرک کی ریٹائرمنٹ کی تقریب میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ ملازمت کے پہلے دن متعلقہ آدمی کے ساتھ ۲۰ برائیوں اور کمزوریوں کی جونکیں چمٹی ہوئی ہوتی ہیں لیکن جب وہ ریٹائر ہوتا ہے تو اس کی فرض شناسی اور ایمانداری ان جونکوں کو روشن جگنوؤں میں بدل دیتی ہے چنانچہ خوش خوش خالی ہاتھ دفتر آنے والا ہاتھ میں پینشن کے کاغذات لے کر گھر واپس لوٹ جاتا ہے۔

آغا صاحب گھر جا رہے ہیں۔ جو تمغوں کو جھٹکوں میں بدل کر۔ کاندھوں پر اعزازات کے فیتے لگا کر۔ ملازمت کی پگڈنڈیوں پر اتنی پھسلن ہوتی ہے کہ آدمی پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہے۔ ہر پل قدم یوں لڑکھڑاتے ہیں کہ سر پر رکھی دستار فضیلت کے بل کھل کھل جاتے ہیں۔

آغا صاحب ۳۲ سال اس پگڈنڈی پر قابل رشک اعتماد سے یوں چلے کہ نہ ان کے قدم لڑکھڑائے نہ دستار فضیلت کو جھٹکا لگا بلکہ ایسا ہوا کہ جتنی عزت لے کر آئے تھے اس سے سو گنا گھر واپس لے کر جا رہے ہیں۔

آغا سہیل کی خوشبو

ڈاکٹر محمد اجمل نیازی

ڈاکٹر آغا سہیل اب ایف سی کالج لاہور میں نہیں ہیں مگر دوستوں میں ان کے لیے والہانہ پن دیکھ کر عجیب محسوس ہوتا ہے۔ خوشی ہوتی ہے کہ اس زمانے میں کوئی شخص ایسا بھی ہے کہ وہ اپنی محبتوں کی فراوانی زمانے کی آنکھوں میں لکھ دیتا ہے' پھر اس کے پیچھے پیچھے آنے والے ان سرشاریوں سے شاداب ہوتے رہتے ہیں۔ آج بھی برادر عزیز ڈاکٹر شبیہ الحسن اور ان کے دوست ڈاکٹر آغا سہیل کو جو کچھ سمجھتے ہیں' ریٹائرمنٹ کے بعد کسی شخص کے لیے ایسی محبت کی کیفیت کم کم دیکھنے میں آتی ہے۔ یہ رشتہ کبھی دھندلاتا نہیں۔ یہ ایک ایسا دریا ہے کہ بارش رک بھی جائے تو پانی کم نہیں ہوتا۔

جن دنوں آغا صاحب ایف سی کالج میں صدر شعبہ اردو تھے تو مجھے ان کے ساتھ کام کرنے کا موقعہ نہیں ملا' مگر ایک انجانی وابستگی تھی کہ جو ہم دونوں میں قائم رہی۔ میں ان سے ملتا تو لگتا کہ جیسے میں ان کے ساتھ کام کرتا ہوں وہ اس بات کے خواہشمند رہے کہ میں ان کے پاس چلا جاؤں آج بھی ان کی آواز کی محبت میرے دل میں اترتی ہے کہ جب بھی وہ مجھے دیکھتے تو کہتے کہ "پٹھان کا وعدہ تو وعدہ ہوتا ہے" مگر ان دنوں گورنمنٹ کالج کی محبت میرے وجود میں ایسی سمائی ہوئی تھی کہ وہاں مشکل حالات کے باوجود میں نے وقت گزارا اور ایف سی کالج میں اس وقت آیا جب آغا صاحب جا چکے تھے مگر اس ماحول میں ان کی موجودگی کی آسودگی رچی بسی ہوئی تھی۔ ان کی آواز کا راز فضاؤں میں تحلیل ہوتا ہوا اب بھی محسوس ہوتا ہے۔

وہ بہت نرم خو' ٹھنڈی چھاؤں جیسے انسان ہیں۔ محبتوں کو ہواؤں کی طرح عام کرتے ہیں۔ مگر جہاں تربیت کا معاملہ آئے تو وہاں ان کی مستحکم شخصیت ایک اور طرح سے ظہور کرتی ہے شخصیت سازی میں انہیں کمال حاصل ہے اور یہی ایک مثالی استاد کا کردار ہے اور آغا صاحب واقعی ایک صاحب کردار استاد ہیں۔ طالب علموں کی راہنمائی سے بڑھ کر شعبہ میں جو استاد ان کو عزیز ہوا' اس کو بھی زندگی کا دوست بنانے کے لئے انہوں نے

کبھی بخل سے کام نہیں لیا۔ اپنے ساتھیوں اور رفیقوں کو آگے لانے' انہیں آگے بڑھانے میں آغا صاحب بہت فراخ دل ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ اپنے رفیقوں کی کامیابی کے اندر انہیں اپنی کامیابی کی خوشبو محسوس ہوتی ہے۔ ایسے لمحوں میں ان کی آنکھیں چمکتی ہیں تو ان کے چہرے پر بھی اجالا قیام کرتا ہے اور وہ بالکل بچوں کی طرح خوش ہوتے ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ کوئی ان کے پاس جا کر دور ہوا ہو مگر جو لوگ ان کے پاس رہے' انہیں ہمیشہ زندگی میں درد بانٹنے کا پاس رہا۔ آغا صاحب کی ایک اور ادا جو مجھے کھینچ کھینچ کر ان کے پاس لے جاتی ہے' وہ ان کی گفتگو کا خوبصورت لہجہ ہے۔ وہ دل سے بولتے ہیں۔ ان کے طرز تخاطب میں ایک لاڈلا اسلوب کہیں سے در آتا ہے۔ وہ کبھی اپنے جذبات کا کھلم کھلا اظہار نہیں کرتے۔ ایک ربط ضبط ان کی شخصیت کا حصہ ہے' انہیں اپنی کیفیتوں پر بھی کنٹرول ہے۔ مگر دوسرے کو لگتا ہے کہ جیسے ڈاکٹر صاحب تو اس کے اپنے ہیں اور جب بھی موقعہ آیا تو سب سے زیادہ فائدہ ان سے اسی کو پہنچے گا اور ایسا ہی ہوتا ہے۔ کسی کو نقصان پہنچانے والی بات انہوں نے کبھی سوچی ہی نہیں۔ ہمیں یہ تو معلوم تھا وہ کس کس کو پسند کرتے ہیں مگر یہ مشکل سے بھی معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کسے ناپسند کرتے ہیں؟ یہ نہیں کہ ان کے ہاں پسند و ناپسند کا کوئی تصور ہی نہیں مگر وہ اپنی ناپسندیدگیوں کے اظہار میں بہت احتیاط سے کام لیتے ہیں۔

صدر شعبہ کی حیثیت سے انتظامی امور سرانجام دینا بھی ان کی ذمہ داری تھی' اس معاملے میں وہ مشاورت کو فوقیت دیتے تھے مگر جب ایک بار کوئی فیصلہ کر لیتے تو پھر قول فیصل کی طرح اس پر ڈٹ جاتے' کبھی نہیں ہوا کہ انہوں نے کسی کاغذ پر دستخط کر دیئے ہوں اور پھر اس کے اوپر عبارت بدلی جا سکے۔ ان کی شخصیت کا یہ انداز بھی بہت استقامت والا ہے اور محبت و راہنمائی وہی شخص کر سکتا ہے جو صاحب استقامت ہو۔ ایف سی کالج میں انہوں نے ایک زمانہ گزارا مگر کسی ایک لمحے کی آنکھ میں بھی ان کے لئے کوئی ایسا ویسا تاثر تلاش کرنا ممکن نہیں۔ مجھے معلوم نہیں کہ کامیاب استاد کیا ہوتا ہے' مگر ایسا استاد دیکھنا ہو تو ڈاکٹر آغا سہیل سے مل لیجئے۔

جہاں تک ان کے علمی و ادبی اعزازات کا تعلق ہے تو اس حوالے سے بھی وہ

بہت معزز انسان ہیں۔ ناول، افسانہ، تنقید، اور تحقیق ان کے خاص میدان ہیں۔ انہوں نے سفرنامہ بھی لکھا اور یہ ثابت کر دیا کہ سفرنامہ "ام الاصناف" ہے۔ وہ جانتے تھے کہ تخلیق کے ماخذوں میں سے سفر اور خواب کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ انہوں نے پوری زندگی سفر کرتے ہوئے اور خواب دیکھتے ہوئے گزاری۔ آج بھی کسی ادبی موضوع پر سلیقے کی گفتگو کرنے والا آدمی مطلوب ہو تو ان چند لوگ میں سے ایک ڈاکٹر آغا سہیل بھی ہیں۔

آغا صاحب کو دو شہروں سے پیار ہے، لاہور سے اور لکھنؤ سے۔ لاہور میں وہ رہتے ہیں لکھنؤ ان کے اندر رہتا ہے۔ انہیں لکھنؤی تہذیب کا ایک سچا نمائندہ سمجھا جاتا ہے۔ مگر اس نمائندگی میں بھی لاہور کی تہذیب و ثقافت انہیں کبھی بھولی نہیں۔ آغا صاحب ان لوگوں میں سے ہیں کہ جنہوں نے زندگی کو اعتبار دیا ہے اور پھر خود وہ ایسے اعتبار کے قابل ہوئے کہ ان سے آنکھیں بند کر کے ہاتھ ملایا جا سکتا ہے۔ میں اگر یہ کہوں کہ اب ایسے لوگ کم سے کم ہوتے چلے جا رہے ہیں تو یہ ہرگز مبالغہ نہ ہوگا۔ آج بھی پیاس رکھنے والے لوگ ان سے رجوع کرتے ہیں اور وہ ایسے لوگوں کی تشنگی کچھ اور بڑھا دیتے ہیں۔ میں جب پہلی بار آغا صاحب سے ملا تھا تو مجھے محسوس ہوا کہ ان کے ساتھ بار بار ملنا چاہئے۔ میں اب ان سے اس طرح تو نہیں ملتا مگر مجھے یہ احساس ہے کہ وہ لاہور میں موجود ہیں۔ میں انہیں یاد کرتا ہوں تو ان سے مل لیتا ہوں اور ان کی خوشبو مجھے دیر تک اپنے حصار میں لے رہتی ہے۔

آغاجی

محمد ظہیر بدر

نام ڈاکٹر آغا سہیل' عمر ۶ جون ۱۹۹۳ء کو ساٹھ سال' جائے پیدائش لکھنؤ' قد قدرے چھوٹا۔ ادبی قد کے برعکس' پسندیدہ لباس سفاری سوٹ' اس کثرت سے پہنتے ہیں کہ یونیفارم کا گمان ہوتا ہے۔ صاف ستھرا رنگ' جس میں سرخی کی آمیزش نے انہیں گوراچٹا ہونے سے بچا رکھا ہے' مگر یہ سرخی سانفرو بیٹا کی کرامت نہیں' صحت کی علامت ہے۔ مزاج تصنع اور بناوٹ ایسے جملہ عناصر سے پاک' گفتگو میں لکھنوی پرکاری اور دہلوی سادگی کا باوقار امتزاج' لہجہ وہی یعنی لکھنوی لکھنوی سا' داڑھی مونچھ صاف ... کلین شیو بلکہ نیٹ اینڈ کلین شیو--- سر کے بال آدھے سے کہیں زیادہ' سفید اور آہستہ آہستہ مزید سفیدی کی طرف مائل ہیں۔ کبھی آنکھوں پر خاصی حد تک موٹے شیشوں والی عینک کا قبضہ تھا مگر کنٹیکٹ لینز (Contact Lans) کے بعد چہرے کی صورت حال خاصی واضح ہو گئی ہے اور آپ کی آنکھیں سہلاتے رہنے کی عادت بھی کھل کر سامنے آگئی ہے۔ احتراماً لوگ آپ کو آغا صاحب کہتے ہیں' مگر پیار سے آپ کو آغاجی کہہ کر مخاطب کیا جاتا ہے۔

آغاجی کی نسبی نسبت ددھیال و ننھیال کے حوالے سے لکھنؤ اور دہلی سے ہے۔ تعلی و تفاخر ان دونوں دبستانوں کا خاصہ ہے۔ اہل پنجاب کو انہوں نے ہمیشہ ش ق اور روزمرہ محاورہ کی غلطی کا مرتکب قرار دیا اور ان کی اردو کو کبھی حرف معتبر سے نہیں نوازا۔ ان کا خیال رہا ہے کہ اردو وہی ہے' جو دہلی و لکھنؤ میں بولی' لکھی اور سمجھی جاتی ہے۔ مگر آغا جی کا خیال اس کے برعکس ہے آپ ہر علاقے میں بولی جانے والی اردو کو اردو قرار دیتے ہیں۔

اسی کے عشرے میں جب کراچی میں لسانی بنیادوں پر ایک سیاسی گروہ منظم ہوا' جسے حضرت رئیس امروہوی جیسے زبان آور اور ہمہ پہلو ادبی شخصیت کی ہمدردیاں بھی عملاً حاصل تھیں' مقصد یہ تھا کہ پاکستان میں اردو بولنے والی آبادی (جس کی کراچی اور

سندھ کے چند شہروں میں قابل ذکر اکثریت ہے) کو الگ قومیت تسلیم کروا کے ان کے حقوق کا تحفظ کیا جائے۔ ان پر آغا جی نے اہل زبان ہوتے ہوئے حلقہ احباب میں برملا طور پر اس نظریے کی مخالفت کی۔ آپ کا کہنا تھا کہ پاکستان میں بسنے والے تمام لوگ اپنی مادری زبان کے بعد اردو ہی کو وسیع تر ذریعہ اظہار سمجھتے ہیں۔ اردو بولتے ہیں' لکھتے ہیں' بلکہ اہل پنجاب تو اردو کی محبت میں اپنی مادری زبان (پنجابی) کو بھی پیچھے چھوڑ گئے ہیں۔ آغا جی کا یہ کہنا بھی بجا ہے کہ یہ اردو زبان کو محدود کرنے کی سازش ہے' زبان زمین سے ناطہ توڑ کر کتابوں کے قبرستان میں دفن ہو کر رہ جاتی ہے' ابلاغ اور اظہار کا موثر ذریعہ نہیں رہتی۔ آغا جی نے بعض خانگی نوعیت کے معاملات طے کرتے وقت بھی اپنے قول و فعل سے اہل زبان کے متعلق اس تاثیر کی نفی کر دی ہے کہ وہ خود کو اور اپنی زبان کو اعلیٰ و ارفع خیال کرتے ہیں۔ آغا جی کے فرزند بزرگ پروفیسر محسن سہیل جن سے میرے گھرے بے تکلفانہ مراسم ہیں' میرے ساتھ اور اکثر دوستوں میں وہ بھی پنجابی ہی بولتے ہیں۔ آپ کے صاحبزادے ڈاکٹر مسعود سہیل کو بھی میں نے (سروسز ہسپتال میں) اپنے مریضوں سے نہایت لاہوری لہجے میں پنجابی بولتے ہی پایا ہے۔ آغا جی کو دیگر اہل زبان لوگوں کی طرح یہ فکر لاحق نہیں کہ ان کے بچوں کی زبان "خراب" ہو رہی ہے۔ لسانی حوالے سے آغا جی کی شخصیت کے اس پہلو کا ذکر تفصیلاً اس لئے ضروری تھا کہ جب بھی کسی ایسی شخصیت کا ذکر آتا ہے تو ذہن میں اس کے بارے میں ایک روایتی سا تاثیر بن جاتا ہے' مگر آغا جی کی شخصیت ان روایتی "خصوصیات" سے عاری ہے۔

اب آیئے آغا جی کی شخصیت کے پیشہ ورانہ اور فنکارانہ پہلوؤں کی طرف۔

گورنمنٹ ایف سی کالج میں آپ کی شخصیت کے دو پہلو ہیں۔ صدر شعبہ اردو اور استاد ادبیات اردو۔ ایسے اساتذہ کا تذکرہ اب تذکروں میں ہی رہ گیا ہے۔ جن کے تبحر علمی سے طلبہ بجا طور پر مستفید اور اخلاص و اخلاق و کردار سے مستفیض ہوتے ہیں۔ مگر معدودے چند کہ جو اقدار کی شکست و ریخت کے باوجود بچ رہے ہیں۔ ریاست علمی کے بے تاج بادشاہ ہیں' مگر بے تاج بادشاہ کی آسانی سے پہچان مشکل ہے۔ آغا جی کے ساتھ بھی

یہی مسئلہ درپیش ہے۔ میں نے آغا جی سے بہت کچھ سیکھا ہے مگر ہمارے درمیان استاد اور شاگرد کا رشتہ نہیں ہے بلکہ میرا تعلق آپ سے نیازمندانہ ہے۔ وہ میرے شعبے کے سربراہ اور میں ان کے شعبے میں ایک ماتحت استاد' جسے کبھی کبھار وہ بدرکامل کہہ کر پذیرائی بخشتے ہیں۔

بہرحال ریاست علمی کے اس بے تاج بادشاہ کی تلاش کا کٹھن فریضہ میں ان کے حقیقی معنوں میں شاگرد رشید صدرم شعبہ محترم پروفیسر شبیہ الحسن کے لئے چھوڑتا ہوں۔ مگر جہاں تک شعبہ اردو میں آغا جی کے ساتھ کام کرنے کا موقعہ ملا ہے' میں نے ہمیشہ انہیں طلبہ کی تعلیم و تدریس اور تکمیل نصاب کے سلسلے میں فکرمند پایا ہے بالخصوص ایم۔ اے (اردو) کلاسز کے لئے۔

ابھی پچھلے ماہ کی بات ہے قومی اسمبلی کی تحلیل کے نتیجے میں پیدا ہونے والی سیاسی بے یقینی کی فضا میں ہر کوئی ملکی مستقبل کے بارے میں فکرمند تھا۔ مگر آغا جی کو اس وقت بھی اپنے طلبہ کی پڑی ہوئی تھی۔ بڑے فکرمند لہجے میں فرمایا:۔

"سیاسی بے یقینی کی فضا ہے' ہڑتالیں ہوں گی جلسے جلوس....."

"جی ہاں! ملکی معیشت پر اس کے برے اثرات پڑیں گے۔"

کسی نے لقمہ دیا' مگر آغا جی نے اس کی ان سنی کرتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی:۔

"..... میں سوچ رہا ہوں کہ سال پنجم اور ششم کا ابھی کافی نصاب باقی ہے۔ اگر ہنگاموں' ہڑتالوں کی صورت میں کالج بند ہو گئے تو ان کا نصاب کیسے ختم ہو گا۔"

آغا جی کا افسانہ نگار کے طور پر مقام متعین کرنا میرے اختیار اور فرائض میں داخل نہیں۔ میں نے بحیثیت قاری ان کے بیشتر افسانے وقتاً فوقتاً پڑھے ہیں۔ "افق تا بہ افق" سفرنامہ نہیں پڑھا۔ ان کے بارے میں' میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ "اچھے ہیں" کہ ایک قاری اس کے سوا اور کیا کہہ سکتا ہے۔ مگر آغا جی کی تنقید و تبصرے کے بارے میں' میں یہ کہے بنا نہیں رہ سکتا کہ مقدمہ نگاری اور خلیب نگاری میں آغا جی بھی دیگر نقادوں سے کم نہیں

نہیں ہیں۔ دور حاضر میں اکثر نقادوں نے اپنے اسی "فن" کے بل بوتے پر اپنے اپنے ادبی گروہ بنا رکھے ہیں (ایسے نقادوں کا تفصیلی تذکرہ میں اپنے ایک انشائیے۔ "خداوندان ادب سے" میں کر چکا ہوں) البتہ آغا جی نے یہ فن شاید نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کے لئے اختیار کر رکھا ہے' کیونکہ ان کے اردگرد نئے لکھنے والوں کی ایسی کوئی انجمن نہیں' جسے "ستائش باہمی" کے زمرے میں لایا جاسکے۔

لطائف اور لطائف نما واقعات آغا جی کی گفتگو کے قابل ذکر مشمولات ہیں' بعض اوقات اپنے اساتذہ کے واقعات سنا کر ایک طرف تو ان کی تحسین کا فرض ادا کرتے ہیں تو دوسری طرف موجودگان محفل کے لئے تفنن طبع کا موقع فراہم کرتے ہیں۔ مگر آپ کی اس خصوصیت کا حیران کن پہلو یہ ہے کہ بعض اوقات آپ ان لطائف سے تنقید و تحسین کا کام بھی نکال لیتے ہیں اور بعض بار ایسا بھی ہوا کہ کسی تقریب میں لوگ آپ کے تاثرات سننے پر مصر ہیں' مگر آپ نے موقعہ کی مناسبت سے ایک آدھ لطیفے میں ہی گلو خلاصی کرالی۔

آغا جی عربی کا یہ مقولہ اکثر دہراتے رہتے ہیں کہ: "الانسان مرکب من الخطاء والنسیان"

"یعنی انسان خطا اور بھول کا پتلا ہے۔"

چنانچہ خود بھی اس مقولے کا فائدہ اٹھاتے ہیں اور دوسروں کو بھی فائدہ اٹھانے کا موقعہ دیتے ہیں۔ تحمل اور برداشت آغا جی کی شخصیت کا اہم وصف ہے' جسے کام میں لانے کے لئے آپ نے کبھی بخل سے کام نہیں لیا۔ دوران ملازمت بحیثیت صدر شعبہ آپ کے بعض فیصلوں اور اقدامات کے نتیجے میں اختلافی صورت حال بھی پیدا ہوتی رہی ہے' مگر آپ کی معاملہ فہم اور متحمل مزاج شخصیت کے باعث ہر اختلاف بالآخر حسن اختلاف پر منتج ہوا۔

آغا جی کا قلم ساتھی اساتذہ کے خلاف ایک لفظ بھی ایسا لکھنے سے قاصر رہا ہے' جو مستقبل میں نقصان کا باعث ہو۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ آغا جی کیسے سربراہ ہیں تو میں پہلے بھی کہتا رہا ہوں اور یہاں بھی اس کا اعادہ کر رہا ہوں کہ اس کا فیصلہ نئے آنے

والے سربراہ شعبہ کی کارکردگی سے ہی کیا جا سکے گا۔

آغا جی سے آج تک ہونے والی ہر ملاقات' چند ایک کو چھوڑ' رسمی نوعیت کی تھی' جس میں تدریسی نصاب امتحانات اور اوقات کار کی تقسیم پر بات ہوئی۔ جو چند ایک ملاقاتیں غیر رسمی نوعیت کی ہیں' ان ملاقاتوں میں بھی ادھورے پن کا تاثر نمایاں ہے کہ کبھی وہ پریڈ کے لئے درمیان گفتگو اٹھ گئے اور کبھی میں۔ یہ سطور آغا جی کے ساتھ انہی ادھوری ملاقاتوں کے تاثرات پر مبنی ہیں۔ چنانچہ یہاں مجھے یہ دعویٰ ہرگز نہیں ہے کہ آغا جی کی ذات کا بھرپور عکس پیش کر رہا ہوں البتہ یہ کہنے میں مجھے باک نہیں کہ جب آغا جی کا مکمل خاکہ لکھا جائے گا تو اس میں آغا جی کے ان خدوخال کی جھلک بھی نمایاں ہو گی' جو ان سطور سے ابھرے ہیں۔

سرکاری ملازمت میں ریٹائرمنٹ کا اذیت ناک لمحہ بھی آتا ہے۔ چند روز قبل میں نے آغا جی سے کہا:

"آغا جی! آپکا جانا' بڑا عجیب سا لگ رہا ہے" جواباً" فرمایا:۔ "معمول کی کارروائی ہے۔"

آغا جی نے ریٹائرمنٹ سے دو اڑھائی سال قبل ہی یہ بیان جاری کر دیا تھا کہ میں توسیع ملازمت کے سخت خلاف ہوں۔ لہٰذا میں Extension نہیں لوں گا۔

قرآن پاک میں مومن کی بابت ارشاد ہے۔

"لما تقولون مالا تفعلون"

"جو کہتے ہو کرتے کیوں نہیں۔" آغا جی نے جو کہا سچ کر دکھایا۔ یوں آپ کے مومن ہونے میں کچھ شک باقی نہیں رہتا۔ آپ نے نہایت حقیقت پسندی سے ریٹائرمنٹ کو گلے لگایا۔ آج سے چھ برس پہلے آغا جی نے مجھے ایف سی کالج لاہور میں خوش آمدید کہا تھا' جب کہ میں آج چھ برس بعد انہیں "خدا حافظ" کہہ کر وہ "بدلہ" چکا رہا ہوں۔

خوش آمدید سے خدا حافظ تک کا یہ دورانیہ اپنے اندر واجب الاحترام اور قابل تقلید یادیں' عنایتیں اور شفاعتیں سمیٹے ہوئے ہے۔ بہرحال ہر کسی کا اپنا مقام ہے اور

اپنے کام میں ہر کوئی مجبور ہے۔

یہ وقت کا جبر نہیں تو اور کیا ہے کہ کل آغا جی مجھے ایف سی کالج میں خوش آمدید کہنے پر مجبور تھے اور میں آج ایف سی کالج سے خدا حافظ کہنے پر مجبور ہوں۔'

افسانه

⊛ افسانہ

آغا سہیل کے افسانے

فنی پس منظر کا ایک جائزہ

ڈاکٹر محمد علی صدیقی

پچھلے دنوں انتظار حسین کے "شہر افسوس" کا چرچا ہوا اور آج تک ان کے نئے افسانوں کے مواد اور ہیئت پر مختلف آرا اس انداز سے آ رہی ہیں' جیسے افسانہ نے پھر سے اہمیت حاصل کر لی ہو۔ پرانی نسل کے افسانہ نگاروں نے ایک مدت سے چپ سادھ لی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے تخلیقی سوتے خشک ہو چکے ہیں۔ لیکن احمد ندیم قاسمی' میرزا ادیب' خدیجہ مستور اور انتظار حسین اب تک فعال ہیں' کچھ نئے بھی سامنے آئے ہیں اور اب افسانہ کا مستقبل نوجوانوں ہی سے وابستہ ہے۔

انتظار حسین تو واردات کے اسیر ہیں اور مغربی یوپی کے تہذیبی پس منظر سے ہم آہنگ ہو کر غزل کی داخلیت والی فضا سے خوب رس نچوڑ رہے ہیں۔

اس مضمون میں ہم آغا سہیل کے افسانوں پر گفتگو کر رہے ہیں۔ آغا سہیل بھی "ماضی" کی یادوں میں گرفتار تو ہیں لیکن داخلی کیفیات سے زیادہ خارج کی ٹوٹ پھوٹ کے اثرات رقم کرنے پر زور دیتے ہیں۔

آغا سہیل کے افسانوں کے پس منظر پر لکھنے سے پہلے ایک اطمینان ضرور تھا کہ نہ وہ بڑے افسانہ نگار ہیں اور نہ میں اہم نقاد۔ اس طرح آغا سہیل کو اس سرد مہری سے سابقہ نہیں پڑے گا' جو بڑے نقادوں کا حصہ ہے۔

ہوتا یہ ہے کہ مستند نقاد اپنے نئے اور کم معروف ہم عصروں پر اس لئے پوری توجہ صرف نہیں کرتے کہ ایسا کرنا قبل از وقت نہ ہو۔ ہونا یہ چاہئے کہ نقاد نئے تخلیق کار کی کاوشوں کے پس پردہ تازہ تر جذبہ تخلیق کو سمجھنے کے لئے جدید ترین علوم سے تخلیق اور اس کی فہم کے درمیان اجنبی اور اچھوتے مفاہیم کی تفہیم کے لئے امتزاج اور ارتباط کے پل بناتے ہوئے چلے۔ اس کا بنیادی منصب ادب' فلسفہ' سماجیات' نفسیات' علم الانسان' معاشیات اور دیگر علوم کے درمیان رشتوں اور معاملات کو سمجھنا ہو' وہ علوم کے درمیان

مغائرت کو کم کرے اور مفاہمت کو بڑھائے۔ لیکن ہمارے مستند نقادوں نے اپنے عہد کے کم معروف اور غیر معروف ادیبوں کو کم معروف اور غیر معروف نقادوں کے ذریعہ سمجھنا شروع کیا ہے۔ غالباً پرانے نقادوں کا نئے نقادوں کے لئے اس سے بہتر خراج تحسین ممکن بھی نہیں۔ حیرت کا مقام ہے کہ آغا سہیل پچھلے پچیس سال سے افسانے لکھ رہے ہیں' لیکن ان کے فن پر بہت کم لکھا گیا ہے۔ ان کے افسانے برصغیر کے مقتدر رسالوں میں جگہ پاتے رہے ہیں اور اس طرح ان پر مدیروں اور قارئین کا اعتماد جھلکتا ہے۔ آغا سہیل کے افسانوں میں ماضی کی افسردہ جھلکیاں ہیں اور ماضی کی صحت مند اقدار کی موت پر نوحے بھی ہیں۔ آغا سہیل کے یہاں زبان وبیان کا خاص التزام بھی ہے۔ ان کے ترقی پسندانہ آدرش کو دیکھتے ہوئے کہنا پڑتا ہے کہ ان کے یہاں اناپرستانہ' مافوق الفطری یا لاشعوری موضوعات کی رس نوشی سے شعوری طور پر گریز ہے۔ وہ جس ماضی کو یاد کرتے ہیں' اس سے حال اور مستقبل کو بہتر طور پر سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ انسان کے ان دکھوں کا مرقع پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں' جو ان کے چہروں پر جھلک آیا ہے۔ اس مضمون میں آغا سہیل کے افسانوں کے پس منظر کے بارے میں سرسری سی گفتگو مقصود ہے۔ ایک مختصر سے مضمون میں قطعیت کے ساتھ صرف اپنے تاثرات ہی کا اظہار کیا جاسکتا ہے۔ پہلا برملا اعلان تو یہ ہے کہ آغا سہیل ہرگز کوئی اہم یا عظیم افسانہ نگار نہیں' لیکن وہ ایک ایسے افسانہ نگار ضرور ہیں جو اہم اور عظیم موضوعات سے گتھم گتھا ہیں اور بعض اوقات ہم اپنی سادہ دلی میں ان موضوعات سے پنجہ لڑانے والوں ہی کو اہم اور عظیم سمجھ بیٹھتے ہیں۔ عظیم موضوعات پر لکھنا اور اپنے کرداروں کے نفس میں اتر جانے کی کوششیں بہت سے افسانہ نگار کرسکتے ہیں' لیکن اپنے کرداروں کی صداقت اور ان کے ساتھ یک رنگ نظر آنے کا التباس ہی عظیم ادب تخلیق کرتا ہے۔ دوستوفسکی اور ٹالسٹائی اسی لئے عظیم ہے کہ وہ بقول سارتر اپنے کرداروں کا شاہد بھی نظر آتا ہے اور ساتھی بھی۔ اس نے اپنے کرداروں کی دنیا کو اپنے کاندھوں پر اٹھایا ہوا ہے اور قاری ہر صفحہ پر اس امر کی گواہی دیتا رہتا ہے۔ گو داخلیت پسند اور انسانی بہیمیت کی عکاسی کو پسند کرنے والے دوستوفسکی کے حق میں رائے دینا پسند

کریں گے۔

آغا سہیل کے پچھلے چند سالوں کے افسانوں میں تجربیت کے رد عمل میں صاف اور سادہ قصہ گوئی کی طرف راغب ہونا' ایسا ہی تھا' جیسے آج کے مغربی ادب میں ورجینا وولف کی شعوری رو اور جنگ عظیم دوم کے بعد والے ادب سے فیوچر ازم کے خلاف جابجا بغاوت ملتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ڈکنس اور شارلٹ برانٹے کے زمانہ کا قاری دوبارہ پیدا ہو گیا ہے۔

لیکن جب ۱۹۳۸ء میں ان کا پہلا افسانہ "راشی الوارث" کے سیماب نمبر میں سہیل ادیب کے نام سے طبع ہوا تو اس سے دو تین باتیں ضرور محسوس ہوئی تھیں۔ ایک یہ کہ وہ شعوری طور پر ادب کے سماجی نصب العین پر یقین رکھتے ہیں' اس لئے جذبہ سے زیادہ فکر کو اور بے ساختگی سے زندگی کی منصوبہ بندی کو (جسے اشتراکی حقیقت پسندی کہہ لیجئے) اپنے فن میں جگہ دیں گے ان کے سامنے گورکی کی تحریریں تھیں اور ایک ابتر سماج تھا' جو بزعم خود آزاد تھا' لیکن غیر مرئی سامراجی بندھنوں میں جکڑا ہوا تھا۔ آغا سہیل اپنے استاد پروفیسر احتشام حسین مرحوم سے بے پناہ متاثر رہے ہیں اور وہ ابھی تک ادب کے سماجی منصب کے قائل ہیں۔ ہمارے ملک کے عوام کی پس ماندگی' بے شمار سماجی معاشی بیماریاں اگر ایک ادیب کو سیاسی طور پر فعال رہنے پر مجبور بھی نہ کر سکیں' تو پھر ادیب اپنی لاتعلق اور خاموشی سے شجر زندگی کی پامالی میں برابر کا شریک ہو جاتا ہے۔

آغا سہیل نے جہاں نظریہ کی اہمیت کو سمجھا' وہاں فن کے نکات اور رموز پر بھی کماحقہ توجہ دی وہ کبھی بھی ایسے ادیب نہیں رہے' جن کے پاس نظریہ ہی نظریہ ہو اور فن کے نام پر صرف عجز فن۔ ایسے لوگوں سے نتیجتاً محیر العقول قلابازیاں سرزد ہوتی ہیں' جن کو "جدیدیت" کے خانے میں ڈال دیا جاتا ہے۔

۱۹۵۶ء تک آغا سہیل' سہیل ادیب کے نام سے لکھتے رہے' تاوقتیکہ ایک شاعر سہیل ادیب کی وجہ سے افسانہ نگار سہیل کو اپنا مادر دانشوری پس منظر یاد آیا اور وہ ضرور تاً آغا سہیل ہو گئے۔ اس وقت تک وہ ۲۵' ۳۰ افسانے لکھ چکے تھے اور آج جب ان کے

افسانوں کی تعداد دو سو سے تجاوز ہو چکی ہے' وہ ابھی تک نظریہ اور فن کے بارے میں کافی رجائی ہیں۔ حالانکہ اِس دور نے اچھے سے اچھے رجائیوں کو بھی قنوطیت میں مبتلا کر رکھا ہے اور ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ کہیں حزن اس عہد کا طاقتور جذبہ نہ بن جائے۔ آج اقدار شکنی عروج پر ہے اور بہت سے مقدس مثالیے پاش پاش ہو رہے ہیں۔ خود ترقی پسندوں کی نئی جمالیات میں فرد کی داخلیت پسندی اور معاشرتی گھٹن کی عکاسی کو سماجی اور معاشی تجزیات کے لئے بہت اہم گردانا جا رہا ہے۔ لیوکیکس (Lukacs) اور مارکیوز (Marcuse) نے سماجی شعور کے مباحث میں ایسے بہت سے چور راستوں کی موجودگی کو منظور کر لیا ہے' جو پچھلی نسل کے ترقی پسندوں کو یکسر منظور نہیں تھے۔ خود روس میں مایاکوفسکی کی شاعری کی پذیرائی کا گراف بہت دلچسپ ہے۔ انقلاب سے پہلے وہ ایک علامت نگار شاعر کے روپ میں ملتے ہیں' جو زار شاہی کے سنسر سے بچنے کے لئے اشاروں اور کنایوں میں باتیں کرتا ہے اور سارے روسی ادب کو دریا برد کر دینے پر مصر ہے۔ انقلاب کے بعد وہ معتوب ٹھہرتے ہیں۔ ان کی جدیدیت کو مریضانہ قرار دیا جاتا ہے اور اب اسٹالن کے بعد وہ پھر اپنی پوری شکل میں ہمارے سامنے ہیں۔ آج ماسکو میں وجودی فلسفہ کی اصطلاحوں کو بھی نئی وقعت مل رہی ہے۔

اس پس منظر میں ترقی پسند آغا سہیل کے افسانوں میں تہذیبی المیہ کی عکاسی قابلِ دست اندازی محتسب نہیں۔ ہمارے درمیان ایک پوری نسل ہے' جو ماضی سے بالکل کٹی ہوئی ہے۔ اس نسل کو ان قربانیوں کا علم ہی نہیں' جو انسانوں نے اپنے آدرشوں کے لئے دی ہیں۔ یہ نسل پورے ماضی کو لایعنی اور قابلِ دریا برد گردانتی ہے۔ ایسے ماحول میں جب ماضی بیزاری کا حال کی گمرہی اور مستقبل کی بے نویدی سے سابقہ ہو۔ غالباً "کیا تھا۔" "کیا ہے" اور "کیا ہوگا؟" کی تفہیم کے لئے ضروری ہو گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ماضی کے دریچوں میں وہی جھانکیں گے' جن کے یہاں ماضی اور حال کے درمیان لکیر کھینچ چکی ہو۔ نئی نسل ابھی خود اپنی تلاش میں ہے' اس کے پاس نصب العین تو ہیں لیکن ان کے حصول کے لئے خاطر خواہ پروگرام نہیں۔ آغا سہیل کے افسانوں میں "ماضی" بہت اہمیت رکھتا ہے۔ ماضی کی یادوں کے اسیر افسانوں میں "پنچھا" "ہار" "موئے آتش دیدہ" "بدلتا ہے رنگ آسماں" نہ

"محل سرائے"۔ "ناگن" "من ماں راکھوں من براجے۔" قابل ذکر ہیں۔

ان افسانوں کو ان کے ناول "غبار کوچہ جاناں" کے ساتھ ایک ہی سلسلے میں پڑھا جائے تو ہمیں انداز ہو گا کہ آغا سہیل اپنی نوجوانی و جوانی کے لکھنؤ کی سماجی اتھل پتھل کو کس دردمندی کے ساتھ محفوظ کر رہے ہیں۔ وہ انسانی رشتوں کو ایک خاص انداز سے دیکھتے ہیں۔ ایک طرف ان کا ترقی پسندانہ نقطہ نظر شکست و ریخت کی صورت میں تعمیر کے امکانات دیکھتا ہے اور دوسری طرف حال کی ابتری پر کڑھتے ہوئے ملتے ہیں۔ میرے خیال میں اگر آج کے ادب کو "کلاسیک" کی منزل پر فائز ہونا ہے۔ تو ہمیں انسانی رشتوں کی نزاکت اور ماحول سے فرد کی انسیت کو خاطر خواہ اہمیت دینی پڑے گی۔ ادب اور زندگی کے ارتباط پر زور دینے کا یہ مطلب نہیں نکالنا چاہئے کہ ادب اور زندگی میں مغائرت اور ادب اور زندگی کے درمیان کامل اتحاد کے درمیان کوئی اور درجہ باقی نہیں ہے۔

ٹالسٹائی نے اپنے شہرہ آفاق ناول "War And Peace" میں اپنے قومی دشمن نپولین کے ساتھ جس طرح کا برتاؤ کیا ہے' وہ سماجی مورخین کے لئے چیلنج نہیں ہے لیکن فنکاروں کے لئے زندگی اور فن کے درمیان لطیف فرق کو سمجھنے کے لئے بہت ضروری ہے۔ اشروڈ کے ناول "گڈ بائی ٹو برلن" میں کتنی سیاست ہے اور کتنا ادب۔ پاسترناک کے "ڈاکٹر ژواگو" کو اگر سولزینیشین کے "اگست ۱۹۱۴ء" کے ساتھ پڑھیں تو کیا ہم افواج زار کی حماقتوں یا انسانی رشتوں کی پامالی پر قہقہے ماریں گے؟

آغا سہیل کے سماجی افسانوں میں "رشوت" "سمور دار کوٹ۔ "پرچم"۔ "ٹوٹی چٹنی"۔ "آخری مورچہ"۔ اور "بازی گر" اچھے افسانے ہیں۔ لیکن ان افسانوں میں پیغام اور افادیت کافی واضح ہیں۔ ادب میں پیغام بین السطور ہی میں اچھا لگتا ہے۔ ایک طویل عرصہ کی مستقل ناسپاسی کے بعد آغا سہیل نے جدید افسانہ نگاروں کے تتبع میں کچھ جدید افسانے بھی لکھے' جن میں "سہ پہل" "شگاف در" اور "ڈبویا مجھ کو" ان افسانوں میں "میں" بہت اہم ہے۔ تیزی سے بدلتی ہوئی دنیا میں اقدار شکنی کی وبانے اس شخص کو بہت مجروح کیا ہے جو خوابوں کی شکستگی کے خیال سے ہی رو پڑتا ہے وہ آدمی آج تنہا ہے اور آج

بھی اس کا واحد سہارا وہی آدرش ہے جو سماجی شعور میں فقدان اور سیاسی بے ضمیری کی وجہ سے گراہ رہا ہے۔

آغا سہیل کے افسانوں میں جو بات کھٹکتی ہے وہ یہ ہے کہ بعض اوقات وہ ایسے کرداروں کا انتخاب کرتے ہیں جو اس حد تک مریضانہ ذہن کے ہوتے ہیں کہ اگر ان کرداروں کے خالق کو معاون مان لیا جائے تو پھر آغا سہیل کو اپنی نظریاتی بے راہروی کا ازالہ فن کی بساط پر مہتم بالشان کمال دکھا کر کرنا چاہئے تھا۔ جس طرح نظریاتی مواد کے ساتھ فنی لوازمات کا پلہ بھی بھاری رہنا چاہئے صرف رومانس یا صرف نظریاتی مواد آغا سہیل کو راس نہیں آتا۔ اس لئے ان کے اچھے افسانے وہی ہیں' جہاں وہ مواد اور فنی مہارت کا بہترین امتزاج پیش کرتے ہیں۔ ایسے افسانے "موئے آتش دیدہ" "بدلتا ہے رنگ آسماں۔" "من ماں راکھوں من براجے" "کنجی" (دسمبر ۱۹۷۱ء کی جنگ کے پس منظر میں) "سہ پہل" "شگاف در" اور "ذبویا مجھ کو" ہیں۔ میں نے آغا سہیل کے پچھلے دس بارہ سال کے افسانوں کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے۔ ان کی افسانہ نگاری کے شروع دس سال کے افسانہ نگاری کا یہی دور سب سے اہم بھی ہے اس دور میں انہوں نے شروع زمانہ کی جذباتیت پر قابو پایا ہے میلو ڈرامہ کے چنگل سے کافی باہر نکلے ہیں اور اس میں کوئی کلام نہیں کہ آغا سہیل ان چند قابل ذکر افسانہ نگاروں میں سے ہیں' جنہوں نے بزرگ افسانہ نگاروں کی گھنی چھاؤں میں بڑھنا شروع کیا ہے۔ وہ گھنی چھاؤں آج تک موجود ہے' لیکن نئی نسل کے افسانہ نگاروں نے اپنے لہجہ میں بات کرنے کا ڈھنگ نکالا ہے۔ آغا سہیل ان میں سے ایک ہیں لیکن ان کا لہجہ ایک بزرگ آدمی کا لہجہ ہے۔ ان کے افسانے بھی ان کی طرح "شریف زادے" ہیں۔

آغا سہیل ---- زندگی اور وقت کا عکاس

ڈاکٹر محمد علی صدیقی

آغا سہیل ان چند افسانہ نگاروں میں سے ہیں جنہوں نے تقسیم برصغیر کے ذرا بعد ہی یعنی ۱۹۴۸ء سے افسانے کی دنیا میں قدم رکھا لیکن شاید انہوں نے افسانے کو یا افسانے نے خود ان کو ۲۵۔۲۰ سال بعد ہی سنجیدگی کے ساتھ قبول کیا۔

آغا سہیل جو ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۳ء تک سہیل ادیب تھے۔ گزشتہ چالیس برس سے افسانے' ناول' تنقید اور تحقیق کی دنیا میں داد تخلیق و تنقید اور تحقیق حاصل کر رہے ہیں وہ گزشتہ دو دہائیوں بالخصوص ۱۹۷۷ء سے ۱۹۹۰ء کے دوران ایک پختہ کار فکشن نویس کے طور پر سامنے آئے ہیں۔ وہ غالباً اس وقت تک چند اچھی کہانیاں تخلیق کر چکے ہیں جن کی بنیاد پر فکشن کا ہر انصاف پسند نقاد ان کے فن کی خوبیوں پر داد تحسین دینے پر مجبور ہے۔

یہ عجیب بات ہے کہ جب اس ملک میں جمہوریت کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلی جا رہی تھی اور ہمارے ادباء کا ایک معتدبہ حصہ آمریت اور استبداد کے دور کو "تقدیر" کی طرح اٹل اور غالباً اپنے فن کے لئے بھی نظریہ ضرورت سمجھ بیٹھا تھا آغا سہیل جیسے فکشن نویس نے (کہ وہ اگر کچھ اور نہ ہوں تو ایک خوبصورت اسٹائل کے مالک ادیب تو بہر طور قرار پائیں گے) زندگی اور فن کے تقاضوں کو پورا کیا۔ نظریاتی اور فنی طور پر درست رہنے میں ان کے مدمقابل بہت کم ہیں۔ بعض حضرات بہ صورت الزام بھی یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ آغا سہیل اب تک اردو کے اہم تہذیبی مرکز لکھنؤ کی معیاری زبان کو اپنے سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔ انتظار حسین بھی کھڑی بولی کے علاقے کی سکہ بند زبان لکھتے ہیں۔ ابوالفضل صدیقی بھی دو آبہ گنگ و جمن کی مخصوص زبان لکھا کرتے تھے۔ لیکن پاکستان کی حد تک آغا سہیل لکھنؤ کی نثر پر ماہرانہ دسترس رکھتے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ لکھنؤ کی زبان اور کلچر کے بارے میں ان کی "معیار پسندی" نے ۱۹۴۸ء سے ۱۹۷۰ء تک کے عرصے کے آغا سہیل کے باب میں "زبان و بیان کا رومان" قرار دینے میں معاونت کی ہو۔ آغا سہیل لکھنؤ

کی زبان کے متشدد وکیل ہونے کی وجہ سے خاصے متنازعہ اسلوب نگارش کے حامل سمجھے جاتے رہے ہیں۔ وہ ایک مدت تک ترقی پسند رہتے ہوئے بھی ترقی پسندوں کے لئے سکہ بند نہ ٹھہر سکے۔ رومانی اسلوب کے خوگر ہوتے ہوئے رومانوی نہ ٹھہر سکے اور "جدیدیت" کے میدان میں قدم رکھ چکنے کے بعد جدید نہ کہلائے جا سکے کیونکہ انہوں نے مواد اور ہیئت کے باہم لازم و ملزوم ہونے کی شرط پوری کرتے ہوئے بھی اپنے ہم عصروں کے یہاں "زبان" کی لغزشوں پر صاد نہ کی اور وہ اس باب میں تاریخ کی طرح اپنی بات پر ڈٹے رہے۔

آغا سہیل "جدیدیت" کو ایک اسلوب نگارش کے بجائے ایک نقطہ نظر سمجھتے ہیں اور وہ ان چند افسانہ نگاروں میں سے ہیں جنہوں نے جدیدیت کی درست توضیح و تشریح کی ہے اور یوں انہوں نے جدیدیت کو محض ہیئت اور ادبی زبان کو چیستاں ہونے سے بچانا چاہا ان کے جدید افسانوں میں سہ پہل 'شگاف در' اور ڈبویا مجھ کو' میں واحد متکلم کا صیغہ بہت مختلف انداز میں استعمال ہوا ہے۔ آغا سہیل کے بعض افسانے "واضح مقصدیت" کے رجحان کے علمبردار ہوتے ہوئے بھی اپنے عہد جوانی کی رومانیت کے تابع نظر آتے ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ نوجوان آغا سہیل پختہ عمر کے آغا سہیل پر جذباتی طور پر تا ایں دم حاوی ہے۔ غالباً یہ ہی وہ "زندگی کی تڑپ اور ترنگ" ہے جو آغا سہیل کے کسی افسانے میں بھی معذرت خواہ نہیں ہے۔ وہ عمر کے ہر حصے میں شباب کی سرمستیوں سے زندگی کی تڑپ کشید کرتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ آغا سہیل کے یہاں دور دور تک مریضانہ روش (MORBIDITY) نظر نہیں آتی نتیجہ یہ ہے کہ مریضانہ روش کے رسیا قارئین اور نقادان کی ترقی پسندی' رومان پسندی اور جدیدیت سب ہی پر حیران ہوتے ہیں۔ وہ بھول جاتے ہیں کہ مرض پسندی فن نہیں ہے بلکہ فن کے راستے میں ایک رکاوٹ ہے۔ یہ بذات خود ایک نقطہ نظر ہے جو شاہد اور مشہود کو کچھ سے کچھ بنا دیتا ہے۔ چلئے یہ بھی فنکار کا حق تسلیم کیا جا سکتا ہے لیکن فن بدترین خواہشات سے آگہی کے بجائے بدترین خواہشات کے پس پشت غیر انسانی جذبات کی انشراح کا کام کرتا ہے تاکہ قارئین کے یہاں شعوری سطح پر صحت مند انسانی جذبات و ردعمل کے لئے گنجائشیں پیدا کی جا سکیں اور یہی غالباً زندگی افروز قوتوں

کے ساتھ ہمدردی اور اشتراک کی ایک صورت ہے۔

اکثر نقادان فن آغا سہیل کے یہاں ایک بہت ہی مختلف فکری وفنی رویئے کو وقت گذراں کے ساتھ بدلتی ہوئی اقدار کے آئینے میں نہ دیکھ پائے اور اس طرح آغا سہیل اپنی ناگزیریت (INEVITABILITY) کے ساتھ منتقل نہ ہو سکے۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ آغا سہیل کو بدلتے ہوئے وقت کی چیرہ دستیوں پر نالہ وشیون کرنے والوں کی مرقع نگاری پر خود نالہ وشیون نہ کرنے کی داد ملتی لیکن تیس سال بعد آغا سہیل کچھ ترقی پسندوں کے لئے روایتی اور ادبی اقدار سے چمٹے ہوئے غیر ترقی پسندوں کے لئے ترقی پسند اور جدید حضرات کے لئے جدیدیت کے فلسفے کے یکسر خلاف ادیب کی حیثیت اختیار کر چکے تھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ تینوں حلقوں کی جانب سے ان کے باب میں تحفظات ہی ان کے فن کی اصل داد ہیں۔

زندگی خاصی خود رائے ہے۔ وہ ہر طرح کے مفروضات کے خلاف علم بغاوت بلند کرتی رہتی ہے۔ آغا سہیل نے اپنے پورے کیریئر میں بلند آواز ترقی پسند لہجے میں صرف چند افسانے لکھے ہیں لیکن ان کے بیشتر افسانوں کے مطالعے سے یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ ان افسانوں میں زندگی کی تفہیم کے علاوہ اور کون ساجذبہ موجزن ہے۔ وہ اپنے افسانوں میں معمے حل کرتے نظر نہیں آتے۔ صرف اوراق زندگی پلٹتے نظر آتے ہیں۔ آغا سہیل کی مضبوط فنی گرفت کی حامل بیانیہ کی تکنیک میں نہ رومان تھا' نہ نالہ وشیون' نہ گریہ اور نہ حزن صرف بیان میں بیان اور بین السطور میں ہونے (BEING) سے ہو جانے (BECOMING) کی ناگزیریت پر قدرے ملال لیکن تاریخی "سچ" اور معروضیت کی بالادستی کا احساس ہمہ وقت حاوی رہتا ہے۔

دیکھنا یہ ہے کہ کیا ناگزیریت کا تاریخی سچ آغا سہیل کے دو اہم ہم عصروں اور قدرے سینئر ہم عصروں' قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین کے افسانوں میں موجود ہے؟ میں ان افسانہ نگاروں سے آغا سہیل کا تقابلی مطالعہ کرنا نہیں چاہتا۔ قرۃ العین حیدر کا اہم ترین موضوع برصغیر کی حالیہ تاریخ (تقسیم برصغیر) اور وقت ہے۔ وہ تاریخ اور وقت کو ایک دوسرے کے آئینے میں دیکھتی ہیں اور ریزہ ریزہ ہوتی حسیت میں تبدیل ہو جاتی ہیں وہ تو

آزاد پاکستان میں مشرق وسطیٰ کی طرف جھکاؤ کے رجحان کو غیر فطری سمجھتی ہیں اور تو آزاد بھارت میں ہندو کلچر کی "بنیادوں" کی طرف مراجعت سے یکساں "خطرہ" محسوس کرتی ہیں اور پھر وقت کے ساتھ ساتھ ان دو مہیب رجحانات سے بچاؤ کی صورت "تصوف" کے استھانوں سے "شانتی شانتی" کی صداؤں میں ڈھونڈتی ہیں۔ (گردش رنگ چمن "بطور "چاندنی بیگم") وہ جو کچھ ہو رہا ہے اس کا مذاق اڑاتی ہیں۔ جو کچھ ہو رہا ہے وہ مایا بھی ہے اور ہمارے فکری "گناہوں" کا لابدی نتیجہ بھی۔ یہ احساس ایک نوع کے پچھتاوے سے مل جاتا ہے۔ انتظار حسین کے یہاں بھی زمانہ حال ماضی کی "علامتوں" کے زوال کا دور ہے۔ ماضی میں بڑا سکھ چین تھا۔ حال اس سکھ چین کی ضد ہے۔ کیا یہ بذات خود غیر تاریخی نقطہ نظر نہیں ہے جسے تاریخی قرار دے کر تاریخ کو اذیت ناک ثابت کیا جا رہا ہے۔ اگر تاریخ اذیت ناک ہے تو پھر ماضی میں حال کے لئے جدوجہد موجودہ اذیت ناکی کے لئے تھی یا بہتر مستقبل کے لئے اگلا قدم تھا۔ قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین کا مسئلہ ادبا کی ایک بھاری جمیعت کا مسئلہ ہے۔

پاکستان کی تشکیل بہر طور مسلمانان پاک و ہند کے لئے ایک قومی وطن کے قیام کی جدوجہد سے عبارت تھی۔ اس جدوجہد کی کامیابی برصغیر کے مسلم اقلیتی صوبوں کی مکمل تائید کے بغیر ممکن نہ تھی۔ ——— جب صورت حال یہ ہو تو پھر تقسیم برصغیر کو فسادات' ہلاکت عظیم اور انتقال آبادی کے اس مہیب چکر سے گزرنا پڑا جس سے منٹو' قاسمی' بیدی' خواجہ عباس' کرشن چندر' ہاجرہ مسرور' قدرت اللہ شہاب' خدیجہ مستور' ناصر کاظمی' احمد مشتاق' منیر نیازی' ابن انشاء' حفیظ جالندھری' رئیس امروہوی' ضیاء جالندھری اور درجنوں دیگر ادباء و شعراء سے اس دور کی آشوب ناکی پر بڑی درد انگیز تمثالیں تخلیق کرائیں۔ اس حقیقت میں کلام نہیں کہ تخلیق پاکستان کی حقیقت آج کے تنگ نظر علاقائیت پرست حضرات کے مفروضات اور نظریات تاریخ سے مختلف ہے۔ یہ ملک کروڑوں افراد کے لئے ملک موعودہ رہا ہے اور ہے۔ تاریخ خواہشات کی ناز برداری کا فریضہ انجام نہیں دیا

کرتی۔ پاکستان وہی ارضِ وطن ہے جو ۱۹۴۷ء تک کی مسلم برصغیر کی قوم پرستانہ جدوجہد کا نتیجہ تھا۔ آغا سہیل کے افسانوں میں قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین کے برخلاف المیہ پاکستان' پاکستان کے مثالیہ سے روگردانی کا نتیجہ ہے اور بدلتا ہے رنگ آسمان (۱۹۷۵ء)' شہرنا پرساں (۱۹۸۳ء)' اور تل برابر آسمان (۱۹۸۶ء) بعض نانوں بالوں کے اندر ملک کی دو نیمی اور مثالیہ پاکستان کی ناکامی لازم و ملزوم ہیں۔ آغا سہیل کے ایک طاقتور کردار کے اس غم کی نمائندہ' افسانہ اور "ٹھکانہ کہیں نہیں" کی کردار طاہرہ باجی ہیں۔ افسانہ نگار کا نقطہ نظر طاہرہ باجی کے کردار میں واضح طور پر جھلکتا ہے۔

آغا سہیل ۱۴ اور ۱۵ اگست کو ظہور میں آنے والے ممالک پاکستان و ہندوستان کی تاریخی و جغرافیائی حقیقتوں کو تسلیم کرتے ہوئے بہ زبان فنکار بار بار یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ کیا دونوں ممالک کی آزادی خوفناک اور روح فرسا تمثالوں کی صورت میں طلوع ہونی تھی؟ نہیں۔ یہ سب کچھ زیادہ مہذب طریقے پر بھی ممکن تھا؟ یہی آغا سہیل کا داعیہ ہے۔

میں اس مضمون میں جسے اگست ۱۹۷۳ء میں ماہنامہ افکار میں شائع شدہ مضمون "آغا سہیل کے افسانے فنی پس منظر کا ایک جائزہ" پر نظرثانی قرار دیا جاسکتا ہے' آغا سہیل کے افسانوں کا ایک ذاتی محاکمہ پیش کرنا چاہتا ہوں۔ آغا سہیل ۱۹۵۰ء سے ۱۹۷۳ء تک اردو افسانے کے طویل قوس پر ایک ایسی جگہ موجود نظر آتے ہیں جو اپنے رنگ اور مقام کے لحاظ سے خاصا الگ تھلگ بلکہ غیر جانبدار رنگ و مقام ہے۔ آج جب کہ ہر نقطہ نظر کے تحت ہونے والے (EVALUATION) کو دورِ حاضر کی عینک سے دیکھنے کا رجحان زور پکڑ رہا ہے' آغا سہیل کے تمام افسانے خواہ وہ سہیل ادیب کے نام سے لکھے گئے ہوں یا آغا سہیل کے نام سے' ہم سے ایک غیر جذباتی نظر واپسیں کے خواستگار ہیں۔ سہیل ادیب کے نام سے لکھے گئے افسانے کسی مجموعے میں شامل نہ ہوسکے اور آغا سہیل کے افسانے بھی ایک کڑے انتخاب کے مرحلے سے گزرے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ان افسانوں کا بنیادی حوالہ انسان ہیں۔ انسانی سماج ہے۔ سماج کے اندر مصروف کار کرداروں کے رویئے ہیں۔ یہ رویئے اچھے برے یا اخلاقی طور پر غیر جانبدار ہیں۔ میرے پہلے مضمون کے سالِ اشاعت

تک آغا سہیل کی افسانہ نگاری میں ۱۹۷۱ء کے بعد کا وہ موڑ چپکے چپکے سامنے آ رہا تھا جسے میں نے اس وقت بھی آغا سہیل کی افسانہ نگاری کا سب سے اہم دور قرار دیا تھا اور ۱۹۷۳ء کے بعد آغا سہیل کا گراف میری توقع کے عین مطابق مسلسل اوپر ہی گیا ہے۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ ایک قاری نے جس رجحان کو اہم ترین قرار دیا ہو وہی رجحان افسانہ نگار کی زندگی کا اہم ترین رجحان ثابت بھی ہو جاتا ہے۔ ۱۹۷۳ء کے بعد آغا سہیل کے افسانوں کے مندرجہ ذیل مجموعے شائع ہوئے۔ بدلتا ہے رنگ آسماں (۱۹۷۷ء)

شہر نا پرساں (۱۹۸۳ء) اور قل برابر آسمان (۱۹۸۶ء) اور یوں لگتا ہے کہ آغا سہیل نے اپنے افسانے "ڈبویا مجھ کو" سے جس سفر کا آغاز کیا تھا وہ "کھڑکی" (مشمولہ شہر نا پرساں) تک آتے آتے اپنا دائرہ مکمل کر چکا ہے۔

اس حقیقت میں کوئی شک نہیں کہ آغا سہیل کی افسانہ نگاری میں ملک کے دو نیم ہونے سے ذرا قبل ۱۹۵۸ء کے مارشل لاء کے وقت ہی بنیادی تبدیلیاں نمودار ہونی شروع ہو چکی تھیں۔ آخر ایسا کیوں نہ ہوتا؟ جو ملک ۱۹۴۷ء میں مسلمانان ہند کی علیحدہ قومیت کے تصور کی بنیاد پر قائم ہوا تھا اور جسے مسلمانان برصغیر کی ۱۹۴۶ء کی دستور ساز اسمبلی کے انتخابات کے مطابق سو فیصد تائید حاصل تھی وہ ۱۹۵۴ء ہی سے بیورو کریسی کے طالع آزماؤں کے چنگل میں اس بری طرح پھنسا کہ ۱۹۵۸ء میں جمہوریت کا وہ "ڈراما" بھی ختم ہو کر رہ گیا' جس کے مطابق افواج کو سویلین حکومت کے تابع ہونا تھا۔ حیرت کی بات تھی کہ ملک کی پہلی مارشل لاء حکومت کے دور میں ادارہ تعمیر نو نے "پاک جمہوریت" کے نام سے جو کتاب شائع کی تھی اس میں مولوی عبدالحق' شاہد احمد دہلوی' ممتاز مفتی اور ابن انشاء جیسے ادباء نے بنیادی جمہوریت کے فلسفے کی حمایت کی تھی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے ملک کے ادباء کی غالب اکثریت بلالحاظ زبان و علاقہ نے ۱۹۵۶ء میں مساوی نمائندگی PARITY کے غیر جمہوری اصول پر خاموشی اختیار کی تھی اور یہی خاموشی ۱۹۶۲ء کے غیر جمہوری آئین میں مساوی نمائندگی کے اصول کا ساتھ دے کر اختیار کی گئی تھی۔ آغا سہیل کے افسانوں میں اس دور کے دیگر باضمیر افسانہ نگاروں اور شاعروں کے تتبع میں صرف جمہوریت دوستی ہی

کا رویہ کار فرما نظر نہیں آتا بلکہ ہم دیکھتے ہیں کہ آغا سہیل فرزند زمین (OF THE SOIL SON) کے نعرے کی غیر انسانی دوستی کے رخ کی مذمت کرتے ہیں۔ "ٹھکانہ کہیں نہیں" میں ایک کردار اس ہنگامہ دار و گیر کی اس طرح وضاحت کرتا ہے کہ "جو قیادتیں ابھر رہی تھیں وہ سر بسر جذباتی تھیں اور مٹی کا بیٹا یعنی سن آف دی سوائل کے نعروں پر امن کی قیادت کی دکان چمک رہی تھی۔" (صفحہ ۱۲۳ ابد لتا ہے رنگ آسماں) جبکہ ظاہرہ باتی اسلام کے قومی فلسفے کے حامی تھیں اور ظاہر ہے کہ یہ مسلم لیگی تصور قومیت کے عین مطابق تھا' لیکن آمریت اور جمہوریت کی رسہ کشی نے ارفع تر آدرشوں کو پس پشت ڈال دیا تھا۔

آغا سہیل اپنے کرداروں پر اپنا نظریہ زندگی تھوپتے ہوئے نظر نہیں آتے۔ ان کے کرداروں میں ہر طرح کے افراد ہیں۔ ان میں سے بہت سے کردار قاضی عبدالستار کو مرغوب ہونے چاہئیں اور بہت سے انتظار حسین کو۔ کچھ سکہ بند ترقی پسندوں کے لئے وسیلہ اظہار بننے کی بے پایاں صلاحیت رکھتے ہیں۔ لیکن آغا سہیل ان تمام کرداروں سے اس طرح برتاؤ کرتے ہیں جیسے کہ وہ سب ان کی توجہ کے یکساں طور پر مستحق ہوں۔ ان کا سیاسی نظریہ ان تمام کرداروں میں بٹا ہوا ہے اور یہی ان کی خوبی ہے کہ وہ کسی ایک کردار کے ساتھ کلی یا جزوی طور پر یک جان ہوتے ہوئے بھی آزاد ہیں اور نتیجہ آفرینی کی منزل میں نسبتاً زیادہ سچی صداقتوں کے طرفدار نظر آتے ہیں۔ وہ ایک ایسا فنکار ہے جس کے لئے فن اور زندگی کے مابین مسابقت کے بجائے اشتراک عمل پر زور ملتا ہے چونکہ اشتراک عمل کے دوران ہی سچ اور جھوٹ الگ الگ ہو جاتا ہے۔

آغا سہیل کے ابتدائی افسانے بگڑے رئیسوں میں پائی جانے والی تکلیف دہ "خود شعوری" (SELF CONSCIOUSNESS) کے مسئلے سے دوچار ہیں۔ یہ وہ عمل ہے جس کے ذریعہ کامیاب عمل جراحی ممکن ہے جب کہ دوسروں کی "خود شعوری" کے بارے میں ہمدردی اور ترحم کے احساسات تلے رقم کی گئی تحریریں زبردست تخلیقی قوت ہی سے ممکن ہو پاتی ہیں۔ مصنف جس لمحے اپنے جذبہ ہمدردی کو بے نقاب کر دیتا ہے اس لمحے "جذباتیت" ٹپکنے لگتی ہے اور آغا سہیل نے ایسے مواقع پر زبان و بیان پر اپنی قدرت سے

ممکنہ فائدہ اٹھایا ہے اور وہ کم سے کم الفاظ میں سب کچھ کہہ جاتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ بعض جگہ وہ ضرورت سے زائد وضاحت سے کام لینے پر مائل نظر آتے ہیں اور یہ غالباً اس داستانی ماحول کی بدولت ہے جو ان کی گھٹی میں پڑا ہے اور جسے وہ شعوری طور پر ہی جھٹک سکتے ہیں۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ جہاں جہاں آغا سہیل نے جدیدیت کی ٹیکنیک کا سہارا لیا ہے۔ وہ بہت کامیاب رہے ہیں۔ اگر بیانیہ کی سادہ اور پر کار ٹیکنیک پر قدرت حاصل ہو سکے تو پھر "جدیدیت" کی ٹیکنیک بیک وقت غیر ضروری تفصیلات سے پہلو تہی اور قاری پر بھرپور اعتماد پر منتج ہوتی ہے۔

آغا سہیل نے لاہور میں ایک ایسے زمانے میں بیانیہ اور روایتی ٹیکنیک پر زور دیا جب لاہور میں فیض' راشد اور میراجی کی زبان بھی روایتی ٹھہر رہی تھی اور یوں معلوم ہو رہا تھا کہ افسانہ نگاروں میں صرف انور سجاد اور انور سجاد کے بعد شاید انتظار حسین ہی غیر روایتی زبان کے وکلاء کے لئے قابل تقلید ٹھہریں گے۔

لاہور کی دیکھا دیکھی ہندوستان میں بھی "شب خونی جدیدیت" کا غلغلہ بلند ہوا اور اس طرح مروجہ زبان ہی کا مستقبل خطرے میں پڑ گیا' منٹو' کرشن' بیدی' قاسمی' غلام عباس اور عصمت محض اپنے ایک ایک افسانے کی بدولت ادب عالیہ کے ایوان میں زندہ رہنے کا حق مانگتے نظر آ رہے تھے۔ جب صورت حال یہ ہو تو پھر آغا سہیل بقائے دوام کے لئے ایک افسانہ بھی کہاں سے لاتے۔ آغا سہیل نے اپنا شاہکار جدید افسانہ "کھڑکی" ۱۹۷۷ء کے مارشل لاء کے بعد لکھا لیکن یہ عجیب بات ہے کہ یہ افسانہ آغا سہیل کی محبوب ٹیکنیک کا افسانہ نہ تھا۔ وہ اس افسانے میں ایک ایسے پہلو دار کارٹونسٹ نظر آئے۔ جیسے کہ فیکا FEICA اگر اس کارٹونسٹ سے پہلے کے دور کو دیکھیں تو آذر زوبی کے یہاں انتہائی کفایت سطری کا عمل۔ یہ افسانہ ایک انتہائی شدید سیاسی جذبہ کا حامل ہے جس کی بدولت انسانیت پادر ہوا معلوم ہونے لگی تھی۔ انسانیت کی پامالی کی علامت۔ فل بوٹ اور پھر ایک آواز کے ساتھ وہ کھڑکی سے باہر تھا۔ ایک "نامردانہ" غصے کا اظہار لیکن تزکیہ نفس کے لئے ضروری اقدام۔

آغا سہیل نے جدید تکنیک میں بہت کم افسانے لکھے لیکن وہ بیانیہ کی خوبیوں کے ساتھ ساتھ کفایت لفظی کی نیکی سے بھی بخوبی واقف ہیں۔ وہ روایتی بیانیہ تاریخی پس منظر میں لکھے گئے بیانیہ داستانی بیانیہ حقیقت پسندانہ کردار نگاری اور بطون ذات کے مونو لوگ کی تکنیک پر قدرت رکھتے ہیں لیکن ان کا خاص رنگ تفصیلات سے عاری' تجریہ کا عکاس' جدید مونو لوگ ہے۔ شاید آغا سہیل اپنے رنگ خاص کی "عمومیت" سے خائف ہوں لیکن میرا خیال ہے کہ ہر تخلیقی فن کار کی زندگی میں ایک ایسا وقت آتا ہے جب وہ صرف اشارے کرتا ہے اور مطلوبہ رنگ اور از خود اپنی اپنی جگہوں پر دوڑ پڑتے ہیں۔

آیئے اب ہم مختصراً۔ بدلتا ہے رنگ آسمان (۱۹۷۵ء) شہر نا پرساں (۱۹۸۳ء) اور رقص برابر آسمان (۱۹۸۶ء) میں شامل اہم افسانوں کا ایک سرسری جائزہ لیں تاکہ آغا سہیل کے بارے میں بعض نقادوں کی آراء سے قطع نظر خالصتاً۔ ہم عصری حسیت کے حوالوں سے بات کی جاسکے۔ ہم عصری حسیت کے تعینات بڑی حد تک معروضی ہوسکتے ہیں اور جب تک تنقیدی فیصلے معروضی نہ ہوسکیں اس وقت تک وہ تاثراتی ہی معلوم ہوتے ہیں۔

اگر آغا سہیل کے فن کے گراف کا اندازہ افسانوں کے مجموعوں کی ترتیب کے لحاظ سے لگایا جائے تو "بدلتا ہے رنگ آسمان" سے ہمارے مطالعہ کا آغاز ہے۔ یہ مجموعہ ۱۹۷۵ء میں شائع ہوا۔ "بدلتا ہے رنگ آسماں" میں ۲۴ افسانے شامل تھے۔ چھنگا' سہ پہل' رشوت' رشتہ' ٹوٹی چینی' بازی گر' ٹھکانہ کہیں نہیں' سمور دار کوٹ' آخری مورچہ' شگاف در' مالکن' من ماں راکھوں' موئے آتش دیدہ' پان' پرچم' کنجی' بدلتا ہے رنگ آسماں' ڈبویا مجھ کو' محل سرا' قوم' دعا' زبان خنجر اور آخری ہاتھ۔

مندرجہ بالا افسانے ۱۹۵۵ء سے ۱۹۷۴ء تک لکھے گئے افسانوں میں سے منتخب کیے گئے تھے۔ ان افسانوں میں روایتی افسانے بھی ہیں۔ اودھ کی تہذیب کی عکاسی کرنے والے افسانے بھی جن میں چھنگا' ٹھکانہ کہیں نہیں' بدلتا ہے رنگ آسماں' موئے آتش دیدہ' مالکن اور محل سرا کا تعلق کسی نہ کسی طرح "یادوں" کے خمیر میں گندھا ہوا ہے' لیکن جو وصف آغا سہیل کو یادوں کے دوسرے "فنکاروں" سے ممیز کرتا ہے وہ حقیقت پسندی اور

معروضیت سے فکری لگاؤ ہے جس کی وجہ سے وہ بعض انسان دوست اقدار کے حوالے سے ماضی کو اچھے رنگوں میں بھی تصور کرنے کی صلاحیت حاصل کر پاتے ہیں۔ لیکن اس مرقع نگاری کے باوجود ان کی فکر کا غالب رجحان عہد حاضر کو زیادہ روشن اور زیادہ جمہور دوست گردانتے میں صرف ہوتا ہے۔ اور یہ وہ رجحان ہے جو قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین اور "شام اودھ" کے خالق ڈاکٹر احسن فاروقی کے زاویہ ہائے نگاہ کے برعکس ہے۔ اس مجموعے کا ٹائیٹل افسانہ "بدلتا ہے رنگ آسماں" جاگیرداری نظام پر گہرا طنز ہے۔ رسولن ہاجی اپنی بچی بسم اللہ کو نانپارہ کی نوابی حویلی سے مفرور دیکھنا چاہتی ہے تاکہ وہ اپنی مرضی کے خلاف "تحفہ اتروائی" کی رسم سے محفوظ رہ سکے۔ اس کی نگاہیں افسانے کے ہیرو مخدوم پر پڑتی ہیں اور ایک دلچسپ کش مکش کے بعد بسم اللہ مخدوم ہی کے حصے میں آتی ہے۔ لیکن جذباتی لگاؤ کے نتیجے میں بالآخر ریل گجمی پر غالب آجاتی ہے اور بسم اللہ نانپارہ کے جاگیردارانہ ماحول سے شہر کی آزاد فضاؤں کی جانب روانہ ہو جاتی ہے۔

"موئے آتش دیدہ" بھی ایک اہم افسانہ ہے۔ واحد متکلم لکھنؤ میں گزاری ہوئی آخری رات کی ذہنی کیفیت پیش کرتا ہے لیکن جو بات اٹھارویں صدی کے آصف الدولہ سے شروع ہوئی ہے وہ اس دور کے آصف الدولاؤں پر ختم ہوتی ہے۔ اس افسانے میں بیسویں صدی کے روشن دور کی آگہی کی دہائی دی گئی ہے اور اس طرح مندرجہ بالا دونوں افسانے آغا سہیل کو ماضی کا نوحہ گر بنانے کے بجائے ماضی کی لوح پر الوداعی کلمہ لکھنے والے افسانہ نگار کے روپ میں پیش کرتے ہیں۔

دونوں افسانوں میں ادعایت سے گریز کیا گیا ہے اور مجموعی طور پر جذباتیت سے ممکنہ حد تک دور رہا گیا ہے۔ اس مجموعے میں ترقی پسندی کا واضح ایقان اور ولولہ لئے ہوئے افسانے بھی موجود ہیں۔ جیسے ٹوٹی چنی اور دعا' سانحہ مشرقی پاکستان کے پس منظر میں لکھے گئے بعض خوبصورت افسانے بھی آغا سہیل کے یہاں تصور قومیت کے ساتھ وابستگی کا پتا دیتے ہیں۔ شگاف در' ٹھکانہ کہیں نہیں' کنجی اور زبان خنجر' سقوط مشرقی پاکستان کے بارے میں اس دور کے ترقی پسندوں کے کچھ ہی خیالات کیوں نہ ہوں لیکن آغا سہیل کے افسانے

"درآمد شدہ انقلابات" کے تصور کے خلاف ہیں۔ ان کے بیشتر افسانے سستی جذباتیت اور غیر سیاسی نقطہ نظر سے گریزپا ہیں۔

اس مجموعے ہی سے ایک اور حقیقت سامنے آنے لگتی ہے کہ ۱۹۵۵ء سے ۱۹۷۳ء تک کے عرصے میں جدیدیت کی وہ لہر جو ۱۹۵۸ء کے مارشل لاء کے بعد پیدا ہوئی تھی اور جو ہندوستان اور پاکستان میں مختلف وجوہات کی بناء پر مسلط کی گئی تھی' آغا سہیل تک بھی آپہنچی ہے۔ اس مجموعے میں شامل افسانے سہ پہل' ڈبویا مجھ کو اور آخری ہاتھ جدید حسیت اور مواد کے لئے ہیئت تلاش کرنے کی کامیاب کوشش قرار دیئے جاسکتے ہیں۔ آغا سہیل طبقاتی گھٹن کے معاشرے میں واحد متکلم کی اہمیت سے واقف ہیں۔ اس طرح وہ "جدید" کے بارے میں اسٹیفین اسپنڈر کی تعریف کی پہلی شرط پوری کردیتے ہیں۔ پاکستان میں لکھی جانے والی نئی غزل کا شاعر اسپنڈر سے بہت پہلے "واحد متکلم" کی شاعری شروع کرچکا تھا اس سلسلے میں ناصر کاظمی' منیر نیازی' ابن انشا' ظفر اقبال' احمد مشتاق اور جون ایلیا کی شاعری کے نمونے پیش کئے جاسکتے ہیں۔ مندرجہ بالا شعرا کے یہاں واحد متکلم ۱۹۴۷ء کے آشوبناک دور کے "اجتماعی پاگل پن" کی پیداوار تھا۔ یادوں کے جلے ہوئے بسیروں سے تنہائی اور الم کا "وجودی" خمیر ہی اٹھ سکتا تھا۔ جدید غزل کے واحد متکلم نے لاکھوں انسانوں کی تباہ حالی' انتقال آبادی اور بے گھری سے جنم لیا تھا' جب کہ اسپنڈر کے یہاں جنگ عظیم دوئم کی بربادیوں سے جنم لینے والی وجودی کیفیت کا اظہار "واحد متکلم" کی صورت میں ہوا تھا' جس نے عصر حاضر کی دانش ہی کو تبدیل کرکے رکھ دیا تھا۔

آغا سہیل نے "سہ پہل" میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ شیشے کے سہ پہل سے نجانے کیا کیا تصوراتی خاکے تعمیر کئے۔ یادیں' کھردری حقیقتیں اور پھر صرف ایک سمت سے صاف شفاف اجلے اجلے منظر منظر کا سماں' یہی وہ سوال ہے جو اس قبیل کے دوسرے افسانوں "ڈبویا مجھ کو" اور "آخری ہاتھ" میں بھی توجہ طلب ہے۔ "ڈبویا مجھ کو" واحد متکلم ہجوم کے خوف سے سرپانو رکھ کر بھاگ رہا ہے کہ مبادا ہجوم میں کھڑے کھڑے دم کا ہو جائے۔ لیکن یہاں بھی معاملہ وہی ہے کہ فرامین ہیں' غرور اور گھمنڈ ہے' طلسم سامری کے

کارخانے ہیں لیکن سوئی کا کہیں پتا نہیں۔ اس افسانے میں ظلم اور زیادتی کی تمثالیں ابھرتی ہیں اور اپنا سوال دہراتی ہیں۔ یہ آخر کیا ہے 'کیوں ہے؟ متوقع جواب بھی چھپا ہوا ہے۔ ہر افسانہ بہت موثر ہے اور زبان و بیان کے ساتھ ساتھ ایک جدید فینٹیسی کی تخلیق ممکن ہو پاتی ہے۔

"آخری ہاتھ" کے واحد متکلم کو روشنیوں کے سمندر کا سامنا ہے۔ جو کبھی بطون ذات اور کبھی خارج (ظاہر) پر پڑھتا ہے۔ اس افسانے میں صنعتی عہد کے انسانیت کش رخ کی مذمت کی گئی ہے لیکن افسانہ نگار کا مطمع نظر صنعتی عہد کی ضرورت سے انکار نہیں ہے۔

"بدلا ہے رنگ آسماں" کے بعد "شہر نا پرساں" (۱۹۸۳ء) پر نظر ڈالتے ہیں۔ یہ مجموعہ شور صہبائی کے نام معنون ہے اس مجموعے میں ۲۴ افسانے ہیں عنوانات حسب ذیل ہیں۔ فاصلہ' نئی بستی' جزاک اللہ' گیوی اے بے بی' پس دیوار' سرا' ہاتھی کے دانت' سانچ کی آنچ' انا اللہ' گانٹھ' قرض' بڑا آدمی' کھویا ہوا بچہ' کارواں دل کا' اپنا آدمی' کہوں تو کھ جر جائے' شہر نا پرساں' کرسٹوفر ، لمن الملک الیوم' وقت اٹھے گا اور کھڑکی۔

یہ مجموعہ پہلے مجموعے کے آٹھ سال بعد یعنی ۱۹۸۳ء میں شائع ہوا۔ پہلے مجموعے میں آغا سہیل لکھنؤ اور لاہور کی یادوں اور تجربوں میں منقسم تھے۔ دوسرے مجموعے میں وہ نئی سرزمین میں پوری توانائی کے ساتھ اپنے پیر گڑوئے ہوئے نظر آتے ہیں۔ "شہر نا پرساں" میں لکھنؤ کی یادیں دم توڑ چکی ہیں اور ان کا ملک موعودہ اپنے مسائل کے ساتھ ان سے کومٹ منٹ چاہتا ہے۔

گزشتہ مجموعہ (بدلا ہے رنگ آسماں) میں جدیدیت اور داستانی رنگ کی ابتدا ہو چکی تھی۔ جدیدیت اور داستانی رنگ سے یکدم انتظار حسین کا خیال آتا ہے۔ انہوں نے جدید دور کی تعریف "علامتوں کا زوال" کے حوالے سے کی تھی۔ اگر وہ اس تعریف میں پرانی علامتوں کا ذکر واضح طور پر کر دیتے تو دھیان اس طرف نہ جاتا کہ وہ شاید نئے دور کی "علامتوں" سے کنی کترا رہے ہیں یا ان کے وجود ہی کے منکر ہیں۔ ہر دور کی علامتیں بھی اس

دور کے خاتمے کے ساتھ اپنے مخصوص معانی کھو بیٹھتی ہیں۔ اس شدنی پر نالہ و شیون کیا۔ یہ قانون قدرت ہے اور قانون قدرت' قدرت پر فتح پانے والوں کے لئے ایک معنی رکھتا ہے اور اس خصیانی کے خلاف طبائع کے لئے کچھ اور۔ آغا سہیل تبدیلی کو قانون قدرت کے طور پر قبول کرتے ہیں۔

اس مجموعے میں لمن الملک الیوم' شہر نا پرساں' جزاک اللہ' انا للہ اور کھویا ہوا بچہ مصنف کے ذہن کے "داستانی" افق کا پتا دیتے ہیں۔ آغا سہیل زندگی کی تفہیم چاہتے ہیں اور اس حد تک تفہیم چاہتے ہیں کہ حزن و سرشاری کے اصل اسباب بامعنی ہو جائیں۔ تخلیق کے غیر منطقی بہاؤ میں بھی ایک واضح منطق ہو سکتی ہے۔ "شہر نا پرساں" ملکی صورت حال پر موثر طنز ہے۔ مقصدیت کا عنصر غالب ہے لیکن یہ سب کچھ جس پس منظر میں ہے وہ بذات خود بہت واضح ہے۔ لمن الملک الیوم ایک اچھا افسانہ ہے۔ زینت محل اور بہادر شاہ ۱۸۵۷ء کے پس منظر میں۔ آج کی حقیقتوں سے آگہی کی ایک کوشش "وقت اٹھے گا" بھی سماجی پس منظر کی بے ثباتی سے متعلق ہے۔ اقدار کا خاتمہ اور صرف "آج" یعنی ایڈہاک ازم کے سہارے زندگی گزارنے کی ایک بے ہنگم کوشش کا مرقع۔

آغا سہیل کے دوسرے مجموعے میں سانحہ مشرقی پاکستان کے ارتعاشات بہت واضح ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ۱۹۷۱ء آغا سہیل کی فنکارانہ زندگی میں ایک اہم (SHED WATER) ہے۔ یہ سال ذہن پر ایک بھیانک سچائی' قومی خودکشی کے طور پر مرتسم ہے' سانحہ مشرقی پاکستان کے پس منظر میں "فاصلہ" بھی ایک اچھا افسانہ ہے۔ "کیوی اے بے بی" ایک اور جہت کا افسانہ ہے۔ یہ عورت کی نفسیات کے جس رخ کی مرقع نگاری کرتا ہے وہ بذات خود ایک میلو ڈراما ہے۔

اب میں افسانوں کے تیسرے مجموعے "تل برابر آسمان" (۱۹۸۶ء) کی طرف آتا ہوں جو میرے خیال میں آغا سہیل کا سب سے کامیاب افسانوی مجموعہ ہے۔ اس مجموعے میں کھڑکی اور لمن الملک الیوم بھی شامل کر لئے گئے ہیں اور اس طرح اس مجموعے میں ان دو افسانوں کے علاوہ ۱۲ نئے افسانے شامل ہیں جن کے عنوانات حسب ذیل ہیں۔

عہد زوال' جلا ہے جسم جہاں' حصار' کھڑکی' نوشتہ دیوار' قل برابر آسمان' تسیہ' لمن الملک الیوم' دابتہ الارض' روشنی' دروازہ بند ہے' بیعت' بے سمت راہیں اور نظام۔ "قل برابر آسمان" کا پہلا افسانہ "عہد زوال" داستانی لب و لہجہ میں ہے۔ اس میں موجود دور کی بے چہرگی کی مرقع نگاری بڑی کامیابی کے ساتھ کی گئی ہے۔ "نوشتہ دیوار" میں بھی عہد زوال کی فکر کا مذاق اڑایا گیا ہے۔ اس عہد نے سب کو مشینی انسان ROBOTS بنا کر رکھ دیا ہے۔ "انسانیت" کے جذبے سے تہی۔ "قل برابر آسمان" میں بھی یہی کیفیت ہے۔

واحد متکلم کھلی فضاؤں سے نکل کر تنگ و تاریک کنوئیں کے اندر دھنستا چلا جا رہا ہے ہر خارجی حقیقت تبدیل ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس مجموعے کے دیگر قابل ذکر افسانوں میں تسمہ پا اور دابتہ الارض پر بھی داستانی رنگ غالب ہے۔

متذکرہ بالا افسانوں کے مجموعوں میں شامل افسانے مختلف ٹیکنیک اور مختلف تناؤ کے تحت لکھے گئے ہیں۔ ان افسانوں میں جدید اردو افسانہ نگاری کے ارتقا کا ایک مخنی گراف موجود ہے۔ سادہ بیانیہ سے جدید ٹیکنیک کی تہہ داری تک۔ ان افسانوں میں کہانی پن بھی ہے اور کہیں صرف مونولوگ کی کیفیات۔ کہیں کہیں دھیمے پن سے سچ بولتے رہنے کی مجبوری بھی لیکن ان افسانوں میں سب سے کامیاب افسانے بہر طور سانحہ مشرقی پاکستان اور اس کے بعد کے دور کے جدید ٹیکنیک میں لکھے گئے افسانے ہیں جن میں آمریت کے دور کے خلاف واضح رد عمل موجود ہے۔

آغا سہیل نے لکھنؤ کے زوال پذیر جاگیرداری دور کی مرقع نگاری اور آمریت کے خلاف واضح رد عمل دیتے ہوئے ایک وصف کا بطور خاص خیال رکھا ہے۔ وہ کسی صورت میں کہانی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے کہ صرف اسی طرح ہی داستان کے عہد سے معنوی رشتہ برقرار رکھا جا سکتا ہے۔

آغا سہیل نے قل برابر آسمان (۱۹۸۶ء) کے بعد سے متعدد افسانے لکھے ہیں گزشتہ پانچ چھ سات سال آغا سہیل کی تخلیقی توانائی میں حیران کن اضافے کے سال ہیں۔

ان برسوں میں لکھے گئے افسانوں کے دو مجموعے اگن کنڈلی اور "بوند بوند پانی" زیرِ طباعت ہیں اور چند ماہ کے اندر ان مجموعوں کی اشاعت سے قارئین کو ان تمام افسانوں کے بالا ستیعاب مطالعے کا موقع ملے گا اور یہ افسانے اپنے مصنف کے بارے میں اس رائے کو مزید تقویت دیں گے کہ وہ اس وقت ان معدودے چند افسانہ نگاروں میں سے ایک ہے جس کے نظریاتی اور فنی سفر میں بتدریج استقامت اور پختگی کا وفور ہے۔ آغا سہیل اپنے سفر میں نئی منزلوں کی جانب بڑھ رہے ہیں۔ ان کے یہاں زندگی اور فن کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ فنکارانہ PIETY کا مثلث بذاتِ خود ایک خوبصورت ملاپ ہے جو وقت کے ساتھ ساتھ زیادہ واضح اور دلنشین ہوتا چلا جائے گا۔

آغا سہیل کا ایک افسانوی کردار

ڈاکٹر قمر رئیس

آغا سہیل کا ایک کردار ہے ابو داؤد۔ یہ مرد قلندر دنیا کی ہوا و ہوس سے بے نیاز ہے۔ شہر کا حاکم جب اسے سونے کے دینار بھیجتا ہے تو وہ حقارت سے ٹھکرا دیتا ہے۔ وہ شہر میں پھیلتی ہوئی منافقت کی وبا سے اور اس وقت سے خبردار کرتا ہے جب رزق ہر انسان سے دور بھاگے گا۔ ابو داؤد شہر پناہ کے درے کے پاس ایک چٹان پر بیٹھ کر اس آنے والے کا انتظار کرتا ہے جس کے قدموں کی چاپ وہ پہچانتا ہے اور اس کا عقیدہ ہے کہ وہ آئے گا۔

آغا سہیل کے افسانے پڑھتے ہوئے بار بار مجھے لگا جیسے یہ کہانیاں ابو داؤد کی خود کلامیاں ہیں۔ وہ انتظار کے طویل لمحوں میں اپنے وجود میں جھانکتا ہے۔ اولی الامر کا اور اپنے شہر کے لوگوں کے اعمال کا احتساب کرتا ہے اور جو سچائیاں اس کے ہاتھ آتی ہیں ان کو حکایت بنا کر بڑی سادگی سے بیان کر دیتا ہے۔

اس صدی کی چھٹی دہائی میں فنکاروں کا جو گروہ لکھنؤ میں پیدا ہوا آغا سہیل (جو اس دور میں سہیل ادیب تھے) اپنی قلندرانہ شان کے ساتھ اس میں شامل تھے۔ اس گروہ میں قاضی عبدالستار' اقبال مجید' احمد جمال پاشا' قیصر تمکین' حسن عابد' عابد سہیل' سبط اختر' احراز نقوی اور چند دوسرے نوجوان تھے جو یونیورسٹی اور ترقی پسند مصنفین کی ادبی سرگرمیوں میں جوشیلے انداز سے حصہ لیتے تھے۔ آغا سہیل کو میں نے ان سے اس لئے مختلف پایا کہ وہ اپنی شائستہ سنجیدگی کی وجہ سے ہمیشہ اپنے قد سے اونچے نظر آتے تھے۔ ان میں میری طرح کے کچھ نیم بوہیمین نوجوان بھی تھے جو کبھی کبھی شام کو معطر اور مشروب محفلیں سجاتے تھے لیکن آغا سہیل ان میں کبھی نظر نہیں آتے تھے۔ ہم کھلنڈرے لوگ رسالوں میں ان کی کہانیاں پڑھتے تو رشک کرتے اور سوچتے کہ اس ریاضت کے لئے یہ وقت کہاں سے لاتے ہیں؟

زندگی اور فن کے تئیں آغا سہیل کی یہ پروقار سنجیدگی عمر کے ساتھ ساتھ

بڑھتی ہی رہی۔ اس سے اہم بات یہ ہے کہ ابو داؤد کی طرح وہ کبھی اپنے خوابوں سے دست بردار نہیں ہوئے۔ ہجرت کے دکھ آسیب کی طرح ان کا پیچھا کرتے رہے۔ نئے وطن میں انہوں نے تین مارشل لاء دیکھے۔ عسکری آمریت کی جبرو بیداد سہی۔ مجرمانہ خود پرستی، منافقت، مذہب کے نام پر ہوس کاری اور انسانیت سے غداری کے سینکڑوں منظر ان کے سامنے تھے۔ جانے کتنی ترغیبات ان کو اپنے آدرشوں سے مفاہمت پر اکسا رہی تھیں۔ اگر وہ اپنی ذہانت اور لیاقت کا سودا کر لیتے تو برسوں پہلے بیورو کریسی کا حصہ بن کر بڑے منصب پر براجمان ہوتے۔ لیکن وہ اس مشین کا ایک پرزہ بننا نہیں چاہتے تھے جس کی جکڑ بندی کا عذاب وہ انسانوں کی زندگی میں دیکھ رہے تھے۔ پھر ان کے گردوپیش سامراجی طاقتوں کی گھناؤنی سازشیں اور ان کے لمبے لمبے ہاتھ تھے۔ ہمسایہ ملکوں سے جنگوں کا اعصاب شکن خمار تھا۔ آغا سہیل کی دردمندی انہیں ہر اس مقام پر لے جاتی جہاں انسانیت یا انسانی وقار سربہ زانو ہوتا۔ پانچواں درویش اپنی رام کہانی بیان کرتے ہوئے کہتا ہے۔

"بھائیو! مجھے کچھ خبر نہیں کہ میں ایک شیر خوار بچہ تھا اور ہمارا قصور یہی تھا کہ اس سرزمین پر ہم پیدا کیوں ہوئے؟ راتوں رات ہزار ہا نفوس کو موت کے گھاٹ اتار کر، گھروں کو آگ لگا کر بوڑھے مردوں اور بوڑھی عورتوں کو ڈھور ڈنگروں کی طرح ہانک دیا گیا..... میری دادی نے ایک چادر میں مجھے لپیٹا اور میرے وطن کی خاک کو ماتھے سے لگایا، چوما اور وطن کی ہواؤں کو آخری بار سانسوں میں اکٹھا کیا اور کہا۔ "اے وطن کی زمین الوداع؟ یاد رکھنا کہ ہم بے گناہ نکالے جا رہے ہیں مگر ہم یہاں ضرور آئیں گے۔ ہم نہ آئے تو ہماری اولاد آئے گی کہ ہم اسی مٹی سے رشتہ رکھتے ہیں۔"

"قصہ پانچویں درویش کا۔"

مٹی سے مقدس رشتے کا یہ المیہ صرف برصغیر کے لاکھوں انسانوں کا المیہ نہیں، فلسطینیوں، تاتاریوں، یونانیوں، کردوں اور دوسری ان گنت قوموں کا المیہ بھی ہے جن کو ان کی سرزمین، ان کی تہذیب کے گہواروں سے دور کر دیا گیا۔ موئے آتش دیدہ، چنگاریاں اور دوسری کہانیوں میں بھی پہلو بدل کر پانچویں درویش کی اسی کہانی کو دہرایا گیا ہے۔ آغا

سہیل کی کہانیوں میں ماضی سے یہ رشتہ صرف یادنگاری یا ناسٹیلجیا کی صورت میں نہیں ابھرتا بلکہ اجتماعی زندگی کی بازیافت اور تاریخ کا المیہ بن کر سامنے آتا ہے۔ وہ زندگی کے سلسلہ عمل کی ایک کڑی بن جاتا ہے اور اجالوں بھری زندگی کے خوابوں پر ان کے اعتماد کو مضبوط کرتا ہے۔

اس رجائی فکر کی سنہری کرنیں ان کی دوسری کہانیوں پر بھی سایہ ڈالتی ہیں۔ مثلاً جنگ کی ہولناکیوں کے بارے میں فاصلہ' اور نئی بستی جیسی کہانیاں۔ ان کہانیوں کے تار و پود حزن و غم سے معمور ہیں لیکن ان میں مقاومت اور حوصلے کے دریچے بھی کھلتے ہیں۔ اول الذکر کہانی میں معصوم بچی اپنے باپ سے' جو ہمسایہ ملک میں قیدی ہے گڑیا کا تحفہ پاکر سکون اور آسودگی کی نیند سو جاتی ہے اور نئی بستی کا بابا رمضان فوجوں سے تباہ ہونے والی بستی میں سرسبز پودوں کے نکل آنے کی بشارت دیتا ہے۔ یہ رجائیت ترقی پسندی کے کسی فارمولے کی عطا نہیں' زندگی اور امن کی قوتوں پر اعتماد سے' ہرے بھرے انکر کی طرح پھوٹتی ہے۔

آغا سہیل کی بہت سی کہانیاں معاشرے کے سب سے بے رحمانہ تضاد یعنی سماجی اور معاشی اونچ نیچ کو فوکس کرتی ہیں' بڑھتی ہوئی غربت اور بڑھتی ہوئی امارت کا یہ مسئلہ بظاہر اتنا پامال ہے کہ عام آدمی اس کے تئیں بے حس سا ہو گیا ہے۔ وہ اس کی سفاکی اور بشر دشمنی کو دیکھنے سے منکر ہے۔ لیکن آغا سہیل کے ابو داؤد کی نظروں سے وہ ایک پل بھی اوجھل نہیں ہوتا۔ کاروانِ دل کا ئیں ملاں بجلی ہے۔ جس کے گھناؤنے وجود میں گویا کالو بجلی نے جنم لیا ہے۔ کالو کی طرح ملاں بھی بس اپنی حیوانی جبلتوں کے سہارے زندہ ہے۔ لیکن کبھی کبھی اس کی روح میں دردمندی کی کرن جاگ اٹھتی ہے اور وہ آسودہ حال انسانوں سے زیادہ آنسوؤں اور زخموں کی زبان سمجھتا ہے۔ وہ ایک کتے کی ـــــ جان بچاتا اور اسے سینے سے لگاتا ہے اور ایک مہاجر کنبہ کی دکھ بھری زندگی کو دیکھ کر فلسطینی مہاجرین کے شانہ بشانہ دشمنوں سے لڑنے کے خواب دیکھتا ہے۔

شہ نا پرساں میں لگتا ہے خالد اور انور کی آواز میں ابو داؤد ہی بول رہا ہے۔

دونوں معاشرے کی عفونت میں ملوث ہیں لیکن اس تلخ سچائی کا شعور رکھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں "ہم غلط نظام میں جکڑے ہوئے ہیں۔ ہم مصلحتوں کا شکار ہیں ہم ڈرتے ہیں۔ ہم سچی بات جانتے ہوئے بھی منافقت کرتے ہیں۔" ناداری' نارسائی اور اونچ نیچ کے احساس سے جو ٹینشن پیدا ہوتا ہے وہ اس کے عذاب کو جھیل رہے ہیں۔ وہ سچ کہتے ہیں۔ "چالیس سال سے مسلسل میں اس سڑک پر پیدل چل رہا ہوں جب کہ کتنے ہی پیدل چلنے والے گاڑیوں پہ چلنے لگے۔ جہازوں پر اڑنے لگے۔ اور میں ہوں کہ اسی طرح چالیس سال سے رینگ رہا ہوں۔"

آغا سہیل کی کہانیوں میں تہذیبی المیہ کی نشاندہی محمد علی صدیقی اور دوسرے ناقدین نے کی ہے اور اس میں شک نہیں کہ صدیوں میں نمو پانے والی ایک خوبصورت تہذیب کی نرم گھنی چھاؤں سے محرومی کا المیہ ایک بڑا المیہ ہے جس کے عذاب کو آغا سہیل کی نسل نے سہا ہے۔ یہ کرب و اذیت ان کی کہانی "بے چراغ قبر' میں اپنے نقطۂ عروج پر نظر آتی ہے اور یہ ان کی شاہکار کہانیوں میں شمار ہوگی۔ اس المیہ کی اذیت کا احساس شاید کچھ کم ہوتا اگر وہ پاکستانی معاشرہ میں انسانی قدروں اور انسانی رشتوں کے شیرازے کو تار عنکبوت کی طرح بکھرتا نہ دیکھتے۔ افسانوی ادب میں ان اخلاقی قدروں کی شکست کا المیہ زیادہ معنی خیز بن جاتا ہے جو ایک بدلتے ہوئے معاشرہ میں زوال آشنا ہوتی ہیں۔ سیاسی جبر و بیداد اور معاشی دباؤ سے زوال کا یہ عمل زیادہ تیز ہی نہیں عفونت خیز بھی ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ اس گلخن میں انسان ہی نہیں انسانیت بھی موم کی طرح پگھلنے لگتی ہے۔ آغا سہیل کی جن کہانیوں میں اخلاقی زوال کا احساس زیادہ شدید ہے وہ فنی اعتبار سے زیادہ موثر اور دلکش ہیں۔ ان کی بہت سی کہانیوں میں ایک ناقابل فراموش کہانی جزاک اللہ ہے جہاں راحت رسانی کے نام پر قحط کے مارے ہوئے کنبوں کا استحصال ہوتا ہے اس کہانی میں اخلاقی ضبط و نظم اتنا مسخ ہو جاتا ہے کہ معصوم انسانوں کی شناخت بھی مشکل ہو جاتی ہے۔ ہر کردار حقی کر دار نظر آتا ہے۔

لیکن آغا سہیل کی کہانیوں کا ابو داؤد گھور اندھیروں میں بھی قنوطی نہیں ہے۔ وہ انسانی قدروں کے بحران میں اس فرد پر یقین رکھتا ہے جب انسانیت سرخرو ہوگی۔ ہاتھی

کے دانت میں جہاں نذیراں اور رفا جیسے شیطان صفت کردار ہیں وہاں بنوں اور اس کا پردیسی عاشق بھی ہیں جو حسن مسرت اور نیکی کی علامت ہیں۔ روشنی کی لکیر میں ایک پراسرار آدمی کا کردار ہے۔ محلے کے لوگ اس ذات شریف کو کسی تخریبی کاروبار کا آدمی سمجھتے ہیں۔ ایک دن رات میں ڈھاٹنے باندھے ہوئے کچھ غنڈے محلے کی ایک عورت کو زدوکوب کرتے ہیں۔

"عورت جب بھی چیخ چلاتی' مدد کے لئے ہم میں سے ہر ایک کا باری باری نام لیتی ہوئی ہمارے دروازوں کی طرف بھاگتی دوڑتی تو غنڈے اسے بالوں سے پکڑ کر کھینچتے.... ہم میں سے کسی کو باہر نکلنے اور غنڈوں سے اسے بچانے کی توفیق نہ ہوئی۔"

اچانک رات کے اندھیرے میں وہی پراسرار آدمی عورت کو بچانے کے لئے بڑھتا ہے۔ گولیاں چلتی ہیں۔ کچھ دیر بعد لوگ دیکھتے ہیں کہ عورت سسک رہی ہے اور اس پراسرار آدمی کا سارا بدن گولیوں سے چھلنی ایک طرف ٹھنڈا پڑا ہے۔

آغا سہیل کا مرد قلندر ابوداؤد فی الاصل اسی مرد مجاہد کی تلاش میں سرگرداں ہے جو انسانی حرمت کے لئے اپنی جان وار دے جو انسانی آدرشوں کا سودا نہ کرے اور جس کا ضمیر بیدار ہو۔

ڈاکٹر آغا سہیل

"حقیقت سے علامت تک" ڈاکٹر سلیم اختر

"اندر کمرے میں جو شخص بیٹھا تھا بہت ہی معروف تھا' لاکھوں' کروڑوں افراد اس سے بات کرنے' مصافحہ کرنے کو ترستے تھے اور میں متعدد ملاقاتوں کے باوجود ابھی تک اپنے ہاتھ کی عصمت پر نازاں تھا کہ اس سے مس نہ ہوا تھا۔ نہ میں نے مصافحہ کیا' نہ سلام کیا اور نہ اس سے بات کی تھی۔ حالانکہ اپنے ہاتھ کی اس آبرو کی حفاظت کے لئے مجھے کتنی جدوجہد کرنی پڑی تھی۔ یہ بات محض میرا ہی دل جانتا تھا۔"

(بیعت)

"ہم نے اکثر چاہا کہ ان جوتوں کی موجودگی کو ہم یوں نظر انداز کر دیں کہ جیسے یہ ہیں ہی نہیں۔ جس طرح شتر مرغ اپنے سر کو چھپا کر سمجھتا ہے کہ وہ پورا کا پورا چھپ گیا۔ اسی طرح اکثر اجنبی مہمانوں کے سامنے ہم ان جوتوں کو نظر انداز کر دیتے تھے' مگر کچھ ہی دیر کے بعد چبھتی ہوئی نگاہوں سے نکلتے ہوئے نفرت اور حقارت کے شعلے ہمیں اپنی غلطی کا احساس دلا دیتے ہیں اور ہم سب شرمندہ ہو جاتے ہیں۔ ان جوتوں کی موجودگی میں ہمارے کمرے کا نفیس ماحول غارت ہو جاتا ہے اور ہمیں یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے تاریخ نے ایک بار پھر اعادہ کیا ہو اور شاہی مسجد کو پھر اصطبل بنا دیا گیا۔ نعوذ باللہ۔" (کھڑکی)

"ظل اللہ نے فرمایا زینت محل کچھ ہونے والا ہے۔ میرے جد اعلیٰ جنت مکانی شہنشاہ اعظم حضرت شاہ جہاں ابھی ابھی خواب میں پریشان حال تشریف لائے اور فرمایا کہ اے فرزند جان لے کہ یہ بربادی اس قوم کا مقدر ہے کہ جس کے دانشوروں کو تہ تیغ کیا جائے اور ان پر نا سمجھ اور کم سواد حکمران بٹھا دیئے جائیں۔" (لمن الملک الیوم)

"تو گویا صرف یہ منظر ہے کہ نہیں بدلتا اور کتاب کی عبارتیں ہیں کہ بدلی جا رہی ہیں' مگر مفہوم کے سیاق و سباق سے عہد زوال کی تسبیح خوانی کے سوا اور کچھ سنائی نہیں دیتا۔" "عہد زوال"

ڈاکٹر آغا سہیل نے بطور ایک محقق' ناقد اور افسانہ نگار اردو ادب میں اپنی اہمیت تسلیم کرالی ہے۔ اگر میں یہ بات کہتا ہوں تو کوئی انکشاف نہیں کرتا۔ کیونکہ یہ کہہ کر تو ایک لحاظ سے میں واضح کو مزید واضح کرتا ہوں' لیکن یہ بات کہنے کی ضرورت اس لئے محسوس ہوئی کہ ادب کے قارئین اپنے محدود مطالعے کی بنا پر ایک ہی ادیب کو الگ الگ خانوں میں تقسیم کر دیتے ہیں۔ الگ الگ خانے بھی کیا' یوں سمجھئے کہ ہوا بند ڈبوں میں مقید کر دیتے ہیں' یعنی تنقید کا مطالعہ کرنے والا صرف تنقیدی تحریروں سے آشنا ملتا ہے' جب کہ افسانے کا قاری تنقیدی کاوشوں سے بہرہ ور ثابت ہوتا ہے۔ کچھ یہی معاملہ آغا سہیل کا بھی ہے جو قاری ڈاکٹر آغا سہیل کے تحقیقی اور تنقیدی کارناموں کے دلدادہ ہیں۔ ان کے لئے ان کا افسانہ نگار' بلکہ بہت اچھا افسانہ نگار ہونا' ایک خبر کے مترادف ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ آغا سہیل کی تخلیقی شخصیت ہی ہمہ جہت نہیں بلکہ وہ خود بھی ہمہ صفت انسان ہیں۔

آج کا بے حد تعلیق ڈاکٹر آغا سہیل' صدر شعبہ اردو ایف سی کالج کسی زمانے میں سہیل ادیب تھا۔ یہ قصہ ہے تب کا جب آتش جواں تھا اور خاصا رومانٹک بھی تھا اور اسی لئے ناکام محبت کے المیوں کا داستان گو تھا۔ قیام پاکستان کے بعد جو افسانہ نگار فوری طور پر ابھرے ان میں سہیل ادیب بھی تھا۔ اگرچہ وہ افسانے کے روایتی اسلوب کا پابند تھا' تاہم اس کا تجزیاتی ذہن محض رومانی کہانیوں' جذباتی الجھنوں اور احساساتی تصورات تک محدود نہ رہ سکتا تھا۔ اس لئے اس نے دو کام کئے' ایک تو یہ کہ اس عہد کی تمام کہانیاں کتابی صورت میں محفوظ نہ کیں اور دوسرا اپنے لئے حقیقت نگاری کے اسلوب کا انتخاب کیا۔ یہ ۱۹۵۴ء کا فیصلہ تھا اور میں سمجھتا ہوں کہ بہت اہم فیصلہ تھا۔ کسی تخلیقی فن کار کے لئے اپنی تحریروں سے صرف نظر کرنا کتنا مشکل ہے' اسے واضح کرنے کی ضرورت نہ ہونی چاہئے۔ لیکن آج کے تناظر میں دیکھنے پر یہ فیصلہ بے حد درست معلوم ہوتا ہے کہ جب اس نے آغا سہیل بن کر لکھا تو ۱۹۶۷ء میں طبع ہونے والے افسانوں کے پہلے مجموعے "بدلتا ہے رنگ آسماں" نے اسے اردو کے معتبر افسانہ نگاروں کی صف میں شامل کرا دیا' جب کہ دوسرے مجموعے "شہر نا پرساں" نے اسے جدید افسانے میں ایک اہم نام بنا دیا۔

اگر آپ لاہور کی ہنگامہ بھری فیروز پور روڈ سے گزر کر سفیدے کے درختوں میں سوئی نہر کے کنارے جائیں تو ایک راستہ ایف سی کالج لے جاتا ہے' جو کبھی اپنی نفاست کی بنا پر لاہور کی ایک مثالی درس گاہ تھا۔ ایف سی کیمپس کے ایک خاموش گوشے میں ڈاکٹر آغا سہیل آباد ہے۔ لاہور کی تنگ' گندی اور بدبو دار گلیوں اور پر ہجوم سڑکوں کے بعد آغا سہیل کی رہائش گاہ کے سکون سے اعصاب پر سکون ہوتے محسوس ہوتے ہیں۔ برسات میں اگر رات کو وہاں آئیں تو کھیت جگنوؤں کی فصل سے جگمگ جگمگ نظر آتے' میں نے پہروں کھڑے رہ کر کھیت میں جگنوؤں کے دیئے دیکھے ہیں اور ہر مرتبہ اس منظر کے حسن سے اعصاب نے خوشی کی عجب ترنگ محسوس کی ہے اور کچھ ایسی ہی کیفیت میں نے آغا سہیل کے تیسرے افسانوی مجموعے "عہد زوال" کے اختتام کے بعد محسوس کی۔

میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ میری مانند آغا سہیل نے بھی عالم وارفتگی میں کیمپس کے گرد پھیلے کھیتوں میں جگنوؤں کا والہانہ پن دیکھا ہے' لیکن ایک بات ہے کہ مجھے اس کے افسانوں میں علامت بالکل جگنو کی مانند چشمک کرتی نظر آتی ہے۔ آغا سہیل کے افسانوں کی فضا بڑی خاموش اور پر سکون ہوتی ہے۔ وہ تیز روشنیوں سے اجتناب کر کے سایوں' پرچھائیوں اور ہیولوں سے افسانے کی خاموش فضا میں تحیر کی کیفیت پیدا کرتا ہے اور پھر اچانک جگنو کی مانند علامت لمحہ بھر کے لئے اس خاموش اور سایوں بھری فضا کو منور کر دیتی ہے' یوں کہ منظر کا اچانک پن ہمیں متحیر کر دیتا ہے۔

ہمارے ہاں افسانے میں گزشتہ دو دہائیوں سے علامت نے خاصی دھوم مچائی ہیں' اگرچہ علامت سے اس شغف کو بیشتر اصحاب (اور ان میں سے بعض ناقدین بھی شامل ہیں) مغرب کی تقلید' نئے پن کی سنسنی' فیشن اور سستی شہرت کے حصول کے مترادف گردانتے ہیں' لیکن مجھے ان حضرات سے اختلاف ہے۔ ہرچند کہ ہمارے ادب اور تنقید میں مروج ہر جدید نظریے اور نئے تصور کے کسی نہ کسی صورت میں مغرب کی کسی نہ کسی تحریک' نظریہ یا علمی تصور سے ڈانڈے جا ملتے ہیں' لیکن جس طرح مٹی اور آب و ہوا سازگار نہ ملے تو یہ بدیشی پودا جڑ نہیں پکڑتا' بالکل اسی طرح مخصوص علمی اور ادبی

تصورات کے فروغ کے لئے بھی سازگار تہذیبی ماحول کے ساتھ ساتھ مخصوص نوعیت کے سیاسی' اقتصادی اور دیگر سماجی عوامل کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔

اردو افسانے میں علامت اور اس کے ساتھ ساتھ تجربے کا سفر بھی عجب نشیب و فراز کا حامل ہے۔ خط مستقیم کی تعریف کرتے ہوئے اسے دو نقاط کے درمیان مختصر ترین فاصلہ قرار دیا گیا ہے' جب کہ خط منحنی اس کے برعکس ہوتا ہے۔ یوں دیکھیں تو حقیقت نگاری کے اسلوب کا پابند بھی خط مستقیم پر چلتا ہے کہ حقیقت اور واقعیت کے دو نقاط کے درمیان کہانی اپنا بلاواسطہ سفر جاری رکھتی ہے' جب کہ استعاراتی اسلوب اور علامتی پیرایہ و اظہار اس کے برعکس گریز پا سا نظر آتا ہے کہ افسانہ نگار انفرادی سطح پر انسانی سائیکی میں بے وزنی کے عالم میں سفر کرتا ہے۔ لاشعور کے سیال لمحات کو جگنو سمجھ کر مٹھی میں پکڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ جب کہ اجتماعی حوالوں سے وہ اساطیر' قدیم داستانوں اور مذہبی صحائف کے ہفت خواں طے کرتا نظر آتا ہے اور ان ہی میں سے وہ اپنے افسانے میں گہرائی پیدا کرتے ہوئے اسے سمت نما بنا دیتا ہے۔

اس تناظر میں جب آغا سہیل کے علامتی افسانوں کا مطالعہ کریں تو یہ آغا سہیل کے فنی سفر میں ایک تخلیقی جست کا منظر پیش کرتے ہیں۔ وہ حقیقت نگاری سے چل کر استعاراتی اسلوب اور علامتی اظہار تک آ پہنچا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ آغا سہیل کی شخصیت کے تخلیقی تشخص کے لحاظ سے یہ بہت بڑا اور اس کے ساتھ ساتھ بہت اہم قدم بھی ہے۔

"شہر نا پرساں" کے افسانوں کے مطالعے سے ایک طرح کی قوس بنتی نظر آتی ہے۔ یعنی کتاب کے ابتدائی افسانے جیسے فاصلہ' نئی بستی' جزاک اللہ اور "گیوی اے بے بی" حقیقت نگاری کی روایت کے افسانے ہیں' جب کہ کتاب کے آخری افسانے جیسے "کروسٹوفر" "لمن الملک الیوم" "وقت اٹھے گا۔"

اور "کھڑکی" واضح طور پر جدید تر افسانوی اسلوب کے حامل ہیں۔ یوں دیکھیں تو آغا سہیل نے حقیقت اور علامت کے درمیان ملنے والی جھجک اور تذبذب کی جھیل کو

ایک ہی جست میں طے کرلیا اور اسی لئے اب (Neo Symgolist) میں اس کا نام محترم قرار پایا ہے۔

یہاں میں نے "نو علامت نگاروں" کی جو اصطلاح استعمال کی ہے تو اس کی وضاحت ضروری ہے۔ ہمارے جن افسانہ نگاروں نے اپنے اسلوب میں استعاراتی یا علامتی انداز اپنایا یا انہوں نے تکنیک کے تجربہ کو روا رکھا تو نئے پن کے جوش میں یا عجز اظہار کے باعث یا افتاد طبع کی بناء پر یا پھر سنسنی خیزی کے لئے انہوں نے اول تو ابلاغ کو یکسر مسترد کر دیا اور اگر ایسا نہ بھی کیا تو کم از کم اپنے قارئین کی حد تک ان کا رویہ کچھ اس سے مشابہ رہا تھا:۔

ع۔ گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی۔

بجائے اس کے کہ وہ اپنے قاری کو اعتماد میں لینے کی کوشش کریں اور اس سے افہام و تفہیم کا رشتہ استوار رکھیں' انہوں نے تو اس کے برعکس کچھوے اور خرگوش کی دوڑ والا کام کیا اور دوڑ بھی کیسی کہ راستے میں سوئے یا دم لئے بغیر وہ تو ایک ہی جست میں اپنی منزل پر جا پہنچے' جب کہ قاری بے چارہ محض وضعداری کی بناء پر ہاری ہوئی دوڑ میں شامل ہے۔

گزشتہ پانچ سات برس سے افسانہ نگاروں کی ایک ایسی کھیپ سامنے آئی ہے' جن کی بنیادی تربیت چونکہ حقیقت نگاری کی روایت میں تھی' اس لئے انہوں نے نفی ابلاغ کا Cult بنانے کی ضرورت محسوس نہ کی' لیکن اس کے برعکس علامت اور استعارے کو اس سلیقے اور ذہانت سے استعمال کیا کہ ان سے وابستہ تلازمات ور معانی کے لئے مکمل جام سم کا کام کرتے ہیں اور آغا سہیل بھی علامت نگاروں کی اسی نسل سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کے علامتی افسانے علامت کے جدید تصور پر پورے اترنے کے ساتھ ساتھ اپنے قاری سے بھی رابطہ استوار رکھتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ روایتی افسانے کے قارئین اور جدید افسانوں کے قارئین دونوں میں آغا سہیل کے مداح ملتے ہیں۔ چنانچہ "کھڑکی" جیسے افسانے

کتابی صورت میں آنے سے پہلے ہی افسانے کے تنقیدی مباحث میں حوالے کی چیز بن گئے۔

پاکستانی افسانے میں ایوب خاں کے مارشل لاء کے ساتھ ساتھ علامت کا آغاز ہوتا ہے اور پھر جیسے جیسے ملک میں صحافت' ادب اور اظہار رائے کے دیگر اداروں پر پابندیوں کی مٹھی کستی گئی اور ان کے نتیجے میں جبر اور گھٹن کا احساس بڑھتا گیا تو اس رفتار سے علامت کی طرف رجحان میں بھی ترقی ہوتی گئی۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ ترقی پسند ادب سے مخصوص خارجی حقیقت نگاری' اسلوب کا واشگاف ہونا اور نعرہ بازی۔ یہ بدلے ہوئے سیاسی حالات میں نئے افسانے کے راستے کا روڑا ثابت ہو رہے تھے کہ احتساب کے باعث بات کی گرہ کھولنے کے برعکس بات کا رمز چھپانے کی ضرورت تھی۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے علامت نے کارآمد آلے کی صورت اختیار کرلی۔ علامت سے بات کو واشگاف ہونے سے روکا گیا مگر اس کے ساتھ ہی معانی کی ایک نئی جہت بھی پیدا کر دی گئی۔ یوں دیکھیں تو بیشتر علامتی افسانے ابلاغ کے نقطہ نظر سے کچھ آئس برگ سے مشابہ نظر آتے ہیں۔ سطح آب پر جو نظر آتا ہے' اس سے کہیں زیادہ زیر آب موجود ہوتا ہے۔ اب یہ قاری کی بصیرت پر منحصر ہے کہ وہ سطح تک ہی رہتا ہے یا علامت کی سیڑھیاں اترتا افسانے کے نہاں خانے میں اترنے کی سکت بھی رکھتا ہے۔

نقاد ڈاکٹر آغا سہیل کی شہرت نے افسانہ نگار آغا سہیل کی شہرت کو زیادہ ابھرنے نہ دیا' حالانکہ وہ طویل مدت سے افسانے لکھ رہا ہے' چنانچہ اس کے افسانوں کا پہلا مجموعہ "بدلتا ہے رنگ آسماں" ۱۹۷۵ء میں طبع ہوا تھا۔ ان دنوں وہ اپنے مزاج کے عین مطابق شریفانہ قسم کے افسانے لکھتا تھا مگر ان افسانوں کی سادہ مزاجی میں بھی ایک کشش تھی۔ بحیثیت انسان آغا سہیل عزت نفس کی قیمت پر شہرت طلبی کا قائل نہیں۔ اس لئے اس نے لاہور میں رہتے ہوئے سرگودھا سے لو لگانے کی ضرورت محسوس نہ کی' جس کی سزا اسے یوں ملی کہ وہاں بھی اس کا نام لینے کی ضرورت محسوس نہ کی گئی۔ بقول آغا سہیل:۔

"میں وزیر آغا نہیں بلکہ غریب آغا ہوں۔"

لیکن وہاں سے قطع نظر کرکے دیکھیں تو تمام غیر جانب دار ناقدین نے اس کے

نام اور کام کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے۔ شاید اپنی طبعی شرافت کی بناء پر آغا سہیل یہ سطریں کٹوا دے لیکن میں اس امر کی طرف توجہ دلانے پر یوں مجبور ہوا کہ آغا سہیل کو کافی کی مانند (Instant Fame) نہیں ملی بلکہ اس نے اپنی محنت' لگن اور فنی خلوص سے اپنے لئے نام اور مقام پیدا کیا ہے۔ نہ وہ کسی کی "طفیل" بنا اور نہ اس نے کسی کو بطور چورن استعمال کیا کہ شرفاء کا یہی طریقہ ہوتا ہے۔ گزشتہ چند برس سے آغا سہیل نے افسانوں کی طرف زیادہ توجہ ہی نہ دی' بلکہ اس نے علامتی اسلوب اپنا کر اور اس کے تمام فنی لوازم کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایسے کامیاب افسانے لکھے کہ سامعین دنگ رہ گئے۔ اس مجموعے کے بیشتر افسانے حلقہ ارباب ذوق کی تنقیدی نشستوں میں پڑھے گئے تھے۔ اگرچہ حلقے کی تنقید اور اس کے معیار سے سب آگاہ ہیں لیکن سامعین اور ناقدین کی غیر مشروط تعریف سے صرف نظر ممکن نہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ آغا سہیل کس "شہر نا پرساں" کی حکایت سناتا ہے؟ یہ کوئی طلسمی شہر نہیں' جہاں جادو کی بنسری پر لوگ ناچتے ہوں اور انہیں یوں دیوانہ وار نچانے والا خفیہ ہاتھ نظر بھی نہ آتا ہو۔ اگرچہ آغا سہیل نے بھی میرے اور آپ کے شہر کی کہانیاں سنائی ہیں' لیکن کمال ہے کہ پھر بھی ہمیں یہ شہر طلسمی سا معلوم ہوتا ہے۔ یہاں بھی جادو کی بنسری پر لوگ ناچتے ہیں اور انہیں بھی یوں دیوانہ وار نچانے والا خفیہ ہاتھ نظر نہیں آتا' اس لئے اس کی "نئی بستی" ہمیں اتنی نئی نہیں معلوم ہوتی' جتنی کہ جانی پہچانی؟

"جزاک اللہ" کا مولوی حشمت اللہ بھی مانوس سا لگتا ہے۔ "کیوی اے بے بی" کی گمنام بیبی ترکی سایہ' حلیہ اور طریقہ واردات' نامانوس لگے' مگر اس کے دل کا اور ہر عورت کے دل کا درد مشترک ہے۔

الغرض اس "شہر نا پرساں" کے باسی اپنی تمام بوالعجبیوں یا اینار ملٹی کے باوجود مجھ سے اور آپ سے الگ یا مختلف نہیں ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ انہوں نے اپنے اپنے چہروں پر ماسک سجا رکھے ہیں۔ یہ ماسک جھوٹ فریب اور منافقت ہی کے ہیں' مگر اب یہ لوگ ان کے اتنے عادی ہو چکے ہیں کہ ان کے بغیر وہ خود کو عریاں اور اسی لئے غیر محفوظ سمجھتے ہیں اور افسانہ نگار آغا سہیل یہی کچھ کرتا ہے کہ وہ انہیں غفلت کے کسی لمحے میں آن

پکڑتا ہے۔ ان کے چہروں سے لمحہ بھر کو ماسک سرکا کے ہمیں ان کے چہروں کے سچے اور کھرے نقوش دکھا دیتا ہے اور جب ہم حیرت زدہ ٹھٹھک کر رہ جاتے ہیں تو پھر وہ نئے چہرے اور ان کے ماسک کی تلاش میں آگے قدم بڑھا دیتا ہے۔ اس طرح چلتے چلتے وہ "بڑا آدمی" اور "اپنا آدمی" کی صورت میں ہمیں نہایت مکروہ چہرے بھی دکھاتا ہے اور پھر آخر میں علامت کی تہہ در تہہ معنویت سے لبریز "کھڑکی" کے پردے وا کر دیتا ہے۔ وہ کھڑکی جو اب "شہرنا پرساں" پر بند ہوئی اور "عہد زوال" پر کھلی ہے۔

"عہد زوال" کے افسانے آغا سہیل کے فن میں نئی جہت کے مظہر ہونے کے ساتھ ساتھ روح عصر سے وابستگی کے آئینہ دار بھی ہیں۔ ان افسانوں میں آغا سہیل نے جس گہری سیاسی بصیرت کا ثبوت دیا ہے۔ وہ اتنی توانا ہے کہ علامتوں کے باوجود بھی وہ کیمو فلاج ہونے سے انکار کر دیتی ہے' جیسے افسانہ "نظام" اس ضمن میں بطور مثال ہے افسانوں سے نام گنوانے کی ضرورت نہیں۔ کسی بھی افسانے کو لے لیجئے آغا سہیل سیاسی صورت حال پر احتجاج کرتا نظر آئے گا' مگر کس انداز سے:۔

"مجھے بیٹھے بٹھائے یہ سوجھی کیا تھی کہ جنتری لیکر دکان کی چھت پر جا چڑھا' آخر یہ کون سی لہر اٹھی تھی' میرے دل میں' کہ فضا کو نغموں سے بھر دوں' اگر فضا میں نغمے نہ بکھرتے تو کون سا غضب ہو جاتا۔ فضا میں پہلے بھی سناٹے ہو سکتے تھے اور ہو کا عالم تھا اور اب جب کہ میں پاتال اور دھنسا ہوا ہوں' تب بھی وہی سناٹا ہے اور وہی ہو کا عالم ہے۔"

(تل برابر آسمان)

آغا سہیل کا افسانہ "بے سمت راہیں" بھی خصوصی توجہ چاہتا ہے۔ اس دور میں بے سمتی کے احساس کے لئے ریل گاڑی کی علامت نے خاصی مقبولیت حاصل کی ہے۔ انتظار حسین کا افسانہ "صبح کے خوش نصیب" بھی ریل گاڑی کی علامت سے چلتا ہے اور آغا سہیل نے بھی "بے سمت راہیں" میں ریل گاڑی کے حوالے سے بات کی ہے۔ (میرا افسانہ "زنجیر" بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔)

"بے سمت راہیں" میں آغا سہیل نے مکالموں سے ڈرامائی تاثر پیدا کر کے

ریل گاڑیوں کے ڈبے میں موجود لوگوں کی سوچ کے مختلف دھاروں کو اجاگر کیا ہے:۔

"کہہ دیا کہ ہم عالم جبر میں ہیں۔"

"پھر وہی فلسفہ' سوال یہ ہے کہ گاڑی رکی کیوں ہے۔"

"رکی کہاں' چل تو رہی ہے' غور کرو تو سمجھ میں آتا ہے۔"

"ہاں شاید چل تو رہی ہے مگر الٹی طرف۔"

"الٹی کیوں چل رہی ہے؟ کیا آگے خطرہ ہے؟"

"پتہ نہیں ڈرائیور کو کیا ہو گیا ہے۔"

"کہیں ڈرائیور رسم تو نہیں گیا۔"

"کیا پتا اس گاڑی میں ڈرائیور رہی نہ ہو۔"

"ڈرائیور ہی نہ ہو' یہ کیسے ممکن ہے۔"

"یہ تو ممکن نہیں پر شاید ڈرائیور کی کھوپڑی ہی الٹ گئی ہو۔"

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ مخالف سمت سے بھی کوئی گاڑی آ رہی ہو۔"

"گاڑی آ رہی ہو۔ اور اگر' اگر دونوں کی ٹکر ہو جائے تو۔"

"ہائے ایسی باتیں نہ کرو۔"

اور ان سطروں کے ساتھ احمد ندیم قاسمی کے اس اعلان کو بھی جمع کر لیا جائے تو دیباچہ نگار کو کچھ کہنے کی ضرورت نہیں رہتی:۔

"حکومت کی مثال تو ریل گاڑی کو کھینچنے والے انجن کی سی ہے' جس میں اگر کوئی خرابی پیدا ہو جائے تو اسے بدل دیا جاتا ہے اور ریل گاڑی کا سفر جاری رہتا ہے۔"

(ادیب اور مملکت: مقالات'

کل پاکستان اہل قلم کانفرنس ۱۹۸۰ء ص: ۵۳)

اس سلسلے میں آغا سہیل کے ایک اور افسانے کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔ یہ افسانہ "دروازہ بند ہے" ہے جب افسانہ ختم کیا تو کافکا کا ایک بے حد مختصر بلکہ مختصر ترین افسانہ یاد آ گیا' جو کچھ یوں ہے:۔

"بھاگتے ہوئے چوہے نے کہا' تمام راستے تنگ ہوتے جا رہے ہیں' یہ سن کر بلی نے اسے مشورہ دیا' تم اپنے سفر کی منزل تبدیل کر لو' چوہے نے ایسا ہی کیا اور اگلے لمحے وہ بلی کے پنجوں میں تھا۔"

"دروازہ بند ہے" کا منظر بھی کسی چوہے دان سے مشابہ ہے کہ لاتعداد انسانوں کو کسی نادیدہ قوت نے اندھیرے میں مقید کر رکھا ہے:۔

"یہاں سے وہاں تک ایسے لمبے کوری ڈور میں جہاں ہاتھ کو ہاتھ نہیں سوجھتا' میں ٹٹولتا ہوا چلتا ہوں۔ میرے پیچھے ملی جلی آوازوں کا شور ہے اور یوں لگتا ہے کہ ہر شخص اس لمبے کوری ڈور میں اس سمت کی طرف چل رہا ہے' جدھر میں جا رہا ہوں۔ میرے دائیں ہاتھ اور بائیں ہاتھ دیواریں ہیں۔ ٹٹول کر چلنے میں ہر لمحے نت نئے اندیشوں کے سانپ پھن کاڑ کر پھنکاریں مارتے ہیں اور ہجوم کا شور ہے کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔"

ان چند تعارفی سطروں کے بعد باقی تمام افسانہ مفرد مکالے کی صورت میں ہے' مگر یہ چھوٹے چھوٹے فقرے محض چھوٹے چھوٹے فقرے نہیں بلکہ ماس ہسٹریا کے مدوجزر کے مظہر ہیں۔ اسی لئے ان میں بے بسی اور بے چارگی سے جنم لینے والی خشونت کے کئی رنگ دیکھے جا سکتے ہیں۔

کافکا کا چوہا تنہا تھا' اس لئے وہ بلی کا کھاجا بن کر جان سے جاتا ہے' مگر آغا سہیل کے انسان چونکہ اکٹھے ہیں اور اجتماع کی قوت سے حوصلہ پاتے ہیں' اس لئے وہ اس تاریک چوہے دان میں خوفزدہ اور پریشان بھی نہیں ہوتے کہ سرے سے ہمت ہار دیں اور کسی کے نہیں تو اپنے ہی خوف کا کھاجا بن کر رہ جائیں۔

کو آغا سہیل نے ایک بڑی خوبصورت بات یہ کی ہے کہ ان کی گفتگو کو عمل کا استعارہ بنا دیا ہے۔ اندھیرے میں مقید ان افراد کے لئے یہ گفتگو جہاں باہمی تعارف کا ایک ذریعہ ہے' وہاں ارادوں کا ابلاغ بھی ہے اور احتجاج کا انداز بھی ہے۔ چنانچہ یہ مفرد مکالے فرد کو اس کی انفرادیت کی سطح سے بلند کر کے اجتماعی رویوں کا انداز بھی متعین کرتے ہیں۔ قد

اور افسانہ نگاروں کو دیکھیں تو لگتا ہے کہ وہ اب اپنی توانائی کے محفوظ ذخیرے کو ختم کر بیٹھے ہیں اور اب صرف اپنی رفتار اور Momentum پر چل رہے ہیں۔ ان سب کے ردعمل میں اب "نئے" کے نام پر رطب ویابس کو مسترد کرنے کا رجحان قوی سے قوی تر ہوتا جا رہا ہے۔ یہی نہیں بلکہ خود علامتی افسانہ نگار بھی اس کی بے ستی اور اس میں پائی جانے والی بے وزنی کی کیفیت کے خلاف لب کشا نظر آتے ہیں تو ان حالات میں آغا سہیل جیسے بالغ نظر نقاد اور معتدل مزاج افسانہ نگار کا علامت کی طرف رجوع نیک فال ہے۔

تل برابر آسمان

کلاسیکیت اور علامتیت کا امتزاج

ڈاکٹر وحید عشرت

پروفیسر آغا سہیل صاحب کے افسانوں کا مجموعہ "تل برابر آسمان" ایک تو نہایت عجلت میں مجھے پڑھنا پڑا اور پھر اسی عجلت میں اس پر تبصرہ بھی لکھنا پڑا ہے۔ لہٰذا مجھے خود شدید احساس ہے کہ میں اس تبصرہ میں کتاب سے کسی بھی پہلو سے انصاف نہ کر سکوں گا' تاہم کبھی پھر موقع ملا تو میں اس کتاب کے بارے میں اپنی معروضات پیش کروں گا' اس تبصرے میں جو خامیاں رہ جائیں گی' ان میں سے ایک یہ ہے کہ مجھے آغا سہیل کے افسانے قبل ازیں پڑھنے کا زیادہ موقع نہیں ملا۔ اکا دکا اگر کوئی افسانہ پڑھا بھی ہے' تو وہ بھی اس وقت ذہن میں محفوظ نہیں' لہٰذا میں نہیں کہہ سکتا کہ آغا صاحب کے دیگر افسانوں کے حوالے سے یہ افسانے کیسے ہیں۔ پھر مجھے چونکہ ان افسانوں میں ذرا اتر کر بات کرنا تھی تو میری خواہش تھی کہ میں ذرا دیر کے لئے رک کر اپنے کلاسیکی افسانے اور اپنے علامتی افسانے کے درمیان کی اس کڑی کے بارے میں کوئی بات کہہ سکوں' مگر عجلت کی وجہ سے ذہن کو حاضر کرنا اور یہ سارے تانے بانے بننا میرے لئے ممکن نہیں ہو سکا۔ پھر میری خواہش تھی کہ میں افسانہ نگاری میں علامت کے بے محابا اور بے جا استعمال کے حوالے سے چند معروضات پیش کرتا کہ جہاں علامت ایک بہتہ بات کو یا ایک لمبی چوڑی بات کو آسانی سے اور مختصر ترین الفاظ میں ابلاغ دینے پر قادر ہے' وہاں علامت ابہامات کے تانے بانے بھی بنتی ہے اور بات کے ابلاغ میں ابہامات کا سلسلہ یوں دراز ہو جاتا ہے کہ سب کچھ بود ہو کر رہ جاتا ہے۔ جدید علامتی افسانے کے حوالے سے یہ بات بڑے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ علامت کے بے جا اور بے محابا استعمال نے ابلاغ کا ستیاناس کر دیا ہے۔ یہ اور ایسی ہی متعدد باتیں میں اس تبصرہ کے حوالے سے کرنا چاہتا تھا' مگر عجلت کی وجہ سے میں بے شمار مضامین نہیں باندھ سکا' لہٰذا اس تبصرے کو ادھورا ہی تصور کیا جائے۔

اگر پاتال میں اتر کر آسمان کو دیکھیں تو وہ تل برابر نظر آئے گا اور اگر کبھی اس کے برعکس صورت حال ہو اور آپ فضاؤں میں اڑ رہے ہوں' بلندیوں پر آپ کا بسیرا ہو تو

زمین بھی تل برابر نظر آئے گی۔ پاتال میں اترنے کا عمل گہرائی میں جانے یا غواصی کا عمل ہے تو آسمان میں اڑانے کا عمل بلندیوں کی طرف اٹھنے کا عمل ہے۔ زندگی جب کثافت میں اترتی ہے تو وہ اسیر دام مادہ ہو جاتی ہے' مگر جب زندگی کثافت سے اوپر اٹھتی ہے تو یہ لطافت آشنا ہوتی ہے۔ زمین میں اترنا خود اپنے وجود کو پانے' اپنی ذات سے جڑنے اور خود کو ٹٹولنے کا عمل ہے۔ اپنی شناخت اور اپنے تشخص کی بازیافت کی کوشش سے عبارت ہے اور آسمان کی طرف مائل بہ پرواز ہونا' بے کراں ہونا' نئی وسعتوں اور نئے امکانات کی بازیافت ہے۔ پاتال میں سے آسمان کو دیکھنا اور اسے تل برابر پانا اس کی بے حیثیتی بے مائیگی' یا جدید اصطلاح میں بے معنویت اور اس کی لغویت کو پانا ہے' آغا سہیل کے افسانوں میں ان کی روایت سے جڑنے کا شعور پاتال میں اترنے کا عمل ہے اور آسمان کو تل برابر جاننا جدید تہذیبی شعور کی کم مائیگی کا اظہار ہے۔ آپ ماضی کی رومانیت کے اسیر بھی ہیں مگر ماضی کے سوکھے ہوئے تنے پر نئی کونپلوں کے پھوٹنے کے تمنائی بھی ہیں۔ وہ زوال کی وجوہات پر کڑھتے بھی ہیں' نئے انسان کے حاصلات سے انہیں دلچسپی تو ہے' مگر وہ اس کے گرداگرد پھیلی ہوئی سائنسز سے خوف زدہ' نیپام بموں اور ہلاکت خیزی کے اسلحہ سے لرزاں و ترساں بھی ہیں اور شاید یہی وجہ ہے کہ انہیں اپنے وجود کی پاتال سے انسانیت کے مستقبل کا آسمان تل برابر نظر آتا ہے۔

"تل برابر آسمان" کے اس افسانوی مجموعے کی کئی خصوصیات قاری کی توجہ اپنی جانب مبذول کروا سکتی ہیں۔ سب سے بڑی خوبی تو یہی ہے کہ نہ صرف یہ کہ یہ مجموعہ اپنی ضخامت میں مختصر ہے' بلکہ اس کا ہر افسانہ بھی نہایت مختصر ہے اور بے جا قسم کی عبارت آرائی سے ان افسانوں کا دامن پاک صاف ہے۔ یہ افسانے اپنے مرکزی خیال کے قریب ترین رہتے ہیں اور جو تاثر ان کا مصنف اپنے قاری پر چھوڑنا چاہتا ہے' بڑی مہارت اور کامیابی کے ساتھ یہ افسانے اس کا ابلاغ دیتے ہیں۔ اداکاری پر ہر افسانہ ایک بھرپور تاثر چھوڑتا ہے۔ دوسری خوبی ان افسانوں کی نتھری اور دھلی ہوئی خوبصورت زبان ہے' جس کا ذائقہ قاری پر یوں اثر انداز ہوتا ہے کہ قاری چاہتا ہے کہ افسانہ ذرا دراز ہو اور حکایت

ذرا طولانی ہو جائے مگر قاری کو جلد احساس ہو جاتا ہے کہ افسانہ تو اسے ایک ٹھونگا دے کر تمام ہو چکا ہے۔

آغا سہیل صاحب کا طرز تحریر اور انداز نگارش ایک ایسے اسلوب کو ہمارے سامنے لاتا ہے' جو اردو زبان کو جدید بنانے' جدید لسانی تقاضوں کو پورا کرنے اور اردو زبان کو معیاری سانچوں میں ڈھالنے میں ہماری سمت فکر کو متعین کرتا ہے۔ ایک صاف ستھری سادہ زبان جو اظہار' تاثر اور ابلاغ فکر میں معیاری اور مثالی ہو سکتی ہے' وہ آپ کو "قل برابر آسمان" میں دکھائی دے گی۔ اگر میں یہ کہوں کہ زبان کا اعجاز اس کتاب کے دوسرے پہلوؤں پر چھایا ہوا ہے تو یہ زیادہ درست بات ہو گی۔ زبان کا اعجاز' فکر کے اعجاز پر محیط ہے۔ اس سلسلے میں افسانوں میں سے کئی حوالے دیئے جا سکتے ہیں مگر میری مجبوری یہ ہے کہ میں نے اس کتاب کو سطر سطر پڑھا ہے اور ہر سطر نے جب مجھے اپنی جدت اور تشکیل کے سحر میں جکڑ رکھا ہے تو یہ ناانصافی ہو گی کہ میں کسی ایک سطر کو دوسری پر ترجیح دوں۔ "قل برابر آسمان" افسانوی مجموعے کی اٹھان تاریخیت کے شعور پر ہوئی ہے۔ یہ افسانے جو افسانہ نگاری کی موضوعیت میں سے سفر کرتے ہوئے کسی تاریخی حوالے کی معروضیت میں اپنا دامن پھیلا دیتے ہیں۔ ہمارے سامنے صدیوں اور قرنوں کے فاصلے نکتوں اور دائروں میں سمیٹ دیتے ہیں اور ہم قوموں کے عروج و زوال کے آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھ سکتے ہیں۔ اور پہچان سکتے ہیں کہ قافلے نے سفر کا آغاز کہاں سے کن حالات میں کیا' کون کون سی منزل طے کیں اور زوال کی گھاٹیوں میں کہاں کہاں ہم بنی اسرائیلوں کی طرح بھٹکتے رہے اور پھر جب وادیوں اور میدانوں کی طرف رخت سفر باندھنے لگے تو ہمیں اپنے خیموں کی ٹوٹی ہوئی طنابوں اور بکھرے ہوئے سازو سامان کو سمیٹنے میں کیا کچھ کرنا پڑا۔ یوں تو آغا سہیل صاحب کے تمام افسانوں میں ہمارے تاریخی شعور کی بازگشت کسی نہ کسی آہنگ میں موجود ہے مگر عہد زوال میں قوموں کے بنتے بگڑتے مقدر کے تناظر میں آغا صاحب نے جو ہماری تصویر کھینچی ہے' وہ کسی طور سکرین سے محو نہیں ہوتی۔ اس افسانے میں ایک حساس شخص آج کا مسلمان ہے' جو اپنے بارے میں جدید علوم کے ماہرین وغیرہ جنہیں ڈاکٹروں اور نرسوں کی

علامت پیش کیا گیا ہے، کی مختلف النوع آراء سے مترددہے کہ یہ مریضہ یعنی امت مسلمہ یا خود پاکستانی قوم جاں بلب ہے اور صحت یاب نہیں ہو سکتی اور جب مصنف یہ کہتا ہے کہ:۔

"یا اللہ کیسے کرب میں مبتلا ہوں اور یہ کیسا عذاب ہے، جسے میں جھیل رہا ہوں۔"

وہ کرب تشویش اور اضطراب ہے، جو ہر مسلمان کے وجود کو لرزا رہا ہے اور پھر یہ تاریخ کا حکم ہے کہ:۔

"وہ بولا، بیٹا تو کہیں بھی جائے گا، ہرگز سکھ نہ پائے گا کہ کرب کا زہر تیرے رگ و پے میں دوڑا ہوا ہے اور تو اس شکنجے تو نہیں توڑ سکتا۔"

کیونکہ اپنے عہد زوال پر قانع ہو چکا ہے اور ہر طرف سے یہ تکرار عہد زوال کی تسبیح خوانی ہو رہی ہے۔ یہ عہد زوال ایک ایسا کرب اور تشویش ہے، جس سے مصنف نکلنا چاہتا ہے، وہ اپنے وجود کو بچا لے جانا چاہتا ہے۔ اس کی یہ خواہش اس تاثر سے ابھرتی ہے جو وہ ڈاکٹروں کے اختلافات کے اشدادو کے منطقی نتیجے میں دیکھتا ہے اور اسے سانحے میں اپنے تناظر سے ظاہر کرتا ہے۔ اسی طرح آغا صاحب کا افسانہ "جلا ہے جسم جہاں" میں جو اندھیری غار ہے، وہ جہالت، غربت اور بے جا ماضی پرستی کی علامت ہے، جس سے ہم باہر نکلنے سے گھبراتے ہیں۔ طرز کہن پر اڑنا کے استعارے اور علامت کے طور پر یہ اندھیری غار آئی ہے اور آئین نو سے ڈرنا وہ اجالا اور روشنی ہے، جس سے ہم خوفزدہ ہیں۔ اس افسانے کے کردار طرز کہن کے اندھیرے سے آئین نو کے اجالے میں آنے سے لرزاں ہیں۔ یہ افسانہ ہمارے فکری اور عمرانی شعور کے حوالے سے پروان چڑھا ہے اور بتاتا ہے کہ کس طرح عمرانی تغیر رونما ہوتا ہے اور امتوں اور قوموں کو ایک ذہنی حالت سے دوسری ذہنی حالت میں آتے کرب کے کیسے طوفانوں سے گزرنا پڑتا ہے، تاہم اس افسانے میں ایک اور لطیف طنز ہے کہ روشنی میں آتے آتے اپنے وجود کو بکھرنے سے بچانا بھی ضروری ہے، ورنہ یہ تیز روشنی ہمیں تہذیب نو کے اس مقام پر لے جائے گی کہ جہاں:۔

"ہوائی جہازوں سے بم برسائے گئے، آبادیاں تہس نہس ہو گئیں، عمارتیں

ڈھے گئیں' ٹینکوں نے مردوں' عورتوں اور بچوں کو مکانوں سمیت زمین میں دفن کر دیا' وہاں موت ہے' موت ہے۔"

یہ افسانہ تاریکی سے روشنی تک آنے اور پھر تیز روشنی کے اژدھے کے منہ سے انسان کو بچانے کے احساس سے مملو ہے۔ اس طرح بیعت' بادشاہ ظفر اور زینت محل' بے سمت راہیں۔ دروازہ بند ہے اور نوشتہ دیوار تقریباً۔ تمام ہی افسانے تاریخیت کے گہرے شعور پر اپنی اٹھان رکھتے ہیں۔ تاہم آغا سہیل صاحب نے بڑی خوبی اور مہارت سے ہمارے اس تاریخی شعور کے نام سال سے اپنے افسانوں کی تشکیل میں کام کیا ہے۔

جب میں تاریخیت کے شعور کی ان افسانوں میں بات کرتا ہوں تو میں دراصل ان افسانوں کی تند و تیز لے میں اپنے اسی ملی شعور کی بازگشت کو پاتا ہوں' جو حساس افسانہ نویس کے دل کے تاروں کے لئے مضراب ہے۔ دھیمے دھیمے سروں میں اپنے ملی شعور کی یہ بازگشت اور اپنی تہذیبی بازیافت یا ثقافتی زوال اور اس زوال سے اکتاہٹ اور اس سے فرار کرتے ہوئے نئے آدرشوں اور نئی توانائیوں کی طرف پیش قدمی کی دبی دبی آرزوئیں ہمیں متعدد افسانہ نگاروں میں ملتی ہے۔ بلکہ ہمارے ہاں تو افسانہ جس رومانوی فضا میں جنا' پلا اور جوان ہوا ہے' اس کی تو فکری مابعد الطبیعی حقیقت ہی ہمارے زوال' ہماری ٹوٹی ہوئی طنابوں' ہمارے سماجی' عمرانی ماحول کی ٹوٹ پھوٹ' ہماری رواجوں اور تہذیبی اور ثقافتی اکھاڑ پچھاڑ اور معاشی دھکم پیل سے شروع ہو کر اپنی تشکیل نو' بازیافت اور نئے آدرشوں کے ایجاب و حجاب سے ہوئی ہے۔ ہمارا نصف افسانہ ہمارے ماضی کا مرثیہ ہے اور باقی نصف نئی چکاچوند کا تبصرہ۔ ابھی اس کے تنے سے ہمارے وجود کا شگوفہ نہیں پھوٹا اور ہماری شناخت کی کونپلیں نہیں نکلیں۔ ہیئت کے اعتبار سے بھی ہمارا افسانہ ابھی چوں چوں کا مربہ ہے' اگرچہ ہمارا افسانہ اردو میں ایک توانا روایت کا حرف آغاز تو بن رہا ہے' مگر ہیئت کے حوالے سے وہ ابھی دوسروں کے تجربوں کی نقالی یا چربے سے آگے نہیں کھسک رہا۔ علامت کے حوالے سے کئی ایک نام گنوائے جا سکتے ہیں' مگر علامت میں بھی ابھی ہماری ایک طبع زاد صورت بننے اور بگڑنے کے عمل میں ہے۔ شاید علامت کو

ابھی ہم سمجھ نہیں پائے اور نہ اپنی کلاسیکی روایت کو آگے بڑھانے پر ہم آمادہ ہیں۔ مجھے آغا سہیل میں ہماری کلاسیکیت اور جدید علامت کی ایک امتزاجی منہاج کا پہلا تازہ مگر مگر ہلکا سا جھونکا ملا ہے اور اگر یہ دونوں یعنی کلاسیکیت اور علامت کے تال میل سے ایک نئی افسانوی تصویر بن گئی تو میں آغا سہیل کو بھی اس کا کچھ نہ کچھ کریڈٹ دوں گا۔ بہرحال آغا سہیل کے افسانوں کی جڑیں ہماری مابعد الطبیعی حقیقت میں موجود ہیں۔ ان کا مابعد الطبیعی شعور دوسروں کی اساطیر میں گندھا ہوا نہیں اور یہ نہ صرف ہجرتوں کا نوحہ اور بچھڑنے کا قلق یا پچھتاوا ہے۔ اس لئے کہ ہجرت اگر نقل مکانی کا نام ہے تو پھر تو گزرے ہوئے ماضی کو یاد کر کے دل سے ہوک نکلے گی ہی' لیکن اگر یہ ہجرت کا سفر قلب کی تبدیلی ہے اور اپنے وجود کو بچا کر ایک نئے آدرش اور نئے پیکر میں ڈھالنے کا عمل ہے' تو پھر ہجرت نئے پیکر میں خود کو سجانے کا عمل نہیں بلکہ پوری ماہیت کی تبدیلی کا قصہ ہے۔ اس لئے کہ پاتال میں اگر آسمان کو دیکھا جائے تو وہ تل برابر ہوگا۔ مگر پاتال سے باہر نیلگوں آسمان اور ستاروں سے دمکتی کہکشاں کو دیکھا جائے تو اس کی وسعتوں اور بے کرانیوں پر ایک ایسی حیرت غالب ہوگی جو طلب علم اور جوئیائے حقیقت کے لئے مہیج ہوگی۔ آغا سہیل کے یہ افسانے مختصر ہونے کے ساتھ ساتھ گہرائی اور وسعت لئے ہوئے ہیں۔ اس کی ہیئت اور فکر میں امتزاج بھی موجود ہے اور بیان میں شگفتگی' سادگی' سلاست اور تاثر ان کے افسانے کے حسن کو دوبالا کئے ہوئے ہے اور یہ ایک وصف ہے جو ان کے ہر افسانے کو مہکائے ہوئے ہے۔

پرورش لوح و قلم

ڈاکٹر طارق عزیز

ابتداء ہر کام کی مشکل ہوتی ہے' یہی مشکل مجھے اس وقت درپیش ہے کہ آغا سہیل کی افسانہ نگاری کے بارے میں' میں بات کہاں سے شروع کروں۔ کیونکہ ان افسانوں نے خود افسانے کی ابتداء کے متعلق پیش کئے جانے والے نظریات کو شک میں ڈال دیا ہے۔ آغا سہیل کے افسانے پڑھ کر مجھے یہ بات محض ایک مغالطہ نظر آتی ہے کہ افسانہ تنگیٔ وقت کے باعث معرض تحریر میں آیا۔ یعنی جب لوگوں کے پاس ناول پڑھنے کے لئے وقت نہ رہا تو افسانہ وجود میں آگیا۔ آغا سہیل کے ہاں افسانہ کسی خارجی عمل سے اصناف ادب کا حصہ نہیں بنا بلکہ افسانہ نگاری ان کی تخلیقی مجبوری ہے۔ ان کے متعلق یہ کہہ دینا آسان نہیں کہ اگر وہ افسانہ نگار نہ ہوتے تو بہت اچھے شاعر ہوتے--- یہ فتویٰ دینا اس لئے آسان نہیں کہ آغا سہیل نے افسانہ نگاری قلم کا ذائقہ تبدیل کرنے کے لئے اختیار نہیں کی بلکہ تخلیقی تجربے کے حوالے سے ان کی اولین و آخری حیثیت افسانہ نگاری کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں موضوعات اور اسلوب کا ایک پورا نظام موجود ہے' جو ہم عصر افسانہ نگاروں میں سے کسی اور کے ہاں نظر نہیں آتا۔

بیسویں صدی کے اوائل میں اردو کا افسانوی ادب عصری شعور اور ماحولیاتی تقاضوں سے آگاہ ہو رہا تھا کہ پہلی جنگ عظیم شروع ہو گئی۔ ابھی اس جنگ کے اثرات ختم نہ ہوئے تھے کہ دوسری جنگ عظیم کے خطرات منڈلانے لگے۔ اس جنگ نے لاکھوں انسانی جانوں کا خراج وصول کیا اور ابھی اس کے آنسو خشک نہ ہوئے تھے کہ ۱۹۴۷ء میں برصغیر کی تقسیم کا واقعہ رونما ہوا جس کے ساتھ ہی انتقال آبادی کا عمل شروع ہو گیا۔ اپنے پیاروں سے آخری بار گلے ملتے ہوئے' درودیوار پر حسرت کی نگاہ ڈالنے کا منظر وہ تہذیبی المیہ تھا' جس نے وسیع پیمانے پر انسانی سائیکی کو متاثر کیا۔ پاکستان آنے والے اور پاکستان بنانے والے لوگوں نے جو خواب دیکھے تھے' ان کی تعبیر اتنی گھناؤنی نکلی کہ حسرت زدہ انسان

خوفزدہ ہو گیا۔ اوپر سے جھوٹے کلیمز اور جعلی الاٹمنٹوں کے چکر نے بنیادی اقتصادی ڈھانچے اور اخلاقی نظام ہی کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔ دولت کی ایک ایسی دوڑ شروع ہو گئی جس میں حصہ لینے والے تھکنے کی بجائے ہر لمحہ تازہ دم ہوتے رہے۔ یہ دوڑ اب تک جاری ہے اور اس کے کھلاڑیوں میں آئے دن اضافہ ہو رہا ہے۔

دوسری طرف عالمی سطح پر بڑی طاقتوں کی چیرہ دستیوں' استحصالی ہتھکنڈوں' نسلی منافرتوں نے تیسری دنیا میں بالخصوص حساس ادیبوں کو جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس کے موقع پر جو اعلان نامہ جاری کیا گیا' اس کی نظریاتی اساس کو مضبوط کرنے کی ضرورت اب ہمیشہ سے زیادہ محسوس کی جانے لگی۔ عالمی آگہی اور قومی مسائل کے اس پس منظر میں آغا سہیل کا ذہنی وطن وہ نہ رہا' جس میں وہ بس رہے تھے۔ انہوں نے کہا ہمارے ذہنی وطن میں اقتصادی ناہمواری' فروغ جہالت' عدم انصاف' تذلیل حقوق اور معقول انتشار نہیں چل سکتا' ہم اس کے خلاف احتجاج کرتے ہیں اور اپنے قلم کو اس مقصد کے لئے وقف کرتے ہیں کہ وہ تعبیر کو کسی نئے خواب میں ڈھال دے۔ ادب کا اعلیٰ ترین منصب یہ ہے کہ وہ احتجاج کرتا ہے۔ احتجاج کی یہی لے آغا سہیل کا نظریہ فن ہے۔ یہ لے ان کے ہر افسانے میں لفظوں کے بیچ' یا سطروں کے بھیتر کہیں موجود رہتی ہے اور اسی سے ان کے موضوعات کا تعین ہوتا ہے۔ ان موضوعات کے لئے کہانیوں کا تانا بانا انہوں نے اس سرزمین پر اگنے والے درختوں کے ریشوں سے بنا ہے کہ ان کے افسانوں کا خمیر اور اس خمیر کا ضمیر اسی مٹی سے پھوٹتا ہے۔

موضوعاتی اعتبار سے آغا سہیل کے ہاں مسلسل ارتقاء پایا جاتا ہے۔ اسی لئے ان کے ہر دور کے افسانے کو نئی نسل کا افسانہ قرار دیا جا سکتا ہے' کیونکہ کسی بھی نسل کا تعلق عمر سے نہیں بلکہ سوچ کے انداز سے ہوتا ہے۔ عمر کے اعتبار سے بزرگ نسل کے لوگ اگر نوجوانوں کی طرح سوچتے ہیں تو وہ نوجوان نسل کا نمائندہ کہلائے جانے کے حقدار ہیں۔ آغا سہیل نے بھی عمر کے ہر حصے میں لمحہ موجود کے حوالے سے سوچا ہے۔ یہ سچ ہے کہ ان کے ہاں کہیں کہیں تہذیبی احساس تفاخر کا شائبہ گزرتا ہے۔ لیکن یہ احساس تفاخر' کسی احساس

زیاں کے سبب سے نہیں، بلکہ لمحہ موجود کے خلاف ردعمل کی وجہ سے ہے۔ تقسیم ہندوستان کے بعد پاکستان آنے والے ادیبوں اور شاعروں پر الزام یہ لگایا جاتا ہے کہ وہ ایک خاص طرح کے نسٹلجیا (Nostalgia) میں مبتلا ہیں۔ یہ بات کسی حد تک درست بھی ہے اور فطری بھی۔ لیکن آغا سہیل واحد افسانہ نگار ہیں جن کے ہاں اس حوالے سے کوئی احساس زیاں نہیں پایا جاتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنی وابستگی (کومٹ منٹ) میں سچے ہیں۔ ان کے ہاں معاملات اور معیارات حیات کی سطح بلند ہے۔ "بدلتا ہے رنگ آسماں" میں افسانہ "ہار" "ٹھکانہ کہیں نہیں" "موئے آتش دیدہ" "بدلتا ہے رنگ آسماں" "گل سرا" اور "قوم" میں لکھنؤ کا جو ذکر ہے وہ نسٹلجیا نہیں، بلکہ ان افسانوں میں اپنی کومٹ منٹ کا زیادہ واضح اور جاندار جواز مہیا کیا گیا ہے۔ "ٹھکانہ کہیں نہیں" کا یہ اقتباس ملاحظہ کیجئے:۔

"مرشد آباد میں علی سفیان کی جائیداد غیر منقولہ بے حد اور بے حساب تھی اور اسی طرح لکھنؤ اور اطراف لکھنؤ میں ایک بڑی جاگیر کی طاہرہ باجی بھی مالک تھیں، لیکن دونوں میں سے کسی ایک کو بھی اس کی پرواہ تک نہ تھی۔ شروع شروع میں تو طاہرہ باجی نے بانسوں اور چٹائی کے بنے ہوئے مکانوں میں گزر بسر کی، پھر کہیں دو چار سال کے بعد چھوٹا سا پختہ مکان کرائے پر میسر آیا، لیکن دونوں کو خوشی تھی تو اس بات کی کہ اس سرزمین سے انگریز کو نکال کر مسلمانوں کے لئے پاکستان حاصل کر لیا گیا ہے اور مسلمانوں کو ہندوؤں کی انتہاپسند متعصبانہ اور مجنونانہ مذہبی احیائی ذہنیت سے چھٹکارہ مل گیا ہے۔ جس کا اظہار اجتماعی طور پر انگریزوں کی سرپرستی میں انہوں نے ہزار بار کیا اور اسے ایک خطرناک تحریک کی شکل میں برصغیر میں قائم کر لیا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ برصغیر میں اسلام کی نشاۃ الثانیہ کا دور اسی طرح شروع کیا جا سکتا ہے اور جھونپڑیوں میں رہنا اس لحاظ سے کوئی معنی نہیں رکھتا کیونکہ مسلمانوں کے لئے ایک مضبوط قلعہ پاکستان معرض وجود میں آ چکا ہے۔ لہٰذا مرشد آباد اور لکھنؤ میں چھوڑی ہوئی جائیدادیں محض گرد منزل ہیں، منزل نہیں۔ منزل تو پاکستان ہے۔"

(افسانہ: ٹھکانہ کہیں نہیں)

لیکن پاکستان ہی میں انہیں افسانہ "پرچم" بھی لکھنا پڑا:۔

"اس نے کئی بار سوچا کہ وہ کہے کہ وہ پاگل نہیں ہے لیکن اسے کسی نے کچھ کہنے کی مہلت ہی نہ دی۔ ایک آدمی نے اسے پرے دھکیلتے ہوئے کہا:۔

"اب ہٹ یہاں سے"

وہ بولا:۔ "دھکیلو نہیں بابو جی"

اسے بولتے ہوئے دیکھ کر پرچم تقسیم کرنے والا بولا:۔ "کیا تم کھوکھے پہ پرچم لگاؤ گے؟"

اس نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا:۔

"میں اس کی قمیض بنوا کر پہنوں گا؟"

اس نے ہجوم کو اپنا ننگا بدن دکھاتے ہوئے کہا:۔

"دیکھو مجھے سردی لگتی ہے۔"

ہجوم میں پھر قہقہے گونجے اور ایک آدمی نے اسے پرے دھکیل دیا۔"

(افسانہ: پرچم)

پاکستان کو منزل قرار دینے اور افسانہ "پرچم" تحریر کرنے سے نظریاتی وابستگی' نظریاتی منشور اور موضوعاتی تعین کے پہلے مرحلے کی تکمیل ہو جاتی ہے۔

دوسرے مرحلے سے جو نوحہ شروع ہوتا ہے' وہ صورت حال کی غیر مبہم وضاحت کرتا ہے۔ اس مرحلے میں وہ عمر کی سہانی یادوں کو بہت پیچھے چھوڑ چکے ہیں۔ وطن کے ساتھ محبت مسلم ہے' لیکن کیا کیجئے کہ سارا ملک "شہر نا پرساں" بن گیا ہے۔ اس مرحلے میں انہوں نے "جزاک اللہ" کی صورت میں سماج کے منہ پر زوردار طمانچہ مارا ہے۔ پریم چند کے افسانہ "کفن" کے بعد آغا سہیل کا "جزاک اللہ" واحد افسانہ ہے جس میں اتنے سادہ لیکن بھرپور انداز میں نظریے کی پیش کش ہوئی ہے۔ یہ افسانہ مذہب کی تردید نہیں لیکن یہ اعلان نامہ ضرور ہے کہ مذہب تبھی موثر ہو سکتا ہے' جب اسے ماننے والے کو کم از کم قوت لایموت تو میسر ہو۔

افسانوی مجموعے "شہر نا پرساں" میں اس نوعیت کے کئی سوالات اٹھائے گئے

ہیں کہ کیا یہ ملک ہم نے اسی لئے حاصل کیا تھا کہ ہماری زندگیاں ایک کرب میں مبتلا ہو جائیں؟ ہمارے نوے ہزار مسلح فوجی کسی گہری سازش کے تحت قید کرا دیئے جائیں اور ان کی معصوم بچیاں گڑیا کو اپنے سینے سے لگا کر سونے پر مجبور ہو جائیں؟ قحط ایک مٹھی چاول کے لئے ہماری بیٹیوں کو طوائف بننے پر مجبور کر دے؟ ہم کھوئے ہوئے بچے کی طرح اپنی شناخت بھول جائیں؟ نہیں' اگر یہ ہمارا وطن ہے تو اس میں یہ سب کچھ نہیں چلے گا۔ ہمیں ان حالات کا بغور جائزہ لینا ہوگا' جنہوں نے ہمیں اس صورت حال تک پہنچایا ہے۔

"ہم کو دانشور مانتا ہی کون ہے؟ بیورو کریسی نے سیاستدانوں اور دانشوروں کو اپنے دام تزویر میں ایسا الجھایا ہے کہ سیاست بھی انہی کی چلتی ہے اور دانشوری بھی۔ یہ بادشاہ گر لوگ ہیں' ان سے ڈرو۔"

(افسانہ: شہرِ نا پرساں")

اس کے ساتھ ساتھ ہمیں اس شعور کو مدہم کرنا ہوگا جس نے ہم سے ہماری نیندیں' ہمارے خواب چھین لئے ہیں:۔

"میں نے کبھی کبھی یہ غور کیا ہے کہ صنعتی زندگی کی جو عمارت اونچی اور اونچی ہوتی چلی جا رہی ہے اس سے ہماری نظریں چھنی ہوئی اونچی اور اونچی ہوتی' آسمان تک جا پہنچی ہیں۔ زمین سے ہمارا ناتا روز بروز ٹوٹ رہا ہے۔ زمین پر مٹی' خاک دھول' ذرات' کانیں' کھیتیاں' درخت' سبھی کچھ تو ہوتے ہیں اور ان سے ثقافتیں پھوٹتی ہیں' موسم جنم لیتے ہیں۔ موسموں کے گیت آبشاروں کی طرح ابلتے ہیں۔ پھر یہی نہیں' ہم بھی تو اسی مٹی سے خمیر کی صورت میں اٹھے ہیں اور اسی میں جالیں گے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ صنعتی زندگی ایک لعنت ہے۔ صنعت کو پنپنا چاہئے' مگر ہمارا ناتا زمین سے قائم رہنا چاہئے۔ کالونیوں اور بستیوں میں رشتہ ہونا چاہئے۔ خواہ یہ رشتہ گیتوں کا ہو' رقص کا ہو' فنون لطیفہ کے دوسرے مظاہر کا ہو' لیکن ہونا چاہئے۔ یہ درست ہے کہ ہمارے گاؤں سے پنگھٹ ختم ہو رہے ہیں اور ٹیوب ویل لگتے چلے جا رہے ہیں اور کھیتیاں بھی صنعت بنتی چلی جا رہی ہیں لیکن وہ جو پنگھٹ کے گیت کنواریوں کے دلوں کی دھڑکنیں سناتے تھے' کہاں دفن ہو گئے ہیں؟ ان

صنعتوں میں اجتماعی زندگی کے شعور کے ساتھ ساتھ اجتماعی جذبات بھی لاؤ' ورنہ اس کارگاہ میں اتنی گھٹن ہو جائے گی کہ سانس لینا دوبھر ہو جائے گا۔"

(افسانہ: گیوی اے بے پی)

یہ اقتباس سرمایہ دارانہ نظام اور اس کے مضمرات کی نشاندہی کرتا ہے اور خبردار کرتا ہے کہ اگر اجتماعی زندگی کے شعور کے ساتھ ساتھ اجتماعی جذبات کو فروغ نہ دیا گیا تو اس زندگی میں اتنی گھٹن ہو جائے گی کہ سانس لینا بھی مشکل ہو جائے گا۔ اس سے آغا سہیل کے نظریہ حیات کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ وہ مشرق کے لئے کسی مستعار سرمایہ دارانہ نظام کے حق میں نہیں۔ مشرق کی اپنی اقدار کا اپنا اسلوب حیات ہے جو مغرب کے جذبات سے عاری مادی زندگی کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ سامراجی شکنجوں سے نجات حاصل کر کے تیسری دنیا کو اپنا نظام حیات خود وضع کرنا ہوگا۔

"یہ سامراج ہے۔ سامراج استحصالی نظام قائم رکھنا چاہتا ہے۔ یہ تیسری دنیا کے خلاف جارحانہ سازش ہے۔ تیسری دنیا جہاں افلاس ہے' بھوک ہے' سامراجی ملکوں کی پرکیپٹا انکم (Percapita Income) بڑھتی جا رہی ہے' تیسری دنیا کے ملکوں کی گھٹتی جا رہی ہے۔ ہمارا مال ان کی منڈیوں میں سستا ہوتا جا رہا ہے۔ ان کا گھٹیا اور معمولی مال ہم مہنگے داموں خریدنے پر مجبور ہیں۔ سامراج یہی نظام قائم رکھنا چاہتا ہے۔ چاہے کتنے ہی ویت نام' کوریا اور روڈیشیا کے المیے جنم لیتے رہیں' کتنے ہی فلسطینی آوارہ وطن رہیں' کتنے ہی انسان....."

(افسانہ: انا اللہ")

یہاں موضوعات کا دائرہ مزید پھیل گیا ہے' کیونکہ "شہر نا پرساں" کی صورت حال تبدیل نہیں ہوئی۔ خواہشیں نامراد اور دعائیں بے اثر ٹھہریں۔ بھوک' افلاس' ناانصافی' جبر' ہسٹریا اور اداسی کے کرب میں مبتلا انسان کے سر پر پھیلے ہوئے وسیع و عریض آسمان نے بھی جب آنکھیں چرا لیں تو مایوس انسان کو یہ "قل برابر آسمان" دکھائی دینے لگے ..... محدود' بے بس' اپنے آپ میں سمٹا ہوا۔

یہاں سے نظریاتی وابستگی اور موضوعاتی تنوع کا تیسرا مرحلہ شروع ہوتا ہے۔ ایک طرف کومٹ منٹ زیادہ گہری ہوئی ہے تو دوسری طرف صورت حال پہلے سے زیادہ مشکوک ہو گئی ہے۔ کبھی کبھی یوں ہوتا ہے کہ ہر بات جھوٹ لگتی ہے۔ ہر شے تبدیل ہوتی ہوئی۔ چیزوں کی بنیادی ماہیت ہی پر شک گزرنے لگتا ہے۔ انسان سوچتا ہے.... کیا معلوم جسے میں میز سمجھتا ہوں وہ کرسی ہو۔ یا صدیوں پہلے کسی نے کرسی کا نام میز رکھ دیا ہو اور میز کا کرسی اور جو گم ہے، وہ گم نہ ہو، صرف چھپ گیا ہو، ہماری بے بسی اور تلاش پر ہنسنے کے لئے.... سارا منظر غیر حقیقی ہو جاتا ہے۔ پیاس، پانی، پناہ سب ایک سے لگتے ہیں۔ اس بے یقینی کی وجہ یہ ہے کہ اپنی بے بسی کا ادراک مزید گہرا ہو گیا ہے۔ قدیم فلسفہ ہائے زندگی حقیر ہونے لگے ہیں۔ یہ دنیا دکھوں کا گھر نہیں۔ بلکہ صرف تیسری دنیا دکھوں کا گھر ہے۔ اس مقام پر بیانیہ انداز کارگر نہیں رہتا۔ آغا سہیل علامتوں میں پناہ ڈھونڈتے ہیں، لیکن یہ علامتیں ذاتی نوعیت کی نہیں کہ قاری تک ابلاغ ہی نہ کریں بلکہ یہ کھوئی ہوئی عظمت رفتہ اور گم شدہ وراثت سے ناطہ جوڑنے کی سعی کرتی ہیں۔ اب آغا سہیل بین الاقوامی سطح پر انسانی کرب اور حقائق کرب کو محسوس کرنے لگے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ جدید سائنس نے انسان کو بعض سہولتوں سے فیضیاب کیا ہے، لیکن اس کی اکثر ایجادات اتنی مہلک اور جان لیوا ہیں کہ ان کے برعکس عہد قدیم پسندیدہ ہو جاتا ہے۔ جدید تہذیب اور قدیم تمدن کا جو تقابل "جلا ہے جسم جہاں" میں پیش کیا گیا ہے۔ اس سے بہتر تقابل آج تک کسی افسانے کا موضوع نہیں بنا۔ "تسمہ پا" میں انسان کی کایا کلپ ہو چکی ہے۔ جدید مشینی دور نے انسانی اعصاب کو اس طرح تھکا دیا ہے کہ انسان، انسان نہیں رہا، جانور بن گیا ہے اور اپنے ضمیر اور وجود کا بوجھ لئے اپنے آپ کو گھسیٹ رہا ہے۔ "تسمہ پا" اسی المیے کا بیان ہے۔ "لمن الملک الیوم" میں تاریخ اپنی وسیع لیکن علامتی تفہیم میں کئی المیوں کی نشاندہی کرتی ہے۔

مقامی، قومی، اور بین الاقوامی سطح کے بعد آغا سہیل کی نظریاتی اور موضوعاتی وسعت روحانی تناظر میں داخل ہوتی ہے۔ مجموعہ "اگن کنڈلی" روحانی اذیت کا وہ نقطہ آغاز ہے، جب انسانی شعور کی قلب ماہیت ہو جاتی ہے۔ یہ چوتھا مرحلہ داخلی اور خارجی کیفیات کا

مکمل امتزاج ہے۔ "محتاط رہیے" میں آغا سہیل کو صوفی یا مابعد الطبیعاتی افسانہ نگار قرار نہیں دے رہا۔ میرا اشارہ صرف روحانی کرب اور اس سے نجات کے عمل کی طرف ہے۔

"بازوؤں سے ہمارے ہاتھ لٹک لٹک کر ایسے لیوترے ہو چکے ہیں کہ بلا تکلف پاؤں کے پنجوں تک پہنچ جاتے ہیں' جن کے سبب ہم چوپایوں کی طرح بآسانی چل سکتے ہیں' بلکہ ہم میں سے بیشتر افراد چوپایوں کی طرح چلنے میں زیادہ عافیت محسوس کرتے ہیں اور جب ہم پر کوڑے برستے ہیں اور ہم کراہتے ہیں تو ہماری گویائی ہماری زبانوں پر دہکتے ہوئے انگارے کی طرح نمودار ہوتی ہے اور ہمیں یوں لگتا ہے کہ ہم کراہ نہیں رہے ہیں' بلکہ قربانی کے بکرے کی طرح چھری کے نیچے بلبلا رہے ہیں اور ہم سب مرگ انبوہ میں مبتلا ہیں ہم سب کون ہیں؟ ہم کو کچھ پتہ نہیں۔ ہماری کوئی شناخت اور پہچان نہیں ہے۔ ہمارا کوئی ماضی نہیں ہے۔ ہمارا کوئی مستقبل نہیں ہے۔ جو کچھ ہے سو حال ہی حال ہے اور حال کا احوال یہ ہے کہ ہماری سوچ اور فکر کے حدود اربع سکڑ سمٹ کر مختصر ہوتے جا رہے ہیں۔ ہماری سوچ اور دائروں کو سکڑنے اور سمٹنے میں کس کا داخل ہے' ہمیں کچھ پتہ نہیں' آنکھیں جو کبھی ماتھے کے نیچے واقع تھیں' دور دور تک دیکھتی تھیں۔ سوچ اور فکر کے دائرہ ذہن کے افق کو پھیلاتے تھے۔ کائنات کی پہنائیاں اور وسعتیں ذہن میں روشنی کی بجلیاں دوڑاتی تھیں' لیکن نہ جانے کیا ہوا کہ اچانک سب کچھ بدل گیا۔ آنکھیں اٹھا کر ایڑیوں میں لگا دی گئیں اور ہمارا حلیہ بگاڑ کر اور ہمیں مسخ کر کے اس حال کو پہنچا دیا گیا اور یوں ہمیں نامعلوم سمت کی طرف ہانکا جا رہا ہے۔ ہم انبوہ کثیر اور جم غفیر کی صورت میں لشتم پشتم گھسٹ رہے ہیں۔ چل رہے ہیں اور بس چل رہے ہیں اور چلتے ہی جا رہے ہیں اور ہمارا کوئی پرسان حال نہیں ہے۔" (افسانہ: اگن کنڈلی)

جبر کی یہ کیسی فضا ہے جس میں کوئی اپنی چال نہیں چل رہا۔ یہ کیسا سفر ہے' جس میں راستوں کا کوئی تعین نہیں رہا۔ یہ کیسی ہونی ہے کہ سب دوسروں کی مرضی کے تابع زندگی کے دن گزار رہے ہیں:-

میری ساری زندگی کو بے ثمر اس نے کیا

عمر میری تھی مگر اس کو بسر اس نے کیا

"قصہ پانچویں درویش کا" اپنے اندر کئی جہتیں رکھتا ہے۔ یہ اس کرب کی نشان دہی بھی کرتا ہے جو اپنے ہی وطن میں رہنے والے جلاوطنوں پر طاری ہوتا ہے۔ جب مقام رسائی یاد نہیں رہتا اور درد نارسائی حد سے بڑھ جاتا ہے جب اپنی ذات کی کم اہمیتی کے ساتھ ہی ہر چیز بے وقعت اور بے حیثیت ہو جاتی ہے تو بے معنویت کے ان لمحات میں "سانچ کی آنچ" روح کو سلگانے لگتی ہے، تب انسان روشنی کی تلاش میں نکلتا ہے۔ یہاں آغا سہیل سوال کرتے ہیں:۔

"کیا روشنی کا یہ سورج اس کے دل کے افق پر طلوع ہو رہا ہے۔"

"لیکن اس سوال کا جواب ہم میں سے کس کے پاس ہے!"

آغا سہیل کے اس موضوعاتی نظام کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے افسانے ایک عہد سے شروع ہو کر رفتہ رفتہ آگے بڑھتے ہیں۔ ان میں عصری آشوب کا ایک تسلسل ہے، جس سے نہ صرف پاکستان بلکہ پوری تیسری دنیا کا سیاسی، سماجی اور عمرانی جائزہ مرتب ہوتا ہے۔ یوں ایک نہایت بلند ذہنی سطح پر یہ افسانے ایک ناول کا درجہ اختیار کر لیتے ہیں، جس کی تکنیک روایتی ناول سے یکسر مختلف ہے۔

آغا سہیل کے ہاں افسانے کا اختتام بھی روایتی انداز سے ہٹ کر ہوتا ہے۔ وہ افسانے میں پیش کئے گئے انداز سے ہٹ کر ہوتا ہے۔ وہ افسانے میں پیش کئے گئے زندگی کے ٹکڑے کو مکمل زندگی تصور نہیں کرتے بلکہ ان کے نزدیک زندگی کا دھارا ہمیشہ چلتا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر افسانے کا اختتام اچانک ہوتا ہے۔ پہلی نظر میں یہ اچانک اختتام افسانے کی تفہیم میں رکاوٹ بنتا ہے لیکن بغور اور مکرر توجہ کرنے سے پڑھنے والے پر کئی در وا ہوتے ہیں۔ یہ پہلوداری منٹو کے بعد صرف آغا سہیل کے حصے میں آئی ہے۔

اب آیئے ان افسانوں کے اسلوب بیان کی طرف، ہمارے ہاں عام طور پر خیال اور علامتی تجربوں کو اتنی اہمیت دی گئی کہ اسلوب بیان کا سلیقہ یکسر نظر انداز ہو گیا۔ فنی اعتبار

سے کسی نے اس طرف توجہ نہ دی۔ آغا سہیل ان گنے چنے چند افسانہ نگاروں میں سے ہیں' جنہوں نے اسلوب بیان کو ایک شائستگی اور سنجیدگی عطا کی ہے۔ اس اسلوب میں تہذیبی رکھ رکھاؤ اور لسانی وضعداری کا لحاظ پایا جاتا ہے۔ مجھے اندازہ نہیں کہ یہ اسلوب بیان ان کے ہاں لاشعوری طور پر در آیا ہے یا انہوں نے شعوری طور پر اسے اختیار کیا ہے۔ بہرحال یہ اسلوب تحریر جب ان کے موضوع سے ہم آہنگ ہوتا ہے تو افسانے میں ایک نامعلوم سی بے چینی' ایک عجیب سی اداسی چھا جاتی ہے۔ ایک ایسی اداسی جو ہم سب کے ساتھ ازل سے لگی ہوئی ہے۔ آغا سہیل کے ہاں احساس کی چنگاریاں سی پھوٹتی محسوس ہوتی ہیں اور قاری دیر تک افسانے کی اداس ساعتوں میں کھویا رہتا ہے۔

لفظ "روشنی" آغا سہیل کی افسانوی لغت کا اہم ترین لفظ ہے۔ یہ لفظ کئی کئی اطراف سے آنکھوں کو اپنے وجود کا احساس دلاتا ہے۔ کبھی یہ لفظ جہالت کا حریف بن کر سامنے آتا ہے کہیں جبر کی گھٹاٹوپ وادیوں سے انسان کے لئے امید کی کرن بنتا ہے' کبھی انسان وجود کے اندر' اسکی رگوں' شریانوں اور وریدوں میں نور کی کرن بنکر دوڑتا پھرتا ہے' کبھی کور آنکھیں اس کے لئے ترستی ہیں' کبھی نگاہیں خیرہ ہو جاتی ہیں کہیں یہ روشنی طبع ہے کہیں نوید فکر۔ اس علامت کی اور بھی کئی تفاہیم کی جاسکتی ہیں' کیونکہ آغا سہیل کے ہاں اس لفظ کی معنویت لامحدود ہے۔ لیکن ایک بات طے ہے کہ یہ علامت تیسری دنیا میں "روشنی" کے فقدان کے اس احساس سے متکلم ہوتی ہے' جس کے عدم وجود کی خواہش آغا سہیل کے نظریاتی منشور کا حصہ ہے۔ اسی طرح درخت کی علامت بھی آغا سہیل کی افسانوی ڈکشن میں خاصی اہمیت کی حامل ہے۔ درخت جس کی شاخیں جب پھلتی پھولتی اور پھیلتی ہیں تو زمین اور آسمان کے درمیان خلا کو پر کر دیتی ہیں' لیکن جس کی جڑیں اپنی زمین میں پیوست رہتی ہیں کبھی کبھی کوئی پیڑ انسان کی ذات میں بھی اگتا ہے اور انسان اسکی چھاؤں میں تھوڑی دیر کے لئے سستا لیتا ہے۔

جہاں تک کردار نگاری کا تعلق ہے آغا سہیل کے ہاں اس کا کوئی خصوصی التزام نہیں ملتا۔ اس لئے کہ آغا سہیل محض کہانی کار نہیں بلکہ نظریاتی افسانہ نگار ہیں۔ دنیا

میں تین قسم کے لوگ پائے جاتے ہیں ایک تو وہ جو صرف شخصیات کے بارے میں سوچتے رہتے ہیں' اس سے بلند سطح کے لوگ واقعات کو اپنا موضوع بناتے ہیں' جبکہ اعلیٰ ترین درجے کے لوگوں کا موضوع نظریات ہوتے ہیں۔ نظریات' جو شخصیات اور واقعات کو تبدیل کرنے کی طاقت رکھتے ہیں۔ آغا سہیل کے افسانوی کردار ہماری روزمرہ زندگی کے کردار ہیں۔ چلتے پھرتے' مرتے جیتے' روتے ہنستے کردار۔ آغا سہیل انہی کرداروں کے ذریعے چپکے سے اپنے نظریات کا اظہار کر جاتے ہیں۔ یوں ان کے نزدیک نظریہ' کردار سے زیادہ اہم ہو جاتا ہے۔ اور اس حوالے سے ادیبوں کی درجہ بندی میں پہلے ہی کر چکا ہوں۔

آغا سہیل کی افسانہ نگاری

ڈاکٹر فردوس انور قاضی

یہ تحریر ڈاکٹر فردوس انور قاضی کے مقالے "اردو افسانہ نگاری کے رجحانات" سے لی گئی ہے۔ راقم کو اس تحریر کے بعض مندرجات سے اتفاق نہیں ہے۔

(مرتب)

آغا سہیل کے موضوعات میں تنوع ہے۔ انہوں نے موجودہ عہد کے بڑے بڑے موضوعات کو ہی اپنے لیے مخصوص نہیں کیا ہے بلکہ ان کے افسانوں میں تاریخی واقعات، عہد حاضر کی کشمکش، غیر متوازن جنسی زندگی، سیاست معیشت تہذیبی اور روحانی بے اطمینانی اور سماجی زندگی کے بہت سے پہلو ملتے ہیں۔ وہ ایک کامیاب قصہ گو کی طرح واقعات در واقعات کہانی کو آگے بڑھاتے ہیں۔ بعض افسانے پڑھنے میں دلچسپ ہیں لیکن ان کے افسانوں میں دلچسپی اور کہانی ہونے کے باوجود تسلسل کی کمی کا احساس رہتا ہے۔ ان کے افسانوں کے کرداروں اور واقعات کو دلچسپی سے پڑھا تو جا سکتا ہے لیکن ان میں وہ فضا نہیں ابھرتی جو ذہن میں بس جانے والی ہو اور نہ کرداروں میں وہ قوت اور توانائی پیدا ہوتی ہی جو افسانے کو بقائے دوام عطا کر سکے۔

افسانہ "پتنگا" میں ماضی ہے لکھنؤی تہذیب، محل کی زندگی، بیگمات، خواص میں لونڈیاں ان کے عشوے غمزے گویا ایک خاص عہد اور خاص طبقہ کی تاریخی فضا جاگتی ہے۔ داستان کا دلکش انداز لیے کہانی آگے بڑھتی ہے۔ کرداروں سے دلچسپی پیدا ہونے لگتی ہے۔ لیکن افسانے کے اختتام پر سب کچھ ختم ہو جاتا ہے۔ اس کا سبب غالباً اس افسانے کا کمزور انجام ہے جو افسانے کے تمام تاثر کو ایک ساتھ ختم کر دیتا ہے۔ یہ چیز آغا سہیل کے فنی اسرار و رموز سے ناواقفیت کا احساس دلاتی ہے اسطرح افسانہ "کنجی" جو ایک کرداری افسانہ ا میں بھی مختلف واقعات کی کڑیاں ایک دوسری ملتی کہانی کو انجام کی طرف

لے جاتی ہیں۔ لیکن اس میں بھی آغا سہیل "مکھن سنگھ" کے کردار کو کو ابھارنے میں ناکام رہے ہیں۔ اس کردار کا وہ تاثر پیدا نہیں ہوتا جو واقعات کے پس منظر میں بننا چاہئے۔ ان کے ذہن پر مقصد اتنا حاوی رہتا ہے کہ وہ فنی تقاضوں کو نظرانداز کر جاتے ہیں۔ اس افسانے میں جنگ کے بعد کی صورتحال میں مغویہ لڑکیوں کی خرید و فروخت کے مکروہ کاروبار کو دکھانا مقصود ہے۔ مگر یہ چیز اتنا ہی اثر ڈالتی ہے جتنا اثر اس قسم کی خبر پڑھ کر پیدا ہو سکتا ہے۔ اس طرح افسانہ "سوودار کوٹ" ایک معاشرتی کہانی ہے یہ کہانی بھی عموی واقعات کے عموی بے لطف بیان سے آگے نہیں بڑھتی ان کے کردار جذبات و احساسات سے عاری نظر آتے ہیں۔ وہ میکانکی انداز میں ایک داستان کے اشاروں پر عمل کرتے ہیں۔ ان میں زندگی کی حرکت اور توانائی پیدا نہیں ہوتی۔ منشا یاد کوئی بڑے افسانہ نگار نہیں ہیں مگر انہوں نے جس کردار کو پیش کیا ہے اس کے خارجی ماحول اور داخلی احساسات کو مکمل فنی گرفت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس لیے ان کے سادہ سے سادہ جملوں اور واقعات میں بھی زندگی کا احساس ملتا ہے۔ پڑھنے والا ان کے افسانوی کرداروں اور فضا سے بے تعلقی کے ساتھ نہیں گزر سکتا۔ ان کے کرداروں کو محسوس کرتا ہے اسے رکنا پڑتا ہے ان سب سے ملنا پڑتا ہے جبکہ آغا سہیل کے کردار ہمیں رکنے پر مجبور نہیں کرتے انہیں پڑھ کر ہم یوں گزر جاتے ہیں جیسے بازار میں مختلف لوگوں کو دیکھتے ہوئے گزرتے ہیں۔

ان کے افسانوں میں کسی بڑے افسانہ نگار کی طرح بین السطور معنویت نہیں پیدا ہوتی۔ جو آج بھی ممتاز افسانہ نگار جوگندر پال کا وصف خاص ہے۔ بس سیدھے سادھے انداز میں واقعات کا بیان ہے جس میں بالعموم کوئی سماجی تاریخی ' سیاسی یا عالمی مسئلہ ہوتا ہے ۔ لیکن مسائل پر مبنی افسانوں میں جب وہ اصل مقصد کی طرف آتے ہیں تو افسانے کا لب و لہجہ بھی تبدیل ہو جاتا ہے یعنی واقعات کا بیان افسانوی نہیں رہتا بلکہ موضوع کی ضرورت کے مطابق سیاسی ' معاشی ' صحافتی ' یا علمی سا بن جاتا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

"پھر جب جنگ کا نقشہ بدلنے لگا۔ بعض دوسرے ذرائع سے
خبروں کی نوعیت لنے گی تو اہل کے فکر

تبدیلی پیدا ہونے لگی ہے لیکن غیر متوقع یورپ میں عموماً ایشیا کے لیے جو تعصب پایا جاتا ہے وہ واضح طور پر دو طرح کا ہے۔ کالے اور گورے کا۔ مسیح اور مسیح کا سیاسی سطح پر اس کی ایک نوعیت اشتراکی چین سے تعصب کی بھی ہے غرض کہ بطور رد عمل مسلمانوں کے مشترکہ بلاک یا عالم اسلام متحد ہو کر اشتراکی بلاک سے مل گیا تو یورپ کی پسماندگی یقینی ہے اور سرمایہ داری کا خاتمہ لازمی' شاید فرانسیسی اس سطح پر نہیں سوچ سکتا تھا"

(رشتہ)

اس طریقہ کار سے وہ تاثر مٹ جاتا ہے جو رنگین اسلوب کے ذریعے بنتا ہے اور افسانہ کسی بوجھل مقصد کی بھینٹ چڑھ جاتا ہے۔ دراصل مقصد یا موضوع کوئی بوجھل نہیں ہوتا لکھنے والے کا Treatment اسے خوشگوار بناتا ہے۔ اس قسم کی خامی ابتدائی افسانہ نگاروں میں موضوع کے فرق سے مجنوں گورکھپوری اور عاشق بٹالوی کے افسانوں میں بھی ملتی ہے۔

آغا سہیل کے ہاں بعض بڑے اہم نفسیاتی موضوع پر بھی لکھنے کی کوشش پائی جاتی ہے۔ مثلاً ان کا افسانہ "من ماں دکھوں من جرے" ایسا افسانہ ہے جس میں عورت کی بعض نفسیاتی پیچیدگیوں کو موضوع بنایا گیا ہے۔ عورت جو "مرد" کے سامنے "دیوی" بننے کی بجائے "داسی" بننے کی خواہش رکھتی ہے۔ جو مرد کا وہ روپ پسند کرتی ہے جس میں دیوتا بننے اور چھا جانے کی صلاحیت ہو جس پر سب کچھ قربان کرنے کو جی چاہے۔ یہ عورت کے نقطہ نظر سے ایک اہم نفسیاتی اور کسی حد تک جنسی مسئلہ ہے۔ لیکن آغا سہیل نے اس کو جس انداز سے افسانے کے ذریعے پیش کیا ہے اس سے عورت کے نازک احساسات کا کامیاب مصوری کی بجائے ہوس پرستی کی تصویر ابھرتی ہے۔ عورت کے نازک جذبوں کی کامیاب تصویر کشی بیدی اور کسی حد تک ممتاز مفتی کے یہاں ملتی ہیں۔ بیدی کا افسانہ "لاجونتی"

فسادات کے پس منظر میں لکھا گیا ہے لیکن اس میں عورت کے تقریباً اسی قسم کے محسوسات کو دوسرے انداز میں بڑی کامیابی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

آغا سہیل نے کچھ علامتی افسانے بھی لکھے ہیں۔ ان افسانوں کا مرکزی کردار عام طور پر دیگر افسانہ نگاروں کے افسانوں کی طرح "میں" ہے۔ یہ "میں" تنہا سوچ کے بھنور میں چکرا تا رستہ تلاش کر رہا ہے۔ اس کا لہجہ شکست خوردہ جنجھلایا ہوا اور کبھی باغی ہے۔ یہ ہر قسم کی سماجی اقدار سے منحرف ہے۔ یا کٹ کر رہ گیا ہے۔ افسانہ "ڈبویا مجھ کو" ان کا ایسا علامتی افسانہ ہے جس میں بنی نوع انسان کی صدیوں پر محیط سفر کی داستان سنانے کی کوشش کی گئی ہے اس میں تاریخی واقعات کی گونج ' قرآنی آواز ' تاریخ ساز کردار ' بدلتا عہد ' پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے منڈلاتے تاریک سائے اور داستان کا لب و لہجہ ہے۔ قدیم اور جدید کی امتزاجی کیفیت لیے اس افسانے میں وقت کو گرفت میں لینے کی کوشش ملتی ہے۔ اس قسم کے افسانوں میں بھی ان کا اسلوب اساطیری انداز کا حامل ہے معنویت کے اعتبار سے یہ افسانہ ان کے دوسرے افسانوں کے مقابلے میں بہتر ہے۔ البتہ ان کا افسانہ "پرچم" ایک بہترین افسانہ ہے۔ اس افسانہ میں آغا سہیل نے مرکزی کردار کو کمال فنکاری سے تعمیر کیا ہے۔ یہ کردار جو عام نقطہ نظر سے دیکھنے میں پاگل ہے اور پورے افسانہ میں خاموش رہتا ہے آخر میں اس کردار کے منہ سے ادا ہونے والا ایک بہت معمولی اور سادہ جملہ پورے افسانہ کی معنویت کو تبدیل کر دیتا ہے اور اس کردار کے آئینے میں تمام سیاسی ہنگامے ' جلسے پر جوش ہجوم نعرہ بازی جگہ جگہ لہلہاتے پرچم ساری چیزیں بے روح اور کھوکھلی ہنگامہ خیزی کی حیثیت اختیار کر لیتی ہیں اور وہ کردار جس کا لباس تار تار ہے اور جو بھوکا ہے تمام رونقوں اور ہنگاموں پر چھا جاتا ہے۔ غربت اور بھوک کا موضوع ہوتے ہوئے بھی یہ افسانہ پروپیگنڈا نہیں بنتا۔ اس کردار کی اپنے اردگرد سے بے خبری گم گشتگی اور سادگی قاری کے ذہن پر بھوک اور سردی کے احساس کو طاری کر دیتی ہے۔

"پرچم" بلاشبہ اس عہد کا ایک اچھا افسانہ ہے اگرچہ اس کا موضوع بہت اہم ہے جس کو   میں مختلف   انداز   لیکن

موضوع نہ کوئی اہم ہوتا ہے نہ غیر اہم بلکہ اصل چیز افسانہ نگار کی عمل اور رد عمل کی قوتوں سے آگاہی اور Treatment ہے جو افسانے کو اہم یا غیر اہم بناتا ہے۔

اس افسانے کو پڑھنے کے بعد یہ احساس ہوتا ہے کہ اگر آغا سہیل افسانے کے خارجی بناؤ سنگھار یعنی اسلوب کی رنگین بیانی سے توجہ ہٹا کر افسانے کی داخلی حیثیت اور معنویت کو اہمیت دیں تو ان میں ایک بڑا افسانہ نگار بننے کے امکانات موجود ہیں۔

اس افسانے کے علاوہ ان کے دوسرے افسانوں کے بارے میں صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ افسانہ نگار کی بجائے "عہد جدید کے داستان گو" ہیں۔

زندگی مزاحمت اور ارتقا

(آغا سہیل کے افسانوں کے تناظر میں)

باقر علی شاہ

پاولو فریرے نے کہا تھا کہ "انسانی زندگی نہ تو خاموش ہو سکتی ہے اور نہ ہی یہ جھوٹے الفاظ سے نشوونما پا سکتی ہے۔ بلکہ صرف سچے الفاظ سے ہی یہ پروان چڑھ سکتی ہے۔ یعنی ایسے الفاظ جن سے انسان کائنات کو تبدیل کرتے ہیں۔" اسی لئے کہا جاتا ہے کہ ادب زندگی سے مقصد سے ہٹ کر بے راہ رو ہو جاتا ہے۔ حقیقی ادب زندگی سے جڑا ہوتا ہے' یہ تجربے سے پھوٹتا ہے تجربہ شرکت کے بغیر ناممکن ہے اور شرکت اس وقت ہوتی ہے جب آپ اس خطہ ارضی سے پوری طرح جڑے ہوئے ہوں جس کا آپ نے دودھ پیا ہے۔ ایسے میں ظاہر ہے کہ ادیب ایک خاموش تماشائی نہیں ہوتا۔ وہ زمانے کے سرد و گرم میں شریک رہتا ہے۔ تمام جسمانی اور اقتصادی طوفان اس کے سر سے گزرتے ہیں۔ وہ لوگوں کو لڑتے ہوئے جھگڑتے ہوئے حق و صداقت کے لئے جنگ کرتے ہوئے سولی پر لٹکتے ہوئے محبت اور نفرت کرتے ہوئے دیکھتا ہے۔ یہی نہیں وہ اس سے آگے بھی دیکھتا ہے۔ اس کے پس منظر میں سماجی عمل کے تمام محرکات ہوتے ہیں۔ تب کہیں جا کر وہ پوری تصویر دے سکتا ہے۔ اس تصویر میں زندگی کا رنگ ہوتا ہے۔ اپنی دھرتی سے آغا سہیل کا رشتہ بڑا مضبوط بڑا گہرا ہے۔ انہیں چڑیوں کی زمین سے جڑائت کی ادا بہت بھاتی ہے۔

> "انہیں زیادہ اونچا اڑنے کی مطلق فکر نہیں ہوتی وہ زمین سے اپنا ناتا قائم رکھنے ہی میں زیادہ عافیت محسوس کرتی ہیں اور مجھے ان چڑیوں کی یہی ادا بہت بھاتی ہے۔"

"چندن بروا"

اپنی دھرتی سے یہی جڑائت انہیں اس زمین پر بسنے والے افراد میں مساوات اور جمہوریت اور ان کے دوسرے بنیادی حقوق کے تحفظ پر اکساتی ہے۔

"اے لوگو! تم میں سے جو آگاہ نہیں ہیں آگاہ ہو جائیں کہ میں حاکمیت اعلیٰ انسان کی انسان پر قائم کرنے کے حق میں نہیں ہوں کہ یہی آمریت ہے۔"

"نوشتہ دیوار"

یوں تو ہر ادیب کسی نہ کسی معنی میں اپنے طبقے کا طرف دار رہتا ہی ہے اور یہ طبقاتی طرف داری بحرانی دور میں بہت ہی واضح ہو جاتی ہے۔ گویا ہر ادیب شعوری یا غیر شعوری طور پر سماج کے تئیں ایک رجعت پسند یا ترقی پسند نظریہ رکھتا ہے جس کا اظہار اس کی تخلیقات میں ہونا ناگزیر ہے سماج کے بارے میں اس کا یہ مخصوص رویہ ہی اس کے سیاسی اور طبقاتی عقیدے کا تعین کرتا ہے۔ آغا سہیل اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ ادیب کو اپنی جذباتی اور اخلاقی طرف داری کا اظہار کرنا چاہئے تاکہ ادب جاندار اور متحرک ہو سکے اور اس کا ادب پوری جدوجہد کا حصہ معلوم ہو۔ آغا سہیل انسانی شعور کی توسیع چاہتے ہیں وہ انسانی معاشرے اور معاشرتی اقدار کی ترقی کے خواہاں ہیں۔ اسی لئے وہ اپنی نوع انسان کے لئے اپنی عہد مندی کا برملا اظہار کرتے ہیں کیونکہ غیر جانبدارانہ رویہ اسرار و رموز زندگی سے آشنائی اور آگہی کے بجائے فرار اور گریز کی راہیں کھولتا ہے۔ بہت سیدھے الفاظ میں زندگی کو سمجھنے سمجھانے اور افراد معاشرہ کے ساتھ زندگی گزارنے اور ان سے ربط و ضبط رکھنے میں آغا سہیل ان اداروں کے خلاف جو معاشرے اور افراد کے تعلقات میں سم آمیزی کرتے رہتے ہیں کھل کر قلم اٹھاتے ہیں۔ اس کے بغیر لکھنے والا اپنے پڑھنے والے کے لئے کبھی معتبر نہیں بن سکتا۔ آغا سہیل آزادی و مساوات کی شہزادی کی بیداری کو عوامی جدوجہد کا ثمر قرار دیتے ہیں۔

"اسی اثناء میں نیچے شور ہوا اور دھیرے دھیرے یہ شور بڑھنے لگا۔ لاکھوں انسانوں کا ہجوم امڈ پڑا اور نعرے لگاتا ہوا جلوس سڑک سے گزرنے لگا۔ ہن نے کیلنڈر پر نگاہ ڈالی اور بولی۔ آج

یکم مئی ہے؟

میں نے کہا' ہاں آج یکم مئی ہے۔

بن نے پہلی مرتبہ ذرا لمبی بات کی۔ جب میں ایسے جلوس دیکھتی ہوں تو پتہ ہے کیا سوچتی ہوں؟ کیا؟ یہی کہ شہزادی جو پتھر میں منجمد ہے بہت جلد اپنی اصل شکل میں واپس آنے والی ہے۔"

"آنکھوں کی سوئیاں"

ایسے میں آغا سہیل ان منفی اقدار کے خلاف قلم اٹھاتے ہیں جو اجتماعی زندگی میں ناسور بن گئی ہیں اور جن میں زبردستی معاشی اور معاشرتی عدم مساوات' ناانصافیوں' جبر اور آزادی اظہار پر بے جا بندشیں شامل ہیں۔ آغا سہیل کے نزدیک بنیادی انسانی اقدار میں سب سے بڑی قدر آزادی ہے۔ انسان میں اگر کوئی اور بات کوئی قابل تعریف نہیں تو یہ بات قابل تعریف ضرور ہے کہ وہ مغلوب ہو کر جینا پسند نہیں کرتا۔ ساری شاعری اور سارا نثری ادب سیاسی تاریخ اور فلسفہ اس خواہش کے اظہار سے پیدا ہوتے ہیں۔ وہ اپنا شعور اپنے وجود سے اخذ کرتا ہے اور اس کا وجود تب تک اپنے طور پر ظاہر نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ سارے بوجھ جو اسے گھیرے میں لئے ہوئے ہیں۔ ایک ایک کر کے اس سے الگ نہیں ہو جاتے اور وہ اپنے آپ کو پہچان نہیں سکتا۔ انسان کی صحیح پہچان اس کی آزادی میں ہے۔ تمدن کی تاریخ دراصل فکر کی آزادی کی تاریخ ہے لیکن جو افراد یا قومیں فکر کو آزاد کرانے کی کوشش نہیں کرتیں ان کی ترقی کی رفتار رک جاتی ہے اور بعض اوقات وہ قومیں رجعت کی طرف مائل ہو جاتی ہیں۔ آغا سہیل اس معاشرتی حقیقت کو اس طرح پیش کرتے ہیں۔

"وہ جلوس کے شرکاء کو دیکھ کر کہنے لگا۔ بولا کہ ان کے جسموں پر تو ان کے چہرے ہی نہیں ہیں اور ان کے نعرے ان کے دلوں کے اندر سے نہیں نکل رہے ہیں۔ ان کے چہروں پر کسی اور کے چہرے لگے ہوئے ہیں اور ان کے

حلق سے کسی اور ہی کی آواز نکل رہی ہے۔ ان کی آوازیں کرائے پر اٹھی
ہوئی ہیں اور ان کے حلق کے اندر کسی کے ریکارڈ شدہ کیسٹ بج رہے ہیں۔
پھر وہ معاً سڑک پر اوندھا لیٹ کر سسکنے لگا بولا کہ میری دھرتی زخمی ہے اندر
سے کراہ رہی ہے اس کی آواز کوئی نہیں سنتا۔"" "قاصد"

آغا سہیل یہ ذمہ داری ادیب کی سمجھتے ہیں کہ وہ اپنے ہمعصر معاشرے کی شعوری اور تحت الشعوری زندگی کا اتنا وسیع اور صحیح علم رکھے کہ کون سے عوامل معاشرے کی فکری رو میں تعمیری ہیں اور کون سے تخریبی اور اس طرح وہ معاشرے کے وجود اور بطن میں جاری و ساری ان نزاعی اور تخریبی رجحانات کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرے جو انسانی رشتوں مراسم اور روابط سے انسانی دوستی مروت اور خلوص و اخلاص کی جڑیں کاٹتے رہتے ہیں اور ریاکاری خود پسندی' ذاتی منفعت اندوزی اور آپادھاپی کے جذبوں اور رویوں کو جنم دینا چاہتے ہیں چنانچہ منفی اور مثبت رویئے آغا سہیل کے یہاں روبرو نظر آتے ہیں اور اس باہمی آویزش میں مثبت قدروں کی فتح پر یقین رکھتے ہیں۔

"اے ابو داؤد تو شہرپناہ کے دروازے پر بیٹھا ہوا روزانہ کس کا انتظار کرتا رہتا ہے" ابو داؤد نے مسکرا کر کہا وہ وہی ہے جسے تو بھی جانتا ہے اور میں بھی اور یہ سب جو تیرے سنگی ساتھی ہیں یہ سب بھی اسے بخوبی جانتے ہیں بلکہ شہر کا بچہ بچہ جانتا ہے مگر تیرے خوف سے کوئی اسے زبان پر نہیں لاتا اور مجھے معلوم ہے کہ اس کا آنا برحق ہے"

"قیامت کا انتظار"

یہ سب کچھ اسی وقت ممکن ہے جب معاشرے میں فکری آزادی کی خواہش موجود ہو کہ فکر کی آزادی صحیح فیصلے کے لئے نہایت ضروری ہے اگر فکر پر پابندی لگادی جائے تو تصویر کا ایک ہی رخ سامنے آئے گا۔ فیصلہ زیادہ سے زیادہ جذباتی ہو گا۔ عقلی نہیں' فکر کی آزادی اس لئے بھی ضروری ہے کہ مختلف افکار حرکت میں رہیں اور نئے افکار پیدا ہوتے رہیں ان افکار کا تصادم بھی ہوگا۔ اس تصادم کی نوعیت عقلی بھی ہو گی جذباتی بھی' لیکن آزاد افکار کا تصادم اس قدر خطرناک نہیں ہوتا جتنا افکار کا عرصے تک دبے رہنا اور

پھر مسخ شدہ حالت میں یکا یک ابل پڑتا کیونکہ بقول ڈاکٹر نجلا د عزو الدین عربوں کے زوال کا بڑا سبب خرد دشمنی تھا وہ لکھتی ہیں "بایں ہمہ جو عذاب یا وبال عربی معاشرے پر باہر سے نازل ہوئے ان سے بھی زیادہ جاہ کن مصیبت یہ تھی کہ معاشرے کی اندرونی قوت تخلیق سرد پڑ گئی تھی آزاد خیالی کو دیس نکالا نصیب ہوا اور اس کی جگہ روایت پرستی حکومت کرنے لگی۔ صداقت کی بے روک ٹوک جستجو پر الحاد بے دینی کی مہر لگ گئی اس سے پہلے کے عہد کے زیادہ بے باک اور جرات مند اشخاص گوشہ گمنامی میں جلاوطن کر دیئے گئے۔ آغا سہیل کے ہاں اس تاریخی حیثیت کا تخلیقی اظہار اس طرح ہوتا ہے۔

> "اے فرزند جان لے کہ بربادی اس قوم کا مقدر ہے جس کے دانشوروں کو تہہ تیغ کیا جائے۔ بندی خانوں میں ڈالا جائے اور ان پر نا سمجھ اور کم سواد حکمران بٹھا دیئے جائیں۔"
>
> "لمن الملک الیوم"

"جب معاشرے کے تانے بانے ٹوٹ جاتے ہیں اور معاشرے کے سفر کی مقصدیت ختم ہو جاتی ہے کچھ اجارے دار لوگوں کے اشارے پر معاشرے کے اقدار حرکت کرنے لگتے ہیں اور معاشرے کا رس نچوڑ کر اپنا گلاس بھر لیتے ہیں تو باقی افراد معاشرے کے حصے میں صرف پھوک رہ جاتا ہے اور معاشرے کے حرکات میں INVOLVE نہیں ہو پاتے تو تماشا رہ جاتے ہیں اور جب معاشرے کے افراد تماشا رہنے لگتے ہیں تو زندگی بے مقصد فضول اور بے معنی نظر آنے لگتی ہے

"شہر نا پرساں"

آغا سہیل کے یہاں نظریے کا استعمال کبھی پند نامے .... یا سیاسی سماجی اور اخلاقی منشور کی صورت میں نہیں ہوا اور نہ ایسا ہو سکتا ہے کیونکہ حقیقی ادب باشعور ہوتا ہے ادب کی کامیابی اس میں ہے کہ وہ ہمیں ایسے عالم میں لے جاتا ہے جہاں ہم بغیر کسی دوسرے شخص کی ہدایت تلقین اور نصیحت کے معاشرے کے تمام حسن و قبح کو خود اپنی

آنکھوں سے دیکھ لیتے ہیں اور ہمیں یہ طے کرنے میں دیر نہیں لگتی کہ اس کے خدوخال کہاں تک بے ڈھنگے ہیں آغا سہیل ہمیں اجتماعی زندگی کی ناہمواریوں بے ترتیبی اور بے ڈھنگاپن دکھاتے ہوئے کہتے ہیں:۔

"تمہاری سڑکوں کی روشنی غائب ہے۔ فٹ پاتھوں کے کھمبے بلب اور ٹیوب سے محروم ہیں جب تک تمہاری قوم کے بچے بچے کے دل میں وطن اور ملک کے لئے روشنی نہیں ہوگی تم قوم نہیں بن سکتے۔ تمہارا قومی کردار جگہ جگہ بکھرا پڑا ہے۔ قوم سے ملک بنتے ہیں ملک سے قوم نہیں بنتی"

"قوم"

"ہماری کیفیت یہ ہے ہم خواہ زندگی کے کسی شعبے سے تعلق رکھتے ہوں اپنے فرائض اور اپنی ذمہ داریوں کو پورا نہیں کرتے۔"

"انا للہ"

"مگر ہماری تاریخ دور سے دیکھو تو خوبصورت نظر آتی ہے' اندر جھانکو تو خلا ہی خلا یعنی ہم نے خود کو بار ہا کھوکھلا بنایا ہے.... ہم ایسی قوم ہیں جو قسطوں میں خودکشی کے عمل سے گزر رہی ہے۔"

"وقت اٹھے گا"

آغا سہیل معاشرے کے موجودہ انحطاط کا جس کا بڑا سبب معاشرے کے پیداواری مسائل پر کم سواد لوگوں کا تسلط ہے اور ریاستی مشنری پر مارشل لاء کا کالا قانون ہے' کی تصویر کشی کرتے ہیں اور اس پر تنقید بھی کرتے ہیں۔ مستقبل کی تبدیلی اور ارتقاء کی راہ بھی دکھاتے ہیں وہ ہر نوع کی استحصالی قوتوں اور ہر قسم کے دباؤ کو عریاں کرتے ہیں ان

پر تبصرہ کرتے ہیں اور ان کے خلاف جہاد کرتے ہیں۔ وہ صرف مظلوم ہی کے حالات و کیفیات سے بحث نہیں کرتے بلکہ ظالم کے چہرے سے نقاب اٹھاتے اور اس کے دل کو بھی کھول کر رکھ دیتے ہیں۔ وہ ظالم و مظلوم ہر دو کی نفسیات کو منظر عام پر لاتے ہیں جس طرح ایک ماہر طبیب علم افعال الاعضاء اور علم جراثیم دونوں سے واقف ہوتا ہے وہ صحت اور مرض کی حالت میں انسانی اعضاء کے افعال کا علم رکھتا ہے اور مہلک جراثیم کی زندگی اور افعال کا بھی رازداں ہوتا ہے اسی طرح آغا سہیل صرف انسانیت کے مقہور اور لوٹے جانے والے طبقات ہی کی تصویر کشی نہیں کرتے بلکہ قاہر اور لوٹنے والے طبقہ کی بدکاریوں اور سیہ قلبیوں کی عکاسی بھی کرتے ہیں کہ ادب فرد کی اضطراری کیفیت کا نتیجہ نہیں ہوتا اس کی تخلیق ایک پس منظر رکھتی ہے جس میں ادیب کے تاریخی شعور کا ہاتھ ہوتا ہے۔ آغا سہیل سچ اور جھوٹ کی اس آویزش کو تاریخی تسلسل میں دیکھتے ہیں۔

"آواز آئی ..... کیوں کیا' ہر فرعون را موسیٰ پر تمہارا ایمان نہیں ابھی موسیٰ نے طلسم سامری توتوڑا ہی نہیں اور تم گھبرا گئے؟

میں نے کہا..... اے میری معبود میں گھبرایا نہیں بلکہ دیکھتا ہوں کہ آخری قرن میں فراعین تو بہت سے طلسم سامری کے کارخانے کھولتے چلے جا رہے ہیں مگر موسیٰ کا کہیں پتہ نہیں آخری قرن کیا موسیٰ سے خالی ہے۔؟

"جواب ملا نہیں کوئی زمانہ موسیٰ سے خالی نہیں صرف پہچاننے والی آنکھ کی ضرورت ہے" "ڈبویا مجھ کو" "پیرو مرشد نے کہا ہر نمرود کے لئے ابراہیم ہر فرعون کے لئے موسیٰ اور ہر یزید کے لئے حسین ہر ایک نہیں بن سکتا اس کے لئے ریاضت کی بھی ضرورت ہے اور مناسب وقت کی بھی۔ یاد رکھو جب تک ماضی کی تمام کڑیاں جوڑ کر اپنے زمانے سے نہ ملاؤ گے تم مستقبل کی طرف آگے قدم نہیں اٹھا سکتے۔"

تخلیق کار جس قدر یکسوئی اور کاوش کے ساتھ اپنے ماحول کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے اور معاشرے کا مختلف زاویوں سے جائزہ لیتا ہے اتنی ہی اس کے تجربات میں وسعت آتی ہے اور خیالات و الفاظ کے خزانوں میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ آغا سہیل اس بات

پر یقین رکھتے ہیں کہ زندگی کا مقصد صرف زندگی کو دوام بخشنا ہی نہیں ہے بلکہ زندگی کی کیفیت اس کی کمیت سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے اور یہ تہذیب کا فرض ہے کہ وہ فرد کو کشمکش حیات کی شدید اور اہم ضروریات سے رہائی دلا کر وہ قوت اور توانائی عطا کرے جو اس کو زندگی کی اعلیٰ ترین کیفیت حاصل کرنے میں مدد دے سکے۔ کیونکہ زندگی ایک نامیاتی حقیقت ہے جو بڑھتی رہتی ہے اور خوب سے خوب تر کی جستجو میں لگی رہتی ہے۔ فن اسی رواں دواں زندگی کی نمائندگی کرتا ہے اور اسے فروغ بخشتا ہے۔ آغا سہیل مہم جوئی کے بجائے شعوری جدوجہد پر یقین رکھتے ہیں۔ وہ جذباتی فیصلوں کے بجائے خرد افروزی کے ساتھی نظر آتے ہیں۔

"کنویں میں سے اوپر نکلنے کی صورت پوری ہوشیاری سے کرنا چاہئے۔ منصوبہ بندی کے بغیر کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوتی مگر کیا خاک منصوبہ بندی کی جائے جہاں ہاتھ پاؤں دلدل میں پھنسے ہوں نہ چل سکتے ہوں نہ ہل سکتے ہوں۔ آسمان سے فاصلہ اتنا زیادہ بڑھ چکا ہے کہ وہ سمٹ کر ہتھیلی کے برابر رہ گیا ہو وہاں تدبیر اور منصوبہ بندی سے کام لو پھر جو کوشش ہوگی وہ ضرور کامیاب ہوگی"

"دروازہ بند ہے"

"میں نہ کہتی تھی ہمت نہ ہارو' نہ زمین ہمیں دھوکہ دے سکتی ہے اور نہ اللہ کی رحمت سے مایوس ہونا چاہئے

"بوند بوند پانی"

آغا سہیل حیات و کائنات کے مسائل کو انسانی جذبات و احساسات کو اپنی فکر کے ساتھ اس طور پر ملا کر ایک کر دیتے ہیں کہ جیسے جیسے زندگی بدلتی ہے اور فکر احساس و شعور کی مختلف سطحیں ابھرتی ہیں وہ ہر دفعہ انسانی ذہن کو آئینہ دکھا کر گونگے افکار و احساسات کو زبان دیتے ہیں۔

گئی ناطقہ کی قو

ذکراہٹ میں کہو کہ بدل گئی ہماری سوچ سمجھ اور فکر کہ جس کا
شہرہ آسمانوں میں تھا کہاں گم ہو گئی اور ہماری نظر کا رخ سکڑ سمٹ
کر ہماری ایڑیوں میں کیسے چلا گیا"

"اگن کنڈلی"

معاشرے کا یہ عکس محض سادہ عکس نہیں بلکہ خارجی مضمون مصنف کی تخلیقی ذات سے گزرتا ہے تو اس کے نصب العین نظریہ یا احساس کا رنگ خود میں جذب کر لیتا ہے گویا اس طرح مصنف کی شخصیت کا عکس اس کے خارجی معاشرتی عکس میں شامل ہوتا ہے ..... آغا سہیل کے یہاں خارجی حقیقت کا مکمل پرتو اور صورت و شکل ہیت خطوط اور ابعاد میں حقیقت کی جھلک دیکھی جا سکتی ہے اس میں ان کے تاثرات اور احساسات کے رنگوں کی آمیزش سی ہوتی ہے یہ رنگ خارجی حقیقت کی خامیاں اور نا تمامی دور کر کے حقیقت کو ایک نئی شکل اور مکمل صورت میں پیش کرتے ہیں اس طرح ان کی تخلیقات زندگی کی ترجمانی کرتی ہیں تو یہ ترجمانی ان کے نقطہ نظر سے ہوتی ہے ان کی تخلیقات میں ان کا انداز فکر ہمیشہ رونما رہتا ہے۔ آغا سہیل معاشرتی جبر کے نتائج کو تخلیقی انداز میں یوں پیش کرتے ہیں۔

"کیا غضب ہے لوگ سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی کچھ نہیں دیکھتے
اور جو دیکھتے ہیں وہ اپنی نظر سے نہیں دیکھتے۔ آخر ان کے چہروں
پر یہ کس کی آنکھیں لگا دی گئی ہیں جو انہیں کچھ نظر نہیں آتا اور
جو نظر آتا ہے وہ نہیں ہے جو حقیقتاً موجود ہے"" تسمہ پا"
"میری کرسی پر کوئی شخص بیٹھا ہوا ہے۔ مگر اس کا چہرہ پھر بھی
غائب ہے تو یہ بول نہیں سکتا پھر یہ آیا کہاں سے ہے اور ہے کون
اور یہ کب آیا مجھے کچھ خبر نہیں یا اللہ یہ کس عذاب میں جتلا کر
دیا ہے عہد زوال میں شکلیں مسخ ہو جائیں گی اور .... فیس لیس
چیل سے سابقہ پڑے گا تو پھر میں کب تک اپنا چہرہ سنبھال کر

رکھوں گا۔ ممکن ہے کہ میرا چہرہ بھی غائب ہو چکا ہو .... میرا چہرا
.... ہاں ہاں کیا تعجب ہے میں آئنے کی طرف جاتا ہوں یہ دیکھ کر
حیران رہ جاتا ہوں کہ میرا چہرہ بھی غائب ہے۔" "عہد زوال"

حقیقت کا یہ تصور طے شدہ زمانی اور کتابی نہیں ہے اور نہ یہاں یہ حقیقت کسی ایک آدمی کی دریافت یا جاگیر ہوتی ہے بلکہ یہ تمام انسانوں اور تمام ملکوں کی مشترکہ ملک بن جاتی ہے۔ یہاں وجود عمل سے عبارت ہے اور زندہ تخلیقی کوشش کا نام ہے۔ آغا سہیل معروضی حقیقت بیان کرتے ہوئے معاشرے کے تمام پہلوؤں کو نظر میں رکھتے اور انہیں ایک مربوط اور منظم شکل میں پیش کرتے ہیں۔ معاشرے میں ہر کردار کی اپنی ایک ذاتی زندگی ہوتی دوسری جماعتی طبقات ایک دوسرے سے ٹکراتے رہتے ہیں۔ مختلف عمل اور رد عمل میں سماجی زندگی نمو پاتی رہتی ہے۔ آغا سہیل اسی کل کو پیش کرتے ہیں۔

جو چیز ان کے افسانوں کو خالص پروپیگنڈے سے ممتاز کرتی ہے وہ ان کا تخلیل ہے جس کا عمل اور تصرف خیالات میں بھی ہوتا ہے اور الفاظ میں بھی یہ اسی قوت متخیلہ کی کارفرمائی ہے جو ادب میں خیالات کی بلندی زبان کی دلکشی انداز بیان کی طرفگی و دلاویزی اور مجموعی حیثیت سے اثر انگیزی اور وجد آفرینی کی خصوصیتیں پیدا کرتی ہیں۔ آغا سہیل کے افسانے زندگی کے گہرے تخیلی تجربے میں وہ زندگی کے مختلف پہلوؤں کی ترتیب و تنظیم کرتے ہیں۔ انتخاب کرتے ہیں آلودگیوں کو دور کر کے اسے صحت مند بناتے ہیں۔

حقیقت کا عام تصور بہت سے لوگوں کو ہوتا ہے لیکن جب تک کوئی شخص اس عام تصور کو محسوس طریقے سے پیش نہ کر سکے تم کی تخصیص نہ کر سکے آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ حقیقت کے تجربے میں اس کا ایک ذاتی حصہ ہے ایسا حصہ جسے اس نے ذہنی قوتوں سے حاصل ہی نہیں کیا بلکہ اپنے سینے میں محسوس بھی کیا ہے۔ اس عنوان سے ذاتی طور پر زندگی کی گہما گہمی میں حصہ لینے سے اگر ایک طرف اس کی انفرادیت تحریک ہے تو دوسری طرف وہ اسلوب کا خالق بھی بنتا ہے اور کچھ خاص استعارے اور علامتیں جنم لیتی ہیں۔ یہاں یہ واضح رہے کہ
اعلیٰ تی بھی قوت تخیل

درجے کی قدرت اور مہارت اور الفاظ سے زندہ رشتے کے بغیر وجود میں نہیں آتیں۔ ملک میں مارشل لاء کے عفریت کے تسلط اور لوگوں کے بنیادی حقوق کے غصب ہونے اور جبری کیفیت کو آغا سہیل اس طرح بیان کرتے ہیں۔

"ایک بڑا بھیانک اور گمبھیر ہاتھ اٹھا اور جس طرح بڑی مچھلی چھوٹی مچھلیوں کو اور اژدھا سانپوں کو کھا جاتا ہے اسی طرح وہ ہاتھ چھوٹے چھوٹے نرم و نازک مضبوط اور محنتی ہاتھوں کو کاٹ کاٹ کر گرانے لگا" "آخری ہاتھ"

ہمارا معاشرہ جہاں سیاسی اقتصادی اور تہذیبی مسائل پر بنیادی اختلاف پایا جاتا ہے۔ یہاں عملی طور پر عوام ایک اچھی زندگی اور روشن مستقبل کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں یہاں تخلیق کار کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ غیر جانبدار رہے اور کسی نہ کسی طبقے کی حمایت نہ کرے۔ کوئی بھی شخص اپنے کسی مخصوص عمل سے جو نتائج اور اثرات پیدا کرنا چاہتا ہے وہ نہایت سلجھے ہوئے انداز میں اس کے پیش نظر ہونا چاہئیں تخلیق کار کے ذہن میں بھی مقصد اور نصب العین کا تصور جتنا واضح ہو گا اس کی تخلیقات اتنی ہی گراں پایہ ہوں گی۔ چنانچہ جب معاشرتی جبر نے حساس افراد کو جلاوطن ہونے پر مجبور کر دیا تو آغا سہیل خاموش نہ رہ سکے۔

"آدم جنت سے نکل کر نہ خود بھی آسودہ ہوئے اور نہ ابن آدم آج تک مطمئن ہے۔ تو اے بھائیو

سنو اور فیصلہ کرو کہ میں وہ بدنصیب ہوں جس کے پاؤں تلے سے زمین کھینچ لی گئی" "قصہ پانچویں درویش کا" اس کے باوجود آغا سہیل اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ عملی جدوجہد آخر کار نتیجہ خیز ثابت ہوتی ہے۔ انسان کو اپنے وجود کی اہمیت کا احساس ہو جائے تو جبر کی رات کٹ جاتی ہے۔ ظلم کے اندھیرے مٹ جاتے ہیں۔

"افسوس کہ جب تک تو سوتا رہے گا اور خود اپنی آنکھوں سے سورج کو نکلتے نہیں دیکھے گا تیری صبح نہیں ہو گی۔"

تنقیح

❁ تنقید

لکھنوی ادب میں داستان گوئی

جیلانی کامران

داستانی ادب کے تہذیبی عناصر کی نشاندہی

میرزا ادیب

آغا سہیل کا تحقیقی و تنقیدی کارنامہ

ڈاکٹر وفا راشدی

آغا سہیل کے تنقیدی نظریات

عبدالکریم خالد

آغا سہیل کے تنقیدی افکار

باقر علی شاہ

لکھنوی ادب میں داستان گوئی

پروفیسر جیلانی کامران

اردو کے نثری ادب میں عشقیہ واقعات کو عموماً داستانی ادب سمجھا جاتا ہے۔ برصغیر کے مسلم تہذیبی کلچر کے مطالعے میں اسے ایک پس منظر کی حیثیت حاصل ہے جس طرح عشقیہ واقعات، کہانیاں اور داستانیں (جن کا تعلق اس صنف ادب سے ہے) ان کا اپنا ایک واضح کردار متعین ہے اور ان کی قوت متخیلہ کو جائے پناہ کے شاہکار کے طور پر جانا جاتا ہے، اسی طرح داستان بجائے خود ایک اہم صنف نثر شمار ہوتی ہے۔ اس دنیا سے فرار اور حقائق سے چشم پوشی ایک اہم واقعہ ہے، کیونکہ مسلم کلچر اس وقت سنگین خطرات سے دوچار تھا۔ تقریباً تمام کا تمام داستانی ادب خواہ وہ نثری ہو یا منظوم، مغلیہ دور کے آخری ادوار میں، جب کہ سیاسی حالات بڑی تیزی سے بدل رہے تھے اور جب مغلیہ حکومت غیر متوقع خاتمے کی جانب رواں تھی، غیر ملکیوں کے لئے اردو ادب میں کشش تھی، خصوصاً داستان گوئی میں کچھ نہ کچھ انحطاط یا ابتری ملتی تھی۔ داستانوں کے اندرونی مناظر اور کرداروں کو فنون لطیفہ کی خاص طرز اور نمایاں خصوصیت اور ہیئت میں ڈھالا گیا۔ اس لئے یہ داستانیں روزمرہ زندگی کی حقیقت سے کسی قدر ہٹی ہوئی ہیں۔

۱۸۵۷ء کے بعد جب نول کشور نے لکھنؤ میں اور منشی گلاب سنگھ نے لاہور میں مشہور داستانیں چھاپیں تو ان کے کئی کئی ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ بک گئے اور یہ داستانیں خوب خوب پڑھی گئیں۔ ان داستانوں سے ایسا محسوس ہوا کہ فرنگی راج اور استعماری دور کی وجہ سے یہ حقیقت سے فراری ادب وقت کی ضرورت تھی اور یہ داستانیں وطن کی محبت کے مارے ہوئے لوگوں کو مطمئن کرتی تھیں حقیقت میں ان داستانوں کی اپنی ایک مقناطیسیت تھی، ان میں کوئی تعویذیت تھی، یہ داستانیں پڑھنے والوں کو شادمانی کے عالم میں، وجد میں پہنچا دیتیں اور قاری کو اپنی گرفت میں مضبوطی سے جکڑ کر رکھتیں۔ اس دل کشی کی وجہ سے یہ داستانیں ان ناملائم حالات کا نعم البدل تسلیم کی گئیں اس طرح اس وقت

یہ داستانیں کسی تنقید کا ہدف نہ بنیں اور ان کو خلوت گزینی کے ساتھی کے طور پر قبول کیا گیا۔

اردو زبان پڑھنے والے لوگوں کی کئی نسلیں داستانی روایت پر پروان چڑھیں۔ تاریخ فرنگی کے طور پر داستانوں نے اپنے لئے ایک فضا خود وضع کی' لیکن انہوں نے اصل میں جس چیز کو سہارا دیا' وہ ایک مضبوط تخیلی تصوریت ہے' جس کی داستانوں نے دور استعماریت میں عوام کی تشفی کی

کچھ نقادوں کا خیال ہے کہ برصغیر کے مسلمانوں کے لئے ایک جدا ملک اور آزادی کا سرچشمہ اسی تخیل انگیز شے (داستان) سے ملا' اور انہی داستانوں نے ہمیں آزادی کی تحریک کے لئے ہمت اور قوت تخلیق فراہم کی۔ آزادی حاصل کرنے کے بعد اگرچہ داستانوں کا رویہ بدل گیا۔ آزادی کے دور کے بعد داستانوں کو ایک بہت بڑی اور اہم صنف ناول کے ادب کا پس منظر خیال کیا جاتا ہے۔

سید وقار عظیم نے اس داستانی ادب کے تفصیلی مطالعے کے بعد یہ محسوس کیا کہ اس طبع زاد تخیلاتی ادب نے حقیقت کی جانب جب موڑ کاٹا تو داستانوں کے لئے یہ ممکن ہوسکا کہ وہ ناول کی شکل اختیار کرسکیں۔ تاریخی لحاظ سے اس نئی نثری صنف ادب کو خیر و شر کے تصادم کی حتمی بات خیال کیا جاتا ہے اور یہ قدرتی طور پر محسوس کیا گیا کہ اردو ناول انگریزی کے ادبی مطالعے کے اثر کے نتیجے میں معرض وجود میں آیا۔ اس بات کی تائید اردو ناول کو عمرانی اصطلاح میں انگریزی ادب کے ناول کے متوازی بیان کیا گیا ہے۔ اور جیسا کہ یورپین قرون وسطی کے دور کی منظوم اور نثری داستانوں کو ناول کے پس منظر کے طور پر دیکھا جاتا ہے' یہی طریقہ کار اردو کے نثری ادب کے نظریہ ارتقاء میں اور یہی نقطہ نظر کارفرما ہے۔

یوں تو اردو ناول کا آغاز سرشار کے فسانہ آزاد سے کیا جاتا ہے تاہم یہ بات دلچسپ اور قابل ذکر ہے کہ صنف داستان گوئی میں اٹھارہویں صدی میں تبدیلی رونما ہوچکی تھی۔ یہ تبدیلی کافی حد تک فسانہ رنگین سے عیاں ہے' جو کہ فارسی زبان میں لکھنؤ میں لکھی

گئی اور اس کا ترجمہ "نشتر" کے عنوان سے اردو میں ۱۸۹۳ء میں کیا گیا۔

یہ داستان مستند کلاسیکی مثال کے طور پر پیش کی جاسکتی ہے' جس میں پرانی ڈگر کے نثری انداز سے ہٹ کر نئی صنف ناول کی جھلک نظر آتی ہے۔ اس خوبصورت کہانی کا محل وقوع ایسٹ انڈیا کمپنی کے علاقے ہیں۔ کہانی پٹنہ' کانپور اور لکھنؤ کے درمیان متحرک رہتی ہے۔ دریائے گنگا اس کو سب سے اہم مواصلاتی سلسلہ مہیا کرتا ہے۔ کہانی کا ہیرو ایک انگریز جنرل کا صدر منشی ہے' جو کہ ایک ناچنے والی کے عشق میں گرفتار ہو جاتا ہے جو کہ جنرل کی تنخواہ دار ہے۔ ہیروئن آخر کار محبت کا صلہ لئے بغیر مرجاتی ہے اور اس کو لکھنؤ میں دفنا دیا جاتا ہے۔ یہ داستان تاریخی لحاظ سے جان بنیسن کی کہانی "پلگرم پراگرس" کے معیار کے برابر ہے' جو داستان گوئی کی روایت کو نئی صنف ناول کے ساتھ منسلک کرتی ہے۔

شاید ڈاکٹر آغا سہیل نے افسانہ رنگین کو نظر انداز کیا' جب انہوں نے داستان گوئی کے ارتقاء کو اردو ادب میں مطالعے کے لئے چنا۔ اگر وہ فسانہ رنگین کو داستان گوئی کے ارتقاء میں شامل کرلیتے تو اس کام کی اہمیت تاریخی ترتیب کے لحاظ سے اور بھی بڑھ جاتی۔ اس کے باوجود انہوں نے اپنے مقالہ "دبستان لکھنؤ کے داستانی ادب کا ارتقاء" میں جو کہ حال ہی میں مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور نے شائع کی' جو مطالعہ پیش کیا ہے' وہ بہرحال اہم ہے۔

ڈاکٹر آغا سہیل نے تنقیدی دلائل کے ذریعے داستانی ادب کے ارتقاء کو ایک نیا رخ دیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ لکھنوی ادب کی داستانوں میں نثری ادب کی پختہ خصوصیات نمایاں تھیں جو کہ رجب علی بیگ کے فسانہ عجائب میں بھی نمایاں ہیں۔ اس کہانی کا رجحان حقیقت پسندانہ زندگی کی تصویر کشی سے جاذب توجہ بن گیا ہے اور اس کے باوجود کہ مواد رومانی ہے جس نے کہ ہر چیز کو اپنی تفصیل میں گھیرا ہوا ہے۔ یہ ہر لحاظ سے ایک مفید اور اہم کام ہے۔ زبان اور کردار ناقابل ادراک اور غیر محسوس مرکز ثقل حقیقی زندگی کی کیفیت کی جانب رواں دواں ہے۔

ڈاکٹر آغا سہیل بات کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے کہتے ہیں کہ گو کردار جو کہ

رومانوی طرز پر بنائے گئے ہیں لیکن ناظرین اور سامعین کی توقع پر پورے اترتے ہیں اور لکھنوی طرز کی تہذیبی و ثقافتی پہچان بنتے ہیں۔ یہاں تک کہ جادوگروں' دیوؤں' پریوں اور پرستانوں کے مناظر کی تصویر کشی تک لکھنوی تہذیب و ثقافت کی سوچ کی آئینہ دار اور عکاس ہے' جو ایک صدی سے زیادہ لکھنؤ میں رائج رہا۔ (۱۷۲۰ء تا ۱۸۵۷ء) داستان کی اس خاص طرز کی تصویر کشی کے پیچھے اصل لکھنؤ پوری آب و تاب کے ساتھ موجود ہے۔ پرستان کا شہنشاہ اور ملکہ اور حرم کی دوسری خواتین سب کے سب لکھنوی تہذیب کے رنگ میں رنگے ہوئے اور نمایاں ہیں' گو ظاہری طور پر یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان سب کرداروں کا تعلق غیر حقیقی دنیا سے ہے' لیکن تہذیبی اور ثقافتی رنگ اس قدر گہرا ہے کہ ان پر حقیقت ہی کا گمان ہوتا ہے۔

ڈاکٹر آغا سہیل کے مفہوم' تشریح اور داستانی مواد کی پیشکش قابل ستائش اور قابل تعریف ہے۔ ان کا مطالعہ بہت زیادہ گہرا اور اثر آفرین ہے اور اسلوب بیان دل کش اور یقین بخش ہے' تاہم اس مطالعے کو جو چیز بہت زیادہ اہم بناتی ہے' وہ ڈاکٹر آغا سہیل کا پرانے لکھنؤ اور اس کا خیالی ملک (خوابی دنیا) ہے۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ لکھنؤ کی نثری داستانوں میں دو مختلف زاویوں سے تصویر کشی کی گئی۔ پہلی (جیسا کہ افسانۂ عجائب میں) جب مصنف کانپور میں ملک بدر تھا اور وہ اپنے پیارے لکھنؤ کی ایک جھلک کے لئے تڑپ رہا تھا اور دوسرا (جیسا کہ فسانہ آزاد میں) جب ۱۸۵۷ء میں پرانا شہر تقریباً فنا ہوچکا تھا اور ایک نیا قصبہ پرانے شہر کی راکھ پر نمودار ہوچکا تھا' استعماری دور حکومت میں نئی جدوجہد کا آغاز ہے۔ اس دوران تمام کردار بدل چکے ہیں' لیکن پرستان کا حسن و جمال اور اس کے سحر نے اپنا وجود برقرار رکھا۔ گو کہ صرف انسانی خوابوں کے علاقے میں ڈاکٹر آغا سہیل کا ادب میں خوابوں کی دنیا کے بارے میں' یہ نظریہ ہے کہ یادوں پر مشتمل خوابوں کی حقیقت بھی ایک حقیقت ہے۔ ضرورت ہے کہ ہم اس نظریئے کی تعریف کریں' جو کہ قابل ستائش ہے' کیونکہ اس سے پہلے اس رخ کو نقادوں نے نظرانداز کیا۔ مواد کے بارے میں تعین کرتے ہوئے' حقیقت میں سب داستانوں میں یہ خصوصیت اپنے تخیلاتی سلوک میں مشترک ہے۔

کنگ آرتھر کی داستانوں میں پرانا کیم لاٹ (CameLot) خوابوں کی دنیا ہے۔ یہ داستانیں زبانی طور پر زیادہ مشہور ہو گئیں۔ جب کیم لاٹ کو پانچویں صدی میں اینگلو سیکسن (Anglo Sacson) نے ملیامیٹ کر دیا۔ سقوط بغداد ۱۲۵۸ء کے بعد عربی اور فارسی میں بھی داستانیں لکھی گئیں۔ الف لیلیٰ گزری ہوئی یادوں کا شاہکار ہے۔ اردو کی نثری داستانیں اس وقت لکھی گئیں جب لکھنؤ یا تو ناقابل حصول تھا یا جب اسکو انگریزوں نے ۱۸۵۷ء میں تباہ کیا تھا۔ یہ ہمیشہ کسی کی اپنے پیارے شہر کے لئے محبت کیساتھ بازیافت ہوتی ہے۔ (جو کہ علامت ہوتی ہے عوام الناس کی تہذیب و ثقافت کی) جو بالعموم خوابوں کی ایک دنیا کو تخلیق کرتی ہے' لیکن ان خوابوں کے پس منظر میں ہمیشہ جذبہ حقیقی اور کھرا ہوتا ہے۔"

(اردو ترجمہ ۔ پروفیسر محسن سہیل)

اذکار و افکار

"اردو کے داستانی ادب کے تہذیبی عناصر کی نشاندہی"

میرزا ادیب

عام طور پر دیکھا یہ گیا ہے کہ ہر دور اور ہر عہد اپنے پیش رو عہد کے فیصلوں کی کلیتہ تائید نہیں کرتا۔ جزوی تائید کرتا ہے یا مکمل طور پر ان فیصلوں سے دامن کش ہو جاتا ہے اور ایسا ہونا ناگزیر بھی ہے اور اس بنا پر ناگزیر ہے کہ ہر نئے عہد کو وقت کے تقاضوں اور علوم و فنون کی وسعت پذیری سے سوچنے سمجھنے اور تجزیاتی مطالعے کے وہ وسائل مہیا ہو جاتے ہیں' جن سے پہلے ادوار ایک حد تک یا کسی حد تک محروم تھے۔ نیا عہد ان نئے وسائل اور علوم و فنون کی وسعت سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا ہے۔

ایک زمانے میں داستان کو محض وقت گزاری کا ایک ذریعہ تصور کیا جاتا تھا۔ ہوتا یہ تھا کہ داستان گو ایک مخصوص مقام پر بیٹھ جاتا تھا اور شائقین اس کے اردگرد جمع ہو جاتے تھے۔ داستان گو اپنے فن کے مظاہرے کے ساتھ ساتھ رزق کے حصول میں بھی کوشاں رہتا تھا اور شائقین کا مقصد صرف حصول لطف ہوتا تھا۔ وقت اچھا گزر جاتا تھا' بس مگر ادھر بیسویں صدی کے نصف دوم میں جب اہل نظر نے اپنے داستانی ذخیرے کو پرکھا تو ان کے سامنے بصیرت کے نئے نئے دروازے وا ہو گئے۔ انہوں نے محسوس کیا کہ داستان وہ کچھ نہیں ہے' جو اب تک سمجھی گئی ہے۔ اس کے دامن میں تو اور بھی بہت کچھ ہے۔ غالب نے کہا تھا:۔

"داستان طرازی منجملہ فنون سخن ہے۔ سچ ہے کہ دل بہلانے کے لئے اچھا فن ہے"

مگر اہل بصیرت نے دعویٰ کیا ہے اور بجا دعویٰ کیا ہے کہ داستان دل بہلانے کے لئے صرف اچھا فن نہیں ہے بلکہ اس کے اندر کئی ایسی بصیرتیں بھی چھپی ہوئی ہیں۔ جن تک پچھلوں نے رسائی حاصل نہیں کی تھی اور یہ رسائی حاصل ہوئی ہے تو انہیں ۴۵' ۵۰ برسوں میں حاصل ہوئی ہے۔

پروفیسر کلیم الدین احمد غالباً پہلے شخص ہیں جنھوں نے اردو زبان اور فن داستان گوئی (۱۹۴۴ء میں) ان چھپی ہوئی بصیرتوں کی طرف توجہ دلائی ہے۔ محمد حسن عسکری نے داستان کو پرکھنے کا ایک نیا انداز نظر پیش کیا ہے۔

حال ہی میں اس سلسلے کی تین کتابیں منظر عام پر آئی ہیں۔ "داستان کی داستان" پروفیسر آرزو چودھری کی تالیف ہے۔ اس میں مواد خاصا فراہم کر دیا گیا ہے۔ گو داستان کو جانچنے کا کوئی نیا نقطہ نظر سامنے نہیں آتا بہرحال اس کتاب کی بھی اپنی اہمیت واضح ہے "داستان کی داستان" اس نظریے کے ساتھ اشاعت پذیر ہوئی ہے کہ اس کے ذریعے عالمی کلاسیکی کہانیوں کے پس منظر میں اردو داستانوں کا تحقیقی' تخلیقی اور تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔

اس کے علاوہ جو دو کتابیں چھپی ہیں' ان میں ایک تو ڈاکٹر سہیل احمد خان کے تھیسس کا ایک حصہ ہے اور دوسری ان کے ہم نام ڈاکٹر آغا سہیل کا تحقیقی کارنامہ ہے۔ "دبستان لکھنؤ کے داستانی ادب کا ارتقاء" موخر الذکر کتاب صرف ایک سال پیشتر چھپی ہے۔

ڈاکٹر سہیل احمد خان کا نقطہ نظر اپنے تمام پیشرو نقادان فن کے لحاظ نظر سے مختلف ہے۔ سہیل احمد خان صاحب نے اردو کی داستانوں میں تصوف کے اسرار و رموز کی نشاندہی کی ہے۔ ان کا ذوق تحقیق انہیں داستانوں کے ان گوشوں میں لے گیا ہے' جہاں نیکی و بدی کی رزم آرائیوں میں نفس انسانی کے دو متضاد عناصر ایک دوسرے سے برسرپیکار ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ڈاکٹر سہیل احمد خان کا فکر انگیز مقالہ اپنے پڑھنے والوں کو داستانی ادب کی نئی جہتوں سے آشنا کرتا ہے۔

ڈاکٹر آغا سہیل کا مقالہ ایک دوسرے اور ڈاکٹر سہیل احمد خان کے زاویہ نگاہ سے بہت حد تک مختلف اور نئے نقطہ نظر کے ساتھ صورت پذیر ہوا ہے۔ آغا صاحب اپنے مقالے میں داستان کی تہذیبی معنویت واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چنانچہ ابتدائیہ کی سطریں ملاحظہ فرمایئے۔

آغا صاحب کہتے ہیں:۔ "داستان جو لکھنؤ میں لکھی گئی اور لکھنؤ میں پھلی پھولی اور ترقی کے مدارج طے کرتی ہوئی کبھی سرور کی "فسانہ عجائب" میں ظاہر ہوئی اور کبھی یاد' قمراور تصدق حسین کی "طلسم ہوشربا" میں تو اس نے ایک تہذیبی شکل اختیار کرلی۔ اب لکھنویت کی پہچان اسی داستان کے حوالے سے قائم رہتی ہے یہ درست ہے کہ سرشار نے فسانہ آزاد کو ناول کی شکل میں پیش کیا لیکن اس کے تہذیبی رنگ میں داستانی خدوخال کی پہچان مشکل نہیں۔"

صفحہ نمبر ۲۷ میں یہ سطریں ملتی ہیں:۔

"کیا لکھنوی دبستان کی الف لیلیٰ اور کیا بیرون لکھنؤ کی الف لیلیٰ دونوں میں فاصل کردار موجود ہیں اور نہ اسلامی تہذیبی مثالی رنگوں میں اجاگر ہوئی ہے۔"

مندرجہ بالا اقتباس کی آخری سطر بہت اہم ہے۔ ڈاکٹر آغا سہیل کو اردو کی داستانوں میں 'ہند اسلامی تہذیب مثالی رنگوں میں اجاگر ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔ یہاں اس بات کو نظرانداز نہیں کرنا چاہئے کہ اردو داستانوں کا اہم ترین حصہ لکھنؤ کی سرزمین پر لکھا گیا ہے۔ گویا ہند اسلامی تہذیب نے دبستانِ لکھنؤ کے داستانی ادب میں اپنی نمود کا اظہار کیا ہے۔

میں ایک اور نہایت اہم اقتباس بھی پیش کروں گا۔ صفحہ نمبر ۲۳۶ پر آغا صاحب کی یہ تحریر دعوت فکر دیتی ہے:۔

"طلسم ہوش ربا" میں لکھنوی تہذیب کے تحفظ کا کام بخوبی انجام دیا ہے۔"

تین سطروں کے بعد آغا صاحب نے تہذیب کے معنویت اور حقیقی مفہوم کی صراحت یوں کی ہے:۔

"تہذیب کا وسیع تر مفہوم یہ ہے کہ محض جغرافیائی حدود اربعہ تک محدود نہیں بلکہ تاریخی' معاشرتی اور روایتی انداز کے ذریعے' جو ثقافت معرض وجود میں آتی ہے اور جو ادب' رقص' موسیقی اور مصوری میں اپنے جلوے دکھاتی ہے' وہی تہذیبی متاع قرار پاتی ہے۔"

یہ اقتباس ڈاکٹر آغا سہیل کے نقطہ نظر کی بخوبی وضاحت کرتا ہے اور جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے' دعوت غور و فکر بھی دیتا ہے۔

آغا صاحب کی کتاب داستانوں کا تہذیبی مطالعہ بلکہ تہذیبی تجزیہ ہے اور یہ کہنا بے جا نہیں ہوگا کہ آغا صاحب داستانوں کی نئی دنیا کے کولمبس ہیں اور یہ بڑی بات ہے۔

آغا صاحب نے تمام داستانوں کا ناقدانہ بصیرت کے ساتھ تجزیہ کیا ہے اور ہر داستان کا تہذیبی پس منظر بھی واضح کیا ہے اور یہ پس منظر ہی خصوصی طور پر مصنف کے پیش نظر رہا ہے۔

آغا صاحب کی کتاب کا دوسرا باب عالمی داستانوں کی تاریخ لئے ہوئے ہے۔ مختلف ملکوں میں داستان ادب کے نمائندہ کتابوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ باب معلومات افزا بھی ہے اور عالمی داستانوں کے مطالعے کے لئے تاریخی تناظر بھی مہیا کرتا ہے۔

ڈاکٹر آغا سہیل کا تحقیقی و تنقیدی کارنامہ

دبستان لکھنؤ کے داستانی ادب کا ارتقاء — ڈاکٹر وقار راشدی

بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے' شہر نا پرساں' تل برابر آسماں' افسانوں کے کئی مجموعے اور ناول "غبار کوچہ جاناں" کے خالق ڈاکٹر آغا سہیل ہیں۔ افسانوں اور ناولوں کے علاوہ ان کے تحقیقی و تنقیدی مقالات کی کتابیں' لسانیاتی خاکہ' ادب اور عصری حسیت' سرور سلطانی اور معارف سہیل شائع ہوئیں تو بحیثیت افسانہ نگار' ناول نویس' محقق و نقاد ادبی دنیا میں بہت جلد متعارف ہو گئے۔ انہوں نے اپنی ادبی زندگی کے آغاز سے تا حال تسلسل و تواتر کے ساتھ اتنا کچھ لکھا ہے کہ ان کا نام اور کام کسی تعارف سے بے نیاز ہے۔ اب ان کا شمار اردو ادب کے جلیل القدر اہل قلم میں ہوتا ہے۔

اردو کی داستانوں کی تاریخ اتنی قدیم ہے جتنی کہ خود اردو کی تاریخ' اردو میں داستانیں' مثنوی مرثیے کی صورت میں نظم میں بھی لکھی گئیں اور نثر میں بھی۔

"دبستان لکھنؤ کے داستانی ادب کا ارتقاء" ڈاکٹر آغا سہیل کی نئی کتاب ہے جو برصغیر پاک و ہند کے نامور اور معتبر محقق' نقاد' دانشور ڈاکٹر وحید قریشی کے زیر نگرانی مغربی پاکستان اردو اکیڈمی' لاہور کے توسط سے منظر عام پر آئی ہے۔ یہ کتاب دراصل ڈاکٹر آغا سہیل کی پی ایچ' ڈی کا مقالہ ہے اردو کے داستانی ادب سے متعلق پنجاب یونیورسٹی کے تحت اور بھی کئی مقالے ڈاکٹریٹ کے لئے لکھے گئے ہیں جو ابھی منتظر اشاعت ہیں۔

راقم الحروف کے سامنے دبستان لکھنؤ کی معروف داستانیں اور ان کے بھاؤ تھے جس میں یہ موقف اختیار کیا گیا کہ اصل داستان لکھنؤ ہی میں پیدا ہوئی۔ لکھنؤ ہی میں اس پر شباب آیا اور لکھنؤ ہی میں اس کا انتقال ہو گیا جبکہ سہیل بخاری کی رائے یہ ہے کہ داستان فورٹ ولیم کالج میں پیدا ہوئی۔ لکھنؤ میں اس پر شباب آیا اور رام پور میں اس کا انتقال ہو گیا۔ ہم دونوں کے موقف میں یہ واضح فرق اس لئے ہے کہ بخاری صاحب نے داستانوں کے مزاج' مذاق اور اسلوب کا کوئی تعین نہیں کیا او تحقیقی داستان کی شناخت کوئی

مشروط تعارف نہیں کرایا۔ جس کے سبب بسا اوقات داستان کو قصہ اور قصے کو داستان لکھتے ہیں اور دونوں میں کوئی امتیاز روا نہیں رکھتے۔ یہی حال گیان چند جین کا ہے۔"

(ص ۲۰٦)

ڈاکٹر آغا سہیل نے ڈاکٹر سہیل بخاری اور ڈاکٹر گیان چند جین کے خیالات و نظریات کو رد نہیں کیا۔ بلکہ ان کی کاوشوں کو سراہتے ہوئے ان سے استفادے کا اعتراف کیا ہے۔ لیکن داستان کی جائے پیدائش' مقام ترویج اور مدفن کے موقف سے اختلاف کیا ہے۔ ڈاکٹر آغا سہیل اردو نظم و نثر میں داستانوں کے تاریخی پس منظر' تہذیبی و معاشرتی پہلوؤں کے مطالعہ کا احاطہ کرتے ہوئے اس بات پر مصر ہیں کہ .... "اصل داستان لکھنؤ میں پیدا ہوئی۔ لکھنؤ ہی میں اس پر شباب آیا اور لکھنؤ ہی میں اس کا انتقال ہو گیا۔"

ڈاکٹر صاحب نے اپنی بحث کا دائرہ صرف لکھنؤ' دہلی' شمالی ہند یا جنوبی ہند کی داستانوں تک محدود نہیں رکھا بلکہ بیرون ہند اور اس سے آگے بڑھ کر یورپ اور یونان میں لکھی جانے والی داستانوں سے اردو داستانوں کا تقابلی مطالعہ بھی پیش کیا ہے۔ متعدد ماخذات کے حوالوں سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اگر داستانیں بیرونی زبانوں سے اردو میں درآمد نہ بھی کی جاتیں جب بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس لئے کہ ابتدائی ایام سے جب دیگر زبانوں میں داستان طرازی کا رواج شروع ہوا' اسی زمانے سے اردو میں بھی داستان نویسی کا آغاز ہو چکا تھا۔ یہ داستانیں لکھنؤ' دہلی' شمالی و جنوبی ہند کی فضاؤں میں گونج رہی تھی۔ یہ داستانیں ان خطوں کی تہذیب و تمدن و ثقافت و معاشرت کی رگوں میں سمائی ہوئی تھیں اور بتدریج نشوونما پا رہی تھیں۔

ڈاکٹر آغا سہیل نے اردو کی منظوم داستانوں کا بھی ذکر کیا ہے لیکن ضمناً۔ اس لئے کہ نظم پر جو داستانیں لکھی گئیں وہ ان کے موضوع کے دائرے میں نہیں آئیں۔ البتہ نثری داستانوں کا بالتفصیل تجزیہ کرتے ہوئے یہ نتائج پیش کئے ہیں کہ اردو داستانوں کی ابتداء' ارتقا' اور انتہاء اہل لکھنؤ کی مرہون منت ہے۔

ڈاکٹر سہیل نے اپنے موضوع کا احاطہ سات ابواب میں حسب ذیل عنوانات

کے تحت نہایت جامعیت اور خوش اسلوبی سے کیا ہے۔

دبستان لکھنؤ میں داستان کے اولین نقوش' لکھنؤ کی اہم اور غیر اہم داستانیں۔ تحسین اور نو طرز مرصع۔

مرزا رجب علی بیگ سرور اور فسانہ عجائب۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار کا فسانہ آزاد' داستان' داستانی عناصر اور لکھنویت کی نمائندگی۔

طلسمات و مہمات کی داستانیں اور لکھنویت۔ دبستان لکھنؤ۔

ڈاکٹر آغا سہیل کی کتاب کا موضوع' نفس مضمون اور دبستان لکھنؤ کے اختصاص کی وجہ سے دیگر ناقدین کے نقطہ ہائے نظر سے مختلف ہے۔ انہوں نے اپنے نظریات کو واضح تر کرنے اور اپنی وکالت کو زیادہ سے زیادہ موثر بنانے کی خاطر یک طرفہ جواز پیش نہیں کیا بلکہ قارئین کی عدالت کے سامنے اپنے پیش رو بزرگوں مثلاً۔ ڈاکٹر گیان چند جین' ڈاکٹر سہیل بخاری' کلیم الدین احمد' حسن عسکری' عزیز احمد جیسے نقادوں کا تفصیلی مطالعہ بھی پیش کیا ہے اور دلائل و شواہد کے تمام پہلوؤں پر بحث کرتے ہوئے اپنے موقف کی صراحت کی ہے۔ ڈاکٹر آغا سہیل کا کہنا ہے۔

"دبستان لکھنؤ کے حوالے سے جو بات کی گئی ہے اس سے محض تعین خط منظور ہے تاکہ کلچر اور زبان کے سلسلے میں جو نقطہ ہائے نظر پیش کئے جائیں ان میں گنجلک' ابہام' زود پسندگی نہ ہو۔ دوسری بات یہ ہے کہ ناول کے ارتقائی علم کے سلسلے میں جو ایک نقطہ نظر پیش ہوتا رہا ہے کہ مغرب سے فورٹ ولیم کالج' دلی کالج اور سرسید کی تحریک کے حوالے سے ناول آیا ہے اسے رد کیا جا سکے اور دبستان لکھنؤ میں جو شعوری یا غیر شعوری طور پر داستان ناول کی نہج پر فطری طور پر چل رہی تھی اس کے فکری و روایتی نقوش کو اجاگر کیا جا سکے۔"

(ص ۲۶۴)

ڈاکٹر صاحب کا یہ موقف کسی حد تک درست ہے اس کا فیصلہ تو مستقبل کی تاریخ کرے گی۔ لیکن یہاں ڈاکٹر صاحب کو تحقیق کی افادیت اور ان کے تنقیدی اسلوب کی

انفرادیت سے انکار کی گنجائش نہیں۔ لکھنؤی تہذیب و شائستگی ان کے سبک لہجے، تحریر کی شگفتگی، زبان کی شیرینی اور بیان کی لطافت سے نمایاں ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا طرز نگارش فاضلانہ ہوتے ہوئے بھی نہایت دلکش اور خوبصورت ہے۔

کتابیات کے تحت ایک سو اکہتر (۱۷۱) کتابوں کی فہرست سے ڈاکٹر سہیل آغا کی محنت شاقہ، دیدہ وری، عرق ریزی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ حالاں کہ ان کتابیات کے علاوہ بھی متعدد کتب و رسائل، مخطوطات و دستاویزات ڈاکٹر صاحب کے زیر مطالعہ آئی ہوں گی۔

کتابیات کے ذیل میں کتب و اہل کتب کے ساتھ ناشرین و سن اشاعت کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ کاش یہ کمی نہ ہوتی تو اہل تحقیق کے لئے یہ حوالہ جات مزید معلومات بہم پہنچانے کا سبب بن سکتے تھے۔

بہرکیف "دبستان لکھنؤ کے داستانی ادب کا ارتقاء" اپنے موضوع اور مواد کے اعتبار سے ایک اہم کتاب ہے جسے تحقیق و تنقیدی ادب میں ایک امتیازی درجہ عطا ہوگا۔

ڈاکٹر آغا سہیل نے اس کتاب کی تصنیف سے اردو میں تحقیق اور تنقید دونوں کے معیار کو اونچا کرنے میں جو کردار ادا کیا ہے، کھلے دل سے اس کا اعتراف کیا جانا چاہئے۔

آغا سہیل کے تنقیدی نظریات

عبدالکریم خالد

ڈاکٹر آغا سہیل صاحب ۶ جون ۱۹۹۳ء کو ساٹھ برس پورے کرکے ایف سی کالج لاہور سے سبکدوش ہوئے تو تمیل ڈائری پر اپنے قلم سے واجد علی شاہ اختر کے ترجیع بند مخمس کا یہ شعر نقل کیا:

در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
خوش رہو اہل چمن ہم تو سفر کرتے ہیں

آغا صاحب نے لکھنؤ کو چھوڑا اور لاہور کے ہو رہے مگر اہل دل جانتے ہیں، لکھنؤ ایسے کہاں چھوٹتا ہے، آغا صاحب سے بھی لکھنؤ نہیں چھوٹا۔ عمر عزیز کا سنہرا دور لاہور کے ایک تعلیمی ادارے کی نذر کرنے کے بعد یہاں سے رخصت ہوتے ہوئے انہیں اپنا لکھنؤ یاد آ گیا۔ اور ساتھ ہی لکھنؤ کے جان عالم واجد علی شاہ کا یہ شعر بھی، جو انہوں نے لکھنؤ سے رخصت ہوتے وقت کہا تھا۔ جوش صاحب نے "یادوں کی بارات" میں لکھا ہے کہ ان کے بچپن تک برسات کے موسم میں اودھ کی قصباتی عورتیں واجد علی شاہ کی یاد میں رو رو کر یہ گیت گاتی تھیں:

ہائے ترے بنا بر کھانہ سہائے
ارے مورے کلکتے کے جویا اللہ تمہیں لائے
ہائے اللہ تمہیں لائے

واجد علی شاہ جب تک جیے، لکھنؤ کو یاد کرکر کے روتے رہے مگر انہیں دوبارہ لکھنؤ دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ آغا صاحب، واجد علی شاہ کے اسی لکھنؤ میں ۱۹۳۳ء میں پیدا ہوئے۔ واجد علی شاہ کے لکھنؤ چھوڑنے کے تقریباً ۷۷ برس بعد۔۔۔۔۔ اس دور میں شاید وہ بزرگ موجود ہوں جنہوں نے واجد علی شاہ کے قرب و جوار کا زمانہ پایا ہو۔ لیکن آغا صاحب کے دھیان میں جن شخصیتوں کے نقوش قائم ہیں وہ ۱۹۴۸ء کے لگ بھگ لکھنؤ میں موجود تھیں اور یہاں کی قدیم علمی و ادبی روایات کو زندہ رکھے ہوئے تھیں۔ آغا صاحب نے

احتشام حسین، سجاد ظہیر، رضیہ سجاد ظہیر، اثر لکھنؤی، آل احمد سرور، علی عباس حسینی، علامہ اختر علی تلہری، اور حیات اللہ انصاری جیسی شخصیتوں کو محض دیکھا ہی نہیں بلکہ انھیں ان اکابرین کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے اور برتنے کے مواقع بھی میسر آئے۔

ان شخصیات سے آغا صاحب کا تعارف اس وقت ہوا جب وہ قلم و قرطاس سے اپنا رشتہ قائم کر چکے تھے۔ لڑکپن کے زمانے ہی میں وہ پریم چند، کرشن چندر، منٹو اور احمد ندیم قاسمی کے افسانے پڑھ پڑھ کر خود بھی افسانے لکھنے لگے تھے جو اس وقت کے بعض رسائل میں شائع بھی ہونے لگے تھے۔ یہ لکھنؤ کی مٹی کا اثر تھا یا کوئی اور کرامت تھی جس نے سن بلوغت تک پہنچتے پہنچتے ان کے اندر تخلیق کا ایسا بیج بو دیا تھا جس سے پھوٹنے والی نرم و نازک کونپلیں لکھنؤ کے باکمالوں میں ایک نئے ہنرور کے اضافے کی خبر دے رہی تھیں۔ پندرہ برس کی عمر میں آغا صاحب نے احتشام حسین کی کتاب "ادب اور سماج" پڑھ ڈالی اور یوں ان کے تخلیقی رویوں نے تنقید کی انگلی پکڑ کر ایک نئی جہت کا سراغ پایا۔ "ادب اور سماج" کا مطالعہ آغا صاحب کے لیے ایک حیرت انگیز تجربہ تھا:

> "مذکورہ کتاب پڑھنے کے بعد میری فکری بلوغت کا آغاز ہوا اور میں ادب کی الف بے پڑھنے پر آمادہ ہوا اور اس کتاب کے مضامین کو بار بار سمجھ کر پڑھا۔ چبا چبا کر ہضم کرنے کی کوشش کی۔ پھر اس کے مصنف کے بارے میں ذہن نے ایک امیج بنانا شروع کیا کہ وہ شخص ایسا ہوگا، یوں لکھتا ہوگا۔ یوں چلتا ہوگا اور اللہ جانے کہ زمین پر چلتا ہوگا کہ آسمان پر۔"

(معارف سہیل ص۸)

یہ ایک پندرہ برس کے ذہن میں ابھرنے والے امیجز ہیں جو فکری بلوغت کی پہلی سیڑھی پر کھڑا ہے اور احتشام حسین کے فکر انگیز مضامین پڑھ کر ان کی شخصیت کے چلتے بجھتے، جگنوؤں کو پکڑنے کی کوشش کر رہا ہے۔ یہیں سے آغا صاحب کی تنقید شروع ہوتی ہے۔ فکری رویوں کو احساس اور جذبے کی سطح پر سمجھنے کی یہ ابتدائی کاوش آگے چل کر تفکر

و تعقل کا ایک پورا نظام مرتب کرتی ہے:

"..... حسن اتفاق سے کتاب کے مصنف کے ایک لیکچر کا اعلان ہوا اور بصد اشتیاق میں وہاں پہنچا اور اپنے محبوب مصنف کو اسٹیج پر اسی طرح پر مغز تقریر کرتے ہوئے سنا جس طرح کتاب کے بین السطور میں اس کی شخصیت ابھرتی تھی۔ ایک نرم رو' لطیف مگر رواں دواں ندی کی لہروں کی مانند خیالات موج در موج بہتے چلے جاتے تھے جیسے کوئی اپنے ذہن کے نہاں خانے میں چھپا بیٹھا ہو اور بڑی روانی سے کوئی کتاب پڑھتا چلا جائے۔ ایسی کتاب جو سمندر کے مانند بے کراں ہو اور سمندر سے خیالات و افکار کے دھارے ابل رہے ہوں گویا سمندر بلویا جا رہا ہو۔ مجھے یقین ہو گیا کہ ادب اور سماج کا مصنف یہی ہے کہ علم کا ساگر ہے اور ساگر کا کوئی چھور نہیں"

(معارف سہیل ص۸)

آغا صاحب کی ان سطور سے فکر کی وہ اولین چنگاری پھوٹتی نظر آتی ہے جسے بعد میں انجمن ترقی پسند مصنفین لکھنؤ کے تنقیدی جلسوں اور خود ان کی اپنی علمی ' ادبی اور ذہنی ریاضتوں نے ایک الاؤ کی شکل دے دی۔ آج آغا صاحب ایک تخلیق کار کے طور پر ہی نہیں بلکہ ایک قابل توجہ نقاد کے طور پر بھی دنیائے اردو ادب میں اپنا اعتبار قائم کئے ہوئے ہیں۔

(۲)

ایک نقاد کے لیے صاحب فکر ہونا اتنا ہی ضروری ہے' جتنا آدمی کے لیے انسان ہونا۔ آدمی میں انسان ڈھونڈنے نکلیں تو اکثر مایوسی ہوتی ہے۔ نقادوں میں صاحب فکر نقاد کی

تلاش کے لیے بھی بہت جتن کرنا پڑتے ہیں اور اکثر و بیشتر یہ محنت رائیگاں ہی جاتی ہے۔
ہمارے ہاں ایسے نقادوں کی کمی نہیں جو فکری اعتبار سے ابھی بلوغت کی منزل سے بہت دور ہیں چنانچہ ان کے یہاں تنقید میں کسی زاویہ نگاہ کا پیدا ہونا تو ایک طرف رہا وہ دوسروں کے بنے بنائے اصولوں اور گھڑے گھڑائے نظریات کو سلیقے سے برتنے کا ڈھنگ بھی نہیں جانتے ان کی تحریریں دیکھ کر صاف پتا چلتا ہے کہ وہ لفافے کو سونگھ کر خط کا مضمون بھانپنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

خون ہر اک رقم شوق سے ٹپکے تھا ولے
وہ نہ سمجھا کہ مرے نامے کا مضموں کیا ہے

فن پارے کی بیرونی سطح کو چھو کر اگر کوئی نقاد یہ سمجھتا ہے کہ اس نے بڑا تیر مار لیا ہے تو یہ اس کی خام خیالی ہے۔ ایک فن پارہ اپنی متنوع جہتوں کے ساتھ نقاد کو دعوت فکر دیتا ہے ایک کامیاب تخلیقی عمل میں تو فنکار کی اپنی ذات کی گہرائی اور وسعت بھی شامل ہو جاتی ہے۔ اس کے نظریات' میلانات اور جمالیاتی سلسلے فن پارے کے درون میں سانس لیتے ہیں۔ نقاد اگر یہ سانسیں نہیں گن سکتا تو اسے کم از کم ان کیفیتوں کو تو اپنی گرفت میں لینا چاہئے جو فنکار کے دائرہ احساس سے نکل کر فن پارے میں منتقل ہوتی ہیں۔ فنکار کے دائرہ احساس میں اور بھی کئی چیزیں ہوتی ہیں مثلاً اس میں اس کی اپنی تہذیب بھی موجود ہوتی ہے جس کے سرے تلاش کرنے کے لیے نقاد کو بیک وقت کئی تہذیبی علاقوں سے گزرنے کا فریضہ بھی انجام دینا ہوتا ہے۔ بقول جیلانی کامران' علم تنقید کے سارے راستے معانی تک پہنچتے ہیں اور معانی تک پہنچنے کا راستہ صرف ان تہذیبی منطقوں ہی سے گزرتا ہے جن کے درمیان معانی نے تخلیقی شکل و صورت اختیار کرلی ہے۔

تو صاحب' تنقید کا کام اتنا آسان نہیں رہا۔ یہ تو پل صراط پر چلنے کا عمل ہے۔ ایک آگ کا دریا ہے جس میں ڈوب کر پار اترنا ہے لیکن اردو تنقید کی سہل انگاری نے

تخلیقی ذہن سے وہ اعتماد چھین لیا ہے جو اسے پنپنے اور پروان چڑھانے میں مدد دیتا ہے اور پورے پاؤں زمین پر کھڑا کرتا ہے۔ تنقید کا کام محض قصیدے پڑھنا یا خامیوں کا گنوانا نہیں بلکہ یہ سمجھنے، سمجھانے اور جاننے کا عمل ہے۔ تخلیق کار تو اپنی تخلیق میں خرچ ہوتا ہی ہے کوئی کم کوئی زیادہ لیکن نقاد کو تخلیق کار کی سطح سے چند قدم آگے اس سے کہیں زیادہ خرچ ہونا پڑتا ہے۔ تخلیق کار اپنی تخلیق کے لیے جن مشقتوں اور صعوبتوں کو برداشت کرتا ہے۔ نقاد اگر ان سے پہلوتہی کرے گا تو وہ نہ تخلیق کو سمجھ پائے گا اور نہ اس کے اندر چھپے ہوئے امکانات کو دریافت کر سکے گا۔

ہماری آج کی تنقید کس حد تک دیانتداری سے یہ کام سرانجام دے رہی ہے۔ اس کا فیصلہ آپ خود کر لیجئے۔ موجودہ دور میں ہمارے صاحب فکر و نظر نقاد اب رہ ہی کتنے گئے ہیں، انگلیوں پر گن لیجئے اور جو رہ گئے ہیں وہ اپنے تنقیدی اور فکری سرمائے میں مزید کتنا اضافہ کر پائے ہیں؟ یہ بھی دیکھ لیجئے۔ ہو سکتا ہے اس کا سبب معاشرے کے معاملات و مسائل اور حالات کی سنگینی رہا ہو جس نے تخلیقی عمل کو متاثر کرنے کے ساتھ ساتھ اعلیٰ اور معیاری تنقید کا راستہ بھی روک رکھا ہے۔ لیکن یہ بظاہر کوئی معقول وجہ معلوم نہیں ہوتی۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی صاحب اس صورتحال کو ایک دوسرے حوالے سے دیکھتے ہیں:

> "موجودہ زمانے میں ہمارے ہاں کوئی ذہنی اور فکری تحریک نہیں ہے تنقید کا پودا تو ذہنی اور فکری تحریکوں کی زمین ہی میں پھوٹتا اور پروان چڑھتا ہے اور جب وہ پروان چڑھتا ہے تو اسی کے سائے میں نئے ادبی رجحانات کے پھول نکلتے ہیں اور آزادی فکر، آزادی خیال اور آزادی اظہار کی دھوپ چھاؤں ہی ان پھولوں کو شاداب رکھ سکتی ہے۔"

تو کیا آج ہمیں ایک بار پھر کسی ذہنی اور فکری تحریک کی ضرورت ہے؟ اس کا فیصلہ میں آپ پر چھوڑتا ہوں۔

(۳)

آغا صاحب نے احتشام حسین کی فکری راہنمائی میں تخلیق و تنقید کے رموز

سے شناسائی حاصل کی۔ لکھنؤ کی علمی و ادبی صحبتیں اس پر مستزاد تھیں۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کے جلسوں نے ان کی ذہنی اور فکری صلاحیتوں کو جلا بخشی۔ اپنی بات کہنے اور دوسرے کی بات سننے کا سلیقہ انجمن کے جلسوں ہی کا فیضان تھا۔ وہ تین برس تک انجمن کے سیکرٹری منتخب ہوتے رہے اور احتشام حسین کی سرپرستی میں نہایت کامیابی سے انجمن کے جلسوں کا انتظام کرتے رہے۔ آغا صاحب کی ابتدائی ادبی زندگی کے بارے میں یہ معلومات ان کی شخصیت اور ادبی رویوں کو سمجھنے میں مدد دیتی ہیں۔ ان کے ترقی پسندانہ ذہن نے ادب اور زندگی کو جس مضبوط اور پختہ حوالے کے ذریعے سمجھا اور قبول کیا ان سے ان کی ذات اور شخصیت میں ایک ٹھہراؤ اور استحکام پیدا ہوا۔ ایک خاص نوع کی حقیقت پسندی نے ان میں چیزوں کی ماہیت کو جانچنے اور پرکھنے کی صلاحیت ودیعت کی اور معروضی حقائق کے تناظر میں استدلالی فیصلوں کی قوت بخشی۔ آغا صاحب کی یہ معروضیت' حقیقت پسندی اور متوازن شخصیت ان کی تحریروں میں منعکس ہوتی ہے تو اپنے معاصرین سے الگ ایک نئی صورت حال کا پتا دیتی ہے۔ ان کی انفرادیت یہ ہے کہ انہوں نے جدیدیت کے شوق میں روایت کا خون نہیں ہونے دیا بلکہ اردو ادب کی کلاسیکی روایت کو جدید مزاج سے ہم آہنگ کر کے عقل اور جذبے' شعور اور لاشعور' خارج اور داخل کو ایک کلیت میں تحلیل کیا۔ ان کے یہاں تنقید اور تخلیق دو الگ الگ چیزیں نہیں ہیں بلکہ ان کے کلیاتی نظام میں داخل ہو کر ایک وحدت اور اکائی کی شکل اختیار کر جاتی ہیں۔ تاریخ' عمرانیات' فلسفے' نفسیات' اور دیگر سماجی علوم کے گہرے مطالعے نے ان کے تفکر و تعقل کو ایک متوازن اور ٹھوس شکل عطا کی ہے۔ ان کی پختہ کاری اور معروضی انداز میں بے لاگ تجزیوں سے نہ صرف تخلیق کا اصل حسن نکھر کر سامنے آتا ہے بلکہ ہم ان تاریخی' تہذیبی' سماجی' اور شخصی حالات سے آشنا ہوتے ہیں جو مل جل کر فن پارے کے تار و پود میں شامل ہوتے ہیں۔

آغا صاحب بنیادی طور پر ایک تخلیق کار ہیں۔ انہوں نے اپنی زندگی کا آغاز ہی افسانہ لکھنے سے کیا۔ چنانچہ وہ آج بھی' جب کہ وہ ایک معتبر نقاد کے طور پر اپنی شناخت قائم

کر چکے ہیں۔ اپنی تخلیقی حیثیت کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے کائنات' انسان اور زندگی کو نقاد سے زیادہ ایک تخلیق کار کی نظر سے دیکھا ہے۔ ایک تخلیق کار کائنات اور زندگی کے پھیلے ہوئے آفاق کو سمیٹ کر ایک مرکز پر لے آتا ہے۔ اب یہ تخلیق کار کی اپنی استعداد پر منحصر ہے کہ وہ اس مرکزی نقطے کو زیادہ سے زیادہ کتنا مہین بنا سکتا ہے۔ یہاں سے نقاد کا کام شروع ہوتا ہے نقاد کا پہلا کام تو اس مہین نقطے کی تلاش ہے۔ یہاں اس کی فکر اور بصیرت کام دکھاتی ہے۔ اور وہ اس مہین نقطے کو مائیکروسکوپک طریقوں سے ڈھونڈ نکالتا ہے۔ یہ بہت باریک کام ہے جو حد درجہ احتیاط کا تقاضا کرتا ہے۔ نقاد مرکزی نقطے کی تلاش کے بعد اسے Blowup کر کے اصل شکل میں لاتا ہے۔ جہاں ہر شے اسے واضح اور صاف دکھائی دیتی ہے۔ آغا صاحب ایک تخلیق کار اور نقاد ہونے کے ناطے یہ کام بیک وقت دونوں سطحوں پر انجام دیتے ہیں اور سائنسی خطوط پر وسعتوں کو نقطہ بنانے اور نقطے کو وسعت عطا کرنے کے فن میں مہارت رکھتے ہیں۔ ذات سے کائنات اور کائنات سے ذات کے سفر میں یہی کلیہ کام آتا ہے اور اس میں کبھی ذات کائنات بن جاتی ہے اور کبھی کائنات ذات کی صورت میں متشکل ہوتی ہے۔ آغا صاحب کے یہاں کائنات کے ذات بننے کا عمل زیادہ قوی ہے ان کے افسانوں کا مطالعہ کیا جائے تو اس نوع کی کئی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ ان کے ایک افسانے کا عنوان ہی "تل برابر آسمان" ہے۔ تاہم ان کی تنقید میں دوسرے سفر کا سراغ ملتا ہے جس میں وہ ذات سے کائنات کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ یہاں ذات سے مراد صرف لاشعور کی نفسی کیفیات یا جذبے اور احساس کی بنیاد پر ترتیب پانے والی داخلی دنیا ہی نہیں بلکہ اس میں وہ تمام شعوری اور خارجی محرکات اور تہذیبی و سماجی عوامل بھی شامل ہیں جو ذات کو ادھوری بے معنویت سے بچاتے اور اسے ایک متوازن اور مکمل صورت میں ظاہر کرتے ہیں۔

(۴)

آغا کے تصو

ہے۔ اس کتاب کو وہ آج بھی ان اہم کتابوں میں شمار کرتے ہیں جن کا ان کی زندگی میں واضح طور پر دخل رہا ہے۔ "ادب اور سماج" کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ تنقید کسی فن پارے کے صرف فنی محاسن بیان کرنے یا فنکار کے تاثرات پر اپنے تاثرات کے اضافے کا نام نہیں بلکہ اس کا کام ادب کی حقیقت اور ماہیت پر غور کرنا اور زندگی اور ادب کے اس رشتے کو سمجھنا ہے جس نے دونوں کو ایک تہذیبی قدر بنا دیا ہے۔ اس سلسلے میں "ادب اور سماج" کی یہ سطور دیکھیے:

> "..... اصول نقد پر غور کرتے ہوئے ان تاریخی قوتوں کو ہمہ وقت پیش نظر رکھنا چاہیے جن سے ادب وجود میں آتا ہے' جن سے انسان کی تمنائیں اور خواہشیں پیدا ہوتی ہیں' جن سے تنقید کی صلاحیت وجود میں آتی ہے' جن سے انسانی تمدن بنتا ہے اور جن سے ان قدروں کا تعین کیا جاتا ہے جو انسان کو آزادی' مسرت اور ترقی کی منزلوں تک پہنچا سکتی ہیں۔ جن کے لیے انسان ہر دور میں بے قرار رہے ہیں۔ کسی اور طرح کے اصول کا تصور کرنا ایک نامکمل کوشش ہوگی۔"

(ص ۳۲)

ان سطور پر غور کیا جائے تو تنقید کے بارے میں ایک جامع اور متوازن نقطہ نظر سامنے آتا ہے۔ احتشام حسین کے نزدیک ادب کا مقصد اجتماعی اور سماجی ہے جو زندگی کو فلاح و بہبود' حسن و مسرت اور دلکشی عطا کرتا ہے۔ یہی مارکس کی وہ مادی جدلیات ہے جو تاریخی اور سماجی حقیقت پسندی کی صورت میں احتشام حسین کے یہاں نظر آتی ہے۔

آغا صاحب اپنی تنقید میں اسی تصور کو لے کر آگے بڑھے ہیں۔ ان کے تنقیدی مضامین پر مشتمل دو کتابوں "معارف سہیل" (۱۹۷۵ء)' "ادب اور عصری حسیت" (۱۹۹۱ء) اور دیگر مضامین میں تنقید کا یہی ہمہ گیر اصول کار فرما نظر آتا ہے۔ احتشام حسین نے جن تاریخی قوتوں کی بات کی ہے ان میں سماجی' تاریخی' تہذیبی' معاشی' اخلاقی اور معاشرتی

تمام اقدار شامل ہیں۔ ان کے نزدیک ادب ان تمام اقدار کا آئینہ ہوتا ہے اور انہی سے زندگی کے سوتے پھوٹتے ہیں۔ آغا صاحب اپنی تنقید میں ان اقدار کو ساتھ لے کر چلتے ہیں اور ان کی روشنی میں فن پارے اور فنکار کی شخصیت کا متوازن تجزیہ پیش کرتے ہیں۔ آغا صاحب نے ترقی پسند تنقید کے تصورات میں مزید وسعت پیدا کی ہے۔ ان کے خیال میں انسان کے ذہنی ارتقاء اور اس کے خلق کی ترقی میں مددگار ثابت ہونے والی ہر تنقید، خواہ وہ کسی دبستان سے تعلق رکھتی ہو، کسی نہ کسی سطح پر ترقی پسند تنقید سے آملتی ہے:

" فرد اور معاشرے کے باہمی ارتباط سے جتنے بھی شعبے قائم ہوئے ہیں وہ سب ادب کے بالواسطہ اور بلاواسطہ مطالعے میں کام آتے ہیں۔ تنقید ان سب کا جائزہ لیتی ہے اور جملہ علوم متداولہ سے مدد لیتی ہے۔ وہ تمام علوم جو فرد کی تاریخی، عمرانی، نفسیاتی، اور روایتی جہتوں سے متعلق ہیں، تنقید ان کا بھی مطالعہ کرتی ہے۔ اور تمام اجتماعی، معاشرتی اور کائناتی سائینسوں سے بھی کام لیتی ہے۔ جو کسی نہ کسی طرح انسان کے ذہنی ارتقاء اور اس کے خلق کی ترقی میں مددگار ہیں۔ اس لحاظ سے خواہ سائنٹیفک تنقید ہو، خواہ رومانوی، جمالیاتی ہو یا تاثراتی، اسلوبیاتی ہو یا لسانیاتی، نفسیاتی ہو یا عمرانیاتی، سب کی سب ترقی پسند تنقید سے رابطہ پیدا کر لیتی ہے "

(ادب اور عصری حسیت، ص ۱۵)

آغا صاحب ادب کے سائنٹیفک مطالعے پر زور دیتے ہیں اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب ہم اجزاء کے پیچھے لپکنے کی بجائے ادب کی کلیت کو نگاہ میں رکھیں۔ ان کے خیال میں مادی جدلیات واحد ایسا نظریہ ہے جو فرد اور معاشرے کے تمام حقیقی اور صحیح خطوط کا تعین کرتا ہے اور یہی وہ سائنٹیفک زاویہ ہے جو ادب کو اس کے صحیح اور اصل تناظر میں دیکھتا ہے۔

"اصل میں سائنٹیفک تنقید کا دامن اتنا وسیع ہے کہ اس میں توضیح ' تشریح' تصریح' اور تجزیہ بھی شامل ہے اور وہ تمام معاشرتی علوم جن کی مدد سے انسانی ذہن اور کائنات کا علم حاصل ہوتا ہے اور انسان اور انسانیت کی مدد کرتا ہے سب شامل ہے۔ سائنٹیفک تنقید میں نظریہ ارتقاء بھی شامل ہے لیکن مابعد الطبیات کا وہ علم جو قیاس پر مبنی ہے اس دبستان کی کوئی مدد نہیں کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ ترقی پسند تنقید اپنے سائنٹیفک علوم کی شمولیت کی سبب ایک وسیع تر تناظر رکھتی ہے"

(ادب اور عصری حسیت 'ص ۲۰)

ان سطور کی روشنی میں یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہی کہ آغا صاحب کے یہاں کسی مجرد تنقیدی دبستان سے وابستگی کا کوئی تصور نہیں ہے۔ یہاں تک کہ وہ ترقی پسند ہونے کے باوجود خالص مارکسی تنقید پر بھی اصرار نہیں کرتے بلکہ تنقید کے اس ہمہ گیر تصور کے قائل ہیں جس میں غیر ترقی پسندوں کی ہیئت پرستی کے جزوی تصور سمیت تمام معاشرتی علوم اور تنقیدی تصورات شامل ہیں۔ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ آغا صاحب کے نظام فکر میں اصل اہمیت کلیت اور وحدت کو حاصل ہے۔ وہ تمام نظام ہائے فکر کو ایک نقطے پر مرتکز کر کے انہیں ایک کل میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ سائنٹیفک تنقید کا یہ تصور سب سے پہلے احتشام حسین نے پیش کیا اور آغا صاحب اس سلسلے میں ان کے ہم نوا ہیں کہ دونوں کے نقطہ ہائے نظر میں سرمو کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ احتشام حسین لکھتے ہیں:

"....سائنٹیفک نقطہ نظر وہ ہے جو ادب کو زندگی کے معاشی' معاشرتی اور طبقاتی روابط کے ساتھ متحرک اور تغیر پذیر دیکھتا ہے۔ یہ ایک ہمہ گیر نقطہ نظر ہے اور ادبی مطالعے کے کسی پہلو کو نظر انداز نہیں کرتا۔"

(تنقیدی نظریات 'ص ۱۳۵)

سائنٹیفک تنقید ایک نقاد سے جامع العلوم ہونے کا تقاضا کرتی ہے۔ اسے تاریخ کا مکمل شعور حاصل ہونا چاہیے۔ ادب کے تہذیبی پس منظر اور معاشرتی رویوں سے پوری آگاہی ہو۔ جملہ علوم متداولہ پر گہری نگاہ رکھتا ہو' تخلیقی عمل اور ادبی تخلیق پر اثر انداز ہونے والے سماجی عوامل سے واقفیت رکھتا ہو اور ان تمام عناصر کی ترکیب بندی کے ہنر سے آشنا ہونے کے ساتھ ساتھ جمالیاتی احساس' فنی محاسن اور سماجی روابط میں ایک حیرت انگیز توازن پیدا کرنے کی صلاحیت سے بہرہ ور ہو۔ آغا صاحب کی عملی تنقید میں ان جملہ مظاہر کی بآسانی نشاندہی ہو سکتی ہے۔ جس کے لیے ایک الگ مضمون درکار ہے۔ یہاں میں یہ ضرور کہوں گا کہ آغا صاحب کا سائنٹیفک انداز نظر ان کی تنقید ہی میں نہیں' ان کی شخصیت میں بھی موجود ہے کہ انہوں نے نہ تو اپنی شخصیت کے توازن کو بگڑنے دیا ہے اور نہ اپنے افعال و اعمال میں کسی بے ربطی یا افراط و تفریط کا شکار ہوئے ہیں اور اگر ہمارے نقاد برا نہ مانیں تو میں یہ بات ضرور کہوں گا کہ کسی نقاد کی منضبط و متوازن شخصیت ہی اس کی تنقیدی بصیرت اور فکر کی سب سے بڑی سند ہے۔

ڈاکٹر آغا سہیل کے تنقیدی افکار

باقر علی شاہ

انسان کے تخلیقی شعور نے زندگی کی تفہیم کی کوششوں میں ادب' سائنس اور مابعد الطبیعات کو جنم دیا۔ علم کی یہ ساری صورتیں سچائی' سکون' اجتماعی خوشحالی' سربلندی حسن اور خیر کی تلاش میں ایک ہی دروازے سے باہر نکلیں۔ اسی لئے تنقید کے دائرے کو صرف ادب تک محدود نہیں کیا جاسکتا بلکہ اسے پوری انسانی زندگی پر محیط تصور کیا جانا چاہئے' تاکہ مطالعہ غور و فکر اور تجزیے کے بعد فکر و احساس کی جڑیں حقیقی زندگی میں تلاش کی جاسکیں۔ حقیقی زندگی سے مراد وہ قدریں ہیں' جن کے حوالے سے معاشرے کی اجتماعی زندگی میں ایسی روح پھونکی جاسکے کہ تخلیقی جوہر معاشرے کی حقیقی زندگی کے لئے وہی کام کرتا ہے' جو جسم میں روح کرتی ہے۔ یوں نقاد کے لئے تاریخ تمدن کے مختلف ادوار کا مطالعہ مختلف زمانوں کے فکری اور ادبی رجحانات کے ربط باہم کا جائزہ انسانی نصب العینوں کے تشخص اور جاندار معاشرتی' اخلاقی اور ادبی قدروں کی نشاندہی کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر آغا سہیل تنقید کی ہمہ گیریت اور نقاد کی ذمہ داریوں کا تعین کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"فرد اور معاشرے کے باہمی ارتباط سے جتنے بھی شعبے قائم ہوئے ہیں' وہ سب ادب کے بالواسطہ اور بلاواسطہ مطالعے میں آتے ہیں۔ تنقید ان سب کا جائزہ لیتی ہے اور جملہ متداولہ علوم سے مدد لیتی ہے۔ وہ تمام علوم جو فرد کی تاریخ' عمرانی' نفسیاتی اور روایتی جہتوں سے متعلق ہیں' تنقید ان کا بھی مطالعہ کرتی ہے اور تمام اجتماعی' معاشرتی اور کائناتی سائنسوں سے بھی کام لیتی ہے۔ جو کسی نہ کسی طرح انسان کے ذہنی ارتقاء اور اس کے نطق کی ترقی میں معین و مددگار ہیں۔"

درحقیقت جدید علوم سے آگاہی اس لئے بھی ضروری ہے کہ عصر حاضر میں نقاد کی یہ ذمہ داری سمجھی جاتی ہے کہ وہ اپنے ہم عصر معاشرے کی شعوری' لاشعوری اور تحت زندگی اتنا گہرا' صحیح علم رکھے کہ اسے اس بات کا ادراک ہو کہ کونسے

عوامل معاشرے کی فکر رو میں تعمیری ہیں اور کونسے تخریبی اس کے علاوہ نقاد کی فکر میں اتنی پختگی ہو کہ وہ اپنی بصیرت اور تنقیدی صلاحیتوں سے کام لے کر ان تعمیری اور تخریبی عوامل کی واضح طور پر نشاندہی کر سکے اور تخریبی اور استحصالی قوتوں کے خلاف نہ صرف یہ کہ خود رزم آرا ہونے کا حوصلہ رکھتا ہو' بلکہ دوسروں کو بھی اس کا سبق دے۔ نقاد پر واجب ہے کہ وہ اپنے ہم عصر معاشرے کے وجود اور بطن میں جاری و ساری ان نزاعی و تخریبی رجحانات کی نشاندہی کرتا رہے' جو انسانی رشتوں' مراسم اور روابط سے انسان دوستی مروت اور خلوص کی جڑیں کاٹتے رہے ہیں اور ریاکاری' خود پسندی' ذاتی منفعت اندوزی اور آپا دھاپی کے جذبوں اور رویوں کو جنم دینا چاہتے ہیں۔ کیونکہ ہر جاندار چیز کی طرح ادب بھی مرض سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ طرح طرح کے ذہنی اور نفسی جراثیم اس میں داخل ہو جاتے ہیں۔ اس لئے ادب کو صحت مند رکھنے کے لئے نقاد کا یہ فرض ہے کہ ان جراثیم کے وجود سے انکار نہ کیا جائے بلکہ اس کو ادب کے بدن سے خارج کرنے کی تدبیریں کی جائیں' تب ہی ادب اور زندگی ایک ہو سکتے ہیں اور ایک دوسرے کی اصلاح کر سکتے ہیں۔ ڈاکٹر آغا سہیل ایسے نقاد کو "صالح نقاد" سے موسوم کرتے ہوئے اپنے ایک تنقیدی مضمون "افسانہ اور عصری آگہی" میں یوں رقمطراز ہیں:۔

"صالح نقاد موجود ہو تو کم از کم رطب ویابس کو علیحدہ کر کے صالح افسانہ نگار کی نشاندہی کر سکتا ہے اور لوگوں کو جتایا بتا سکتا ہے کہ صالح اقدار عصری آگہی میں کس حد تک جھلک رہی ہیں اور کس حد تک مزید نمائندگی کی ضرورت ہے۔ عصری آگہی میں صرف چند باتوں کا جان لینا کافی نہیں ہوتا' محاکمہ کر کے ان کی حیثیت کا تعین بھی ضروری ہوتا ہے۔"

کیونکہ ادب کا مطالعہ اوقات فرصت کا گزارنا نہیں' بلکہ اپنے آپ کو بیدار کرنے' متحرک زندگی بسر کرنے' لطف و ہمدردی اور ادراک کی صلاحیتوں میں زور اور قوت پیدا کرنا ہے۔ ادب کا مقصد بھی وہی ہے جو انسان کی دوسری کوششوں کا مقصد ہے۔ یعنی بہتر اور پرمسرت زندگی کا حصول علم کے ذریعے ہم حالات کا صحیح ادراک کر سکتے ہیں۔ سائنس ہمیں وسائل بخشتی ہے۔ جن سے کام لے کر ہم حالات کا رخ بدل سکتے لیکن

ادب ہمیں اس جدوجہد کے لئے ذہنی طور پر تیار کرتا ہے۔ دلوں کو نئی امنگ اور سرشاری بخشتا ہے۔ ادب زندگی کے مقصد سے ہٹ کر بے راہ رو ہو جاتا ہے۔ ادیب اور انسان کے فرائض یکساں اور مشترک ہیں۔ ادب کو بے غایت یا مقصود بالذات قرار دینا خود فریبی ہے یا دوسروں کو فریب دینے کی ایک شعوری یا غیر شعوری کوشش۔ ادب کو زندگی سے دور رکھنے کی ایک صورت ہیئت پرستی بھی ہے۔

ہیئت کی کلیت پر ایمان رکھنے والے دانستہ یا نادانستہ طور پر استحصالی اداروں کے آلہ کار بن جاتے ہیں۔ اس امر کی وضاحت ڈاکٹر آغا سہیل اس طرح کرتے ہیں:۔

"ہیئت پر ضرورت سے زیادہ زور دینے والے نقاد مواد اور اس کی ترسیل کے منکر ہو جاتے ہیں اور یہ وہ مجہول نقطہ نظر ہے جو سرمایہ دارانہ نظام کے عام اور حامی ناقدوں نے جان بوجھ کر پیدا کیا ہے' تاکہ اصل مقصد سے توجہ ہٹ جائے اور وہ روح عصر ادب میں نہ جھلکنے پائے' جو انسان اور انسانیت کا مقصود بالذات ہے اور جس کے ارتقاء سے کائنات کا ارتقاء وابستہ ہے۔"

اس مقام پر لکھنے والے کی جانبداری کا سوال سامنے آتا ہے۔ دیکھا جائے تو ہر ادیب شعوری یا غیر شعوری طور پر سماج کے تئیں ایک رجعت پسند یا ترقی پسند نظریہ رکھتا ہے' جس کا اظہار اس کی تخلیقات میں ہونا ناگزیر ہے۔ سماج کے بارے میں نظریے اس کا یہ مخصوص رویہ ہی اس کے سیاسی اور سماجی نظریئے کا تعین کرتا ہے۔ شعر و ادب تو آخر ایک تخلیقی اور فکری معاملہ ہے جس کا زندگی کی تبدیلیوں اور ان تبدیلیوں کے متعلق مختلف النوع نظریات سے گہرا رابطہ ہوتا ہے۔ روز مرہ کی زندگی میں معمولی سے معمولی انسان بھی خیالات کے اعتبار سے یا تو قدامت پسند ہوتا ہے یا ترقی پسند اس کے سوچنے سمجھنے کا ایک مخصوص ڈھنگ ہوتا ہے۔ وہ سماج اور کائنات کے متعلق ایک مخصوص نظریہ رکھتا ہے اور اس کا انحصار اس کے ماحول' اس کے سماجی مقام' اس کے مبلغ علم پر ہوتا ہے۔ زندگی کی ان بنیادی حقیقتوں اور تخلیقی عمل کے باہمی تعلق کی وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر آغا سہیل لکھتے ہیں:۔

"شاعر کی ذہنی تہذیب و تربیت اس ماحول میں بھی ہوتی ہے' جس میں وہ رہتا

ہے اور اس ماحول میں بھی' جو علم و فن کے اکتساب سے وہ خود اپنی شخصیت میں پیدا کرتا ہے' گویا وہ بصیرت جو اس کے مبلغ علم اور ذخیرہ معلومات سے متعین ہوتی ہے' اس کی قوت متخیلہ کو اس حصار کی مختلف سمتوں میں دوڑاتی ہے اور جس سمت سے اسے زیادہ عمدہ چیزیں ملتی ہیں' انہیں سمیٹ کو تخیل کی تشکیل کرتا ہے اور پھر لفظوں کی تلاش تفحص کرتا ہے۔"

یہاں یہ واضح رہے کہ الفاظ کا صحیح استعمال اور صحیح موقع محل پر کام میں لایا جانا' جہاں ان کے ظاہری و معنوی حسن کو دوبالا کر دیتا ہے' وہاں انسان شعور لفظوں میں یوں منعکس ہوتا ہے' جیسے سورج پانی کے ایک قطرے میں۔ ایک لفظ انسانی شعور سے یوں منسلک ہوتا ہے' جیسے ایک چھوٹی سی دنیا بڑی دنیا سے' جیسے ایک زندہ خلیہ جسم سے۔ الفاظ انسانی شعور کی ایک چھوٹی سی دنیا ہے ڈاکٹر آغا سہیل تخلیق کار اور لفظ کے باہمی رشتے کو خصوصی اہمیت دیتے ہیں ان کا کہنا ہے:۔

تخلیق کار اور لفظوں کے مابین جو فطری ربط قائم ہوتا ہے' وہ محض اتفاقیہ اور اچانک رونما نہیں ہو جاتا۔ بلکہ دونوں کا سنجوگ اپنے اپنے مذاق اور مزاج کے لحاظ سے رفتہ رفتہ قائم ہوتا ہے۔"

اور اس سنجوگ میں آغا سہیل تخلیق کار کے نقطہ نظر اور مبلغ علم کو کلیدی اہمیت کا حامل قرار دیتے ہیں' گویا تخلیق و تنقید دونوں کے لئے لکھنے والے کا زندگی کے بارے میں تصور یا نظریہ اور اس کی علمی استطاعت اساس کی حیثیت رکھتی ہے' لیکن تصور زندگی کے بارے میں واجب ہے کہ یہ اجتماعی فلاح مساوات اور خیر کے جذبات پر استوار ہو۔ ڈاکٹر آغا سہیل کی تحریریں ہمیں یہ علمی معیار فراہم کرتی ہیں۔

سفرنامه

٭ سفرنامہ

افق تابہ افق

جیلانی کامران

آغا سہیل کا سفرنامہ ۔ افق تابہ افق

ڈاکٹر انیس ناگی

آغا سہیل کے دو سفرنامے

جعفر علی

افق تا بہ افق

پروفیسر جیلانی کامران

سفرنامہ بڑی تیزی سے ہمارے ادب کی ایک نئی صنف بن گیا ہے اور یہ ہاتھوں ہاتھ بکنے والی ایک چیز بن گیا ہے۔ شاید اس کی وجہ وہ خواہش اور مہم جوئی ہے جو انسان کو دوسرے ممالک کے دوسرے کلچر کے لوگوں سے ملنے پر مجبور کرتی ہے جس کے لئے وہ سفر اختیار کرتا ہے۔ اور جو قارئین سے اپنے تاثرات مربوط کرتا ہے۔ لیکن کلی طور پر سفرنامہ دراصل سفرنگار کے نظریات ہوتے ہیں۔ جو وہ دوسرے ممالک خصوصاً امریکہ اور انگلستان کی سیر کے دوران حاصل کرتا ہے جسے انگریزی فلموں کے ذریعے بڑی آسانی سے دیکھا جا سکتا ہے۔ عام طور پر سفرنامہ نگار ان ممالک کے حسین و جمیل علاقوں اور دلکش مناظر ہی کو بیان کرتے ہیں۔ ان کے پاس اتنا وقت نہیں کہ وہ ضمیر پر زور ڈال کر کچھ سوالات اٹھائیں اور سوچیں۔ چند سفرناموں میں ادیبوں نے کچھ سوالات اٹھائے ہیں۔ لیکن یہ سوالات بہت ہی سطحی قسم کے ہیں۔ جانے کیا وجوہات ہیں کہ اتنی ترقی یافتہ اقوام کی اخلاقی قدریں اتنی پست ہیں؟ اور کیوں ان کے رہن سہن کا معیار اتنا بلند ہے۔ شاید یہی مغربی کلچر کی وہ باتیں ہیں جس نے پہلے تو ادیبوں کو خوف میں مبتلا کیا۔ اور بعد میں ان کو اپنی طرف راغب کیا۔ ۱۹۵۶ء میں جب ایڈنبرا میں تھا تو ایک ممبر پارلیمنٹ نے بڑی بے تکلفی سے ایک میٹنگ میں بتایا کہ ہم ایشیائی لوگ سطحی کلچر کو سمجھنے میں بری طرح ناکام ہو چکے ہیں۔

ڈاکٹر آغا سہیل کا سفرنامہ "افق تا بہ افق" دوسرے سفرناموں سے بہت مختلف ہے۔ انہوں نے انگلستان کو ایک سکالر کی نظر سے دیکھا ہے۔ جو اس ارادے اور سوچ بوجھ سے اس عظیم ملک کو دیکھنا چاہتا ہے۔ جس نے دنیا کے نقشے کو دو صدیوں تک بدل کر رکھ دیا ہے۔ لیکن بد قسمتی سے بہت سے دوسرے سفرنامہ نگاروں کی طرح وہ بھی سرسید کے دنوں کا انگلستان نہیں دیکھ پائے۔ ایک عام انگریز جسے انہوں نے اپنے قیام کے دوران دیکھا یا تو ہمارے جیسا بہت اچھا یا بہت برا تھا اور اس میں کوئی عظمت یا اچھائی نہ تھی۔ لیکن یہ شاید

عقلمندی کا تقاضا نہیں کہ ہم ادبی خوابوں کے انگلستان کو ریلوے سٹیشن کے پلیٹ فارموں یا پکیڈلی سرکس (Peccadily Circus) میں آدھی رات کے بعد تلاش کریں۔ ڈاکٹر آغا سہیل نے بڑی دانشمندی سے یہ کوشش کی ہے کہ وہ انگلستان کو اس کی روایات میں تلاش کریں۔ ان کا سفرنامہ قاری کو بہت دلچسپ مقامات کی سیر کراتا ہے۔ مثلاً لندن 'لیڈز' 'بوتھ' 'اسٹیڈٹ اپ آن اے ون' 'نیو کاسل اپ آن ٹین' 'ڈرہام' 'برمنگھم' اور برڈ فورڈ اس میں وڈزورتھ کالا کرماؤتھ اور لیک لینڈ بھی شامل ہیں۔ ڈاکٹر صاحب انگلستان کے لینڈ اسکیپ (حسین و جمیل۔ دلکش قدرتی مقامات و نظارے) شہروں کی منصوبہ بندی انگریزوں کی اچھی روایات سے بہت متاثر نظر آتے ہیں۔ انگلستان ایک وسیع و عریض باغ کی مانند ہے۔ جو ہر اقسام کے پھولوں۔ بوٹوں جھاڑیوں اور درختوں سے بھرا پڑا ہے۔ یہ قدرت اور انگریز کا جمالیاتی ذوق ہے۔ جس نے انگلستان کو نئے آنے والوں کے لئے ایک شاندار ضیافت کی مانند بنا دیا ہے۔ آغا سہیل نے انگلستان کے قدرتی مناظر کو حیرت کی نظر سے دیکھا ہے اور اس کی تعریف کی ہے جس کی شاندار اور عظیم الشان یادیں انگلستان کے مختلف علاقوں اور شہروں میں محفوظ کرلی گئی ہیں۔

ایک پردیسی کے لئے انگلستان کیا ہے؟ وہ محض ایک ملک ہونے کے علاوہ بھی کچھ ہے۔ اور آغا سہیل جیسی ادبی شخصیت کے لئے اس کی حقیقت وہی علامت ہے جو شیلی (Shelley) کے لئے انیسویں صدی کا روم یا ملٹن (Milton) کے لئے سترویں صدی کا انگلستان تھا۔ حقیقت میں آغا سہیل کے سفرنامہ میں ہمیں یادوں کے دو بہاؤ بیک وقت نظر آتے ہیں۔ انہوں نے انگلستان کو ایک تو اپنی یادوں کے آئینے میں دیکھا ہے۔ دوسرے غیر معمولی ذہانت رکھنے والے عظیم انگریز ادبی شخصیات کی یادوں کے ذریعے مثلاً (Shakespeare) ورڈز ورتھ (Words Worth) برونٹے سسٹرز (Bronte sisters) وغیرہ اپنے اس سفر کے دوران وہ اس منظر قدرت کی خوشبو کو اچھی طرح ہر اس جگہ جہاں وہ گئے سونگھ رہے تھے۔ اور محسوس کر رہے تھے ڈرہام کیتھیڈرل (Durham Cathedral) نے ان کو نارمن (Normans) کے دنوں کی یاد دلائی ہے۔

دریائے ٹین (Tyne) کی سرنگ نے ان کو موجودہ انگلستان سے آشنا کیا۔ میڈم تو ساد (Madam Tausad's Wan Work) کے موی عجائب گھر میں وہ عظیم شخصیات کے مجسموں سے بالکل متاثر نہیں ہوئے۔ بلکہ حقیقی زندگی کے ان مناظر سے متاثر ہوئے۔ جن میں لوگ ظالم سماج کے ہاتھوں مصیبت یا تکلیف میں مبتلا تھے

لیکن یہی صرف ساری حقیقت نہیں جو شاید آغا سہیل پڑھنے والوں تک پہنچانا چاہتے ہیں۔ انگلستان کے قیام میں ادیب پر تفریح اور آرام کا اثر نظر آتا ہے۔ خاص کر جو وقت انہوں نے لیڈز میں اپنی بیٹی مسرت کے پاس اور نیوکاسل میں وہ اپنے دوست غلام قادر آزاد کے ساتھ گزارا اس دوران وہ اپنے تحت شعور کی یادوں کا سفر بھی اختیار کرتے رہے۔ جب وہ حسین و جمیل اور قابل دید انگلستانی علاقوں کی سیر کر رہے تھے انہوں نے لکھنؤ کو نہیں بھلایا جب علامہ اقبال روم میں تھے۔ تو ان کو دہلی کی یاد آتی تھی۔ آغا سہیل ہمیں بتاتے ہیں کہ بریڈ فورڈ سے راوی بھی چھپتا ہے۔ اس کے ایڈیٹر مقبول الہی شیخ ہیں۔ یہ بڑی باقاعدگی سے شائع ہوتا ہے یہ گورنمنٹ کالج کے لئے خوشی کی بات ہے کہ ان کے رسالے کا ایک جڑواں بھائی سمندر پار بھی ہے۔ شاید مقبول الہی شیخ گورنمنٹ کالج کے پڑھے ہوئے ہیں ورنہ وہ اس رسالے کا اتنا اہم نام نہ رکھتے۔

اس کے باوجود "افق تا بہ افق" ایک بہت ہی دلچسپ اور دلفریب سفری بیان ہے۔ سفرنامہ میں دکھی انداز میں ہم وطن خاندانوں کی تہذیبی اور تمدنی حالت زار بیان کی گئی ہے۔ پاکستان کی نوجوان نسل کو وہاں کے ماحول نے اپنے اندر جذب کر لیا ہے اور یہ بہت سے والدین کے لئے پریشانی کا باعث ہے۔

آغا سہیل نے یہ نقطہ نظر بیان کیا ہے کہ کچھ پاکستانی گھرانوں میں اگرچہ لڑکوں اور لڑکیوں کی محتاط پرورش کی جاتی ہے اور ان کے نتائج بھی قابل ستائش ہیں تاہم ان کی پاکستان سے محبت اور لگن غیر معمولی ہے اگرچہ اس بات کا کچھ پتہ نہیں کہ جب وہ مادر وطن پاکستان آئیں گے تو وہ کن حالات کا شکار ہوں گے۔ آغا سہیل نے انہی خدشات کا اظہار اپنے سفرنامے میں کیا ہے۔

مصنف کو ملک کے کچھ تلخ تجربات

جن سے طبیعت مکدر ہوتی ہے جن کا تعلق عرب قوم کا پاکستانی بھائیوں سے برتاؤ ہے۔ شاید خلیج کے عرب اور دوسرے علاقوں کے لوگ پاکستانیوں کے بارے میں نسلی تعصب کا شکار ہیں۔ آغا سہیل نے بڑے افسوس کے ساتھ ایک مختصر واقعہ بیان کیا ہے۔ جب ہوائی سفر کے دوران ایک چھوٹی بچی نے اپنی معصومیت میں ان سے بات کرنا چاہی تو اس کے والد نے اس کو انتہائی سختی سے منع کیا اور سرگوشی میں لفظ "مسکین" کہا تو بچی نے فوراً اپنا رویہ تبدیل کر لیا۔ ایک اوسط عرب یہ بھول گیا کہ غرور کرنا ایک گناہ کبیرہ ہے اور اس سے صحرائی زمین میں مستقبل کا تحفظ بمشکل ہی مل سکے گا۔ آغا سہیل کی آنکھوں میں آنسو تھے جب انہوں نے اپنے عرب بھائیوں کے نامہربان رویے کی جانب اشارہ کیا۔ انہوں نے یہ سوال بھی کیا کہ ہم کسی نشاۃ ثانیہ کی امید رکھ سکتے ہیں؟ جب غرور نے قوموں کو تقسیم کیا ہوا ہے؟ آخری خطبہ رسول ﷺ کا کیا ہوا؟ کیا وہ ان عظیم اصولوں کو فراموش کر بیٹھے ہیں جس سے دنیا کی افق پر ایک نئی تہذیب نمودار ہوئی؟ پھر آغا سہیل نے ترکوں کی ستائش کی کہ وہ عظیم لوگ ہیں جنہوں نے ماضی میں اسلام کی عظیم معراج حاصل کی۔ ترک لوگ بہت مہمان نواز' مخلص' اور محبت کرنے والے ہیں۔

آغا سہیل کے اس سفرنامے کی اپنی ہی ایک منفرد قدر و قیمت ہے جو اسے دوسرے سفرناموں سے بہت مختلف و ممتاز بناتی ہے۔ یہ سفرنامہ منتشر واقعات کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ مصنف نے اپنے تعلق سے انگلستان کے پس منظر میں 'تہذیب و تمدن کی روح کو دریافت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس سفرنامے کا اختتام انتہائی خوشگوار ذائقے کا احساس دلاتا ہے جس میں مصنف نے انگلستان میں اپنے پہلے تعلق کی خوشگوار یادداشتیں بیان کی ہیں۔ اس میں تیسری دنیا کے لوگوں کے بارے میں تاریخی و جغرافیائی نظریہ بھی شامل ہے۔ یہ ایک اچھی اور مہربان دنیا ہے جو آغا سہیل کے سفرنامے کے صفحات پر ابھرتی ہے جس میں انگلستان اپنے تاریخی اور موجودہ حالات و واقعات سے جگمگاتا ہے۔ ورڈز ورتھ (Wordsworth) کو انگلستان سے لوسی کی خاطر محبت تھی اور شاید آغا سہیل کو بھی انگلستان سے اپنی زیر تعلیم بیٹی مسرت کی وجہ سے محبت ہے۔

(محسن سہیل)

ڈاکٹر آغا سہیل کا سفرنامہ ۔۔ افق تابہ افق

ڈاکٹر انیس ناگی

الیکٹرانک میڈیا نے ادبی سفرناموں کو ان کے طلسماتی اور صحافتی جادو سے محروم کر دیا ہے۔ کیونکہ اب سب کچھ جغرافیائی طور پر ٹی وی سکرین پر دکھا دیا جاتا ہے۔ سحر انگیز نظارے 'کلچر' لوگوں کے رہن سہن وغیرہ۔ انسان کے اندر جو ایک نہ ختم ہونے والا تجسس ہے وہ اس کو ناقابل تسخیر اور طاقت ور ایمازون (Amazon) کے جنگلوں اور منجمد انٹارکٹکا تک لے گیا ہے۔ یہ سب کچھ جذبات کی بغیر مبالغہ آرائی اور کم بیانی سے دیکھا جا سکتا ہے۔ ایک شخص انسانی آنکھ اور کیمرے کے لینز میں صاف فرق محسوس کر سکتا ہے۔ اس کے باوجود ادیب اور سفر کرنے والے اپنے نظریات کے تحت اپنے نظریات اس دیس کے بارے میں لوگوں کے بارے میں اور خوبصورت اور حسین و جمیل علاقوں کے بارے میں بیان کرتے رہتے ہیں' جن لوگوں میں اور جن دلوں میں وہ آتے جاتے ہیں۔

اردو زبان کا پہلا سفرنامہ مغربی دنیا کے بارے میں یوسف کمبل پوش نے انیسویں صدی میں لکھا تھا۔ اس کے بعد اردو ادب میں ہر قسم کے سفرناموں کی بہتات ہو گئی۔ مزاح نگار شفیق الرحمان نے اپنے مشہور سفرنامے "برساتی" میں ایک نیا انداز بیان پیش کیا۔ جس نے سفرنامے کو محض رپورٹ یا واقعہ نگاری کے طور پر ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا ہے۔ عطاء الحق قاسمی نے سفرنامے کو یہاں سے ہی آگے بڑھایا اور اپنے سفرنامے " شوق آوارگی" میں مزاح کو مشاہدے کے ساتھ مغربی دنیا کو دیکھا۔

ڈاکٹر آغا سہیل کا سفرنامہ "افق تابہ افق" حال ہی میں شائع ہوا' ڈاکٹر آغا سہیل کو درویش کہا جا سکتا ہے جو پر فضا اور گھنے درختوں کے پیچھے چھپے ایف سی کالج کے گھر میں گھرے اپنے طالبعلموں کے درمیان علم و راہنمائی کا مینارہ نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب شاذو نادری سوائے اہم ادبی محفلوں کی کبھی نظر آتے ہیں۔

پچھلی تین دہائیوں سے ڈاکٹر آغا سہیل افسانہ اور تنقید لکھ رہے ہیں۔ انہوں نے ۱۹۶۵ء میں سرور سلطانی' مرتب کر کے ادب میں قدم رکھا۔ اس کے بعد ان کا ناول "

غبار کوچہ جاناں" فیروز سنز نے ۱۹۶۶ء میں چھاپا بعد میں افسانوں کا مجموعہ "بدلتا ہے رنگ آسماں" چھپا۔ تقریباً ایک دہائی کے بعد افسانوں کے دو مجموعے "شہر نا پرساں" اور "قل برابر آسماں" چھپے۔ نثر کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر آغا سہیل تنقیدی مضامین بھی لکھتے رہے اور ۱۹۷۳ء میں تنقیدی مضامین کا مجموعہ "معارف سہیل" کے عنوان سے چھپا۔ ۱۹۸۹ء میں اردو کے کلاسیکی ادب کے مطالعہ پر ان کی ایک اہم کتاب "دبستان لکھنؤ کے داستانی ادب کا ارتقاء" چھپی۔

ڈاکٹر آغا سہیل کے سفرنامے "افق تا بہ افق" کو تیسری دنیا کے پس منظر میں پڑھنا چاہیئے۔ ڈاکٹر آغا سہیل کے سفرنامے ہمہ جہت نہیں بلکہ بہت سی معلومات فراہم کرتے ہیں۔ نہ صرف حسین و جمیل قدرتی نظارے لیڈز یا برمنگھم کے بلکہ تیسری دنیا کے ملک سے آنے والے ایک سیاح کے نفسیاتی رد عمل کو جو ایک بڑی منظم سوسائٹی کو بہت حیرت اور خوف سے دیکھتا ہے۔ بے مثال معاشی ترقی اور جدید ٹیکنالوجی ڈاکٹر آغا سہیل کو انگلستان اور اپنے ملک کی زندگی کا موازنہ کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ ان ۳۲۰ صفحات پر مشتمل سفرنامے میں بارہ ابواب ہیں۔ جو ڈاکٹر آغا سہیل کے سفر انگلستان کو بیان کرتے ہیں۔ انگلستان کی زندگی کے مطابق تفصیلات دور سے دیکھنے میں دلچسپ معلوم نہیں ہوتیں کیونکہ ڈاکٹر آغا سہیل نے شاید وطن کی یاد کی وجہ سے اپنے ہم وطنوں سے ملنے کو گوروں پر فوقیت دی۔ مغربی استعماریت اور باہر بسے ہوئے اپنے ملک سے گئے ہوئے جاہل لوگ اسی سفرنامے میں ڈاکٹر آغا سہیل کی سخت تنقید کا نشانہ بنتے نظر آتے ہیں۔

وہ عربوں کی غیر شائستہ حرکتوں کی وجہ سے ان کو ناپسند کرتے ہیں اور اس کا اظہار برملا کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ اپنا مذاق اڑانا نہیں چاہتے۔ انگریزوں کی زندگی کے بارے میں بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر آغا سہیل کافی قدامت پسند نظر آتے ہیں۔

ڈاکٹر آغا سہیل بہت رواں نثر لکھتے ہیں۔ جو اکثر اوقات ان کا اپنا ایک خاص نثر کا انداز بن جاتا ہے۔ غیر ضروری تفصیلات اور روز مرہ کے واقعات اکثر اوقات اس سفر نامے کو بوجھل بنا دیتے ہیں۔

(اردو ترجمہ۔ محسن سہیل)

آغا سہیل کے دو سفرنامے --- ایک جائزہ

جعفر علی

انسانی زندگی کی پہچان حرکت و عمل سے وابستہ ہے۔ نئی چیزوں کو پرکھنے اور نت نئے تجربات کرنے کی امنگ انسان مزاج میں روز اول ہی سے شامل ہے' بلکہ تجسس کے اسی ذوق و شوق نے اسے جنت سے اس کرہ ارض پر منتقل کر دیا اور اس زمین پر ایک نئے باب کا آغاز ہوا۔ فطری لحاظ سے تو دنیا کا ہر انسان تنوع پسند اور مسافر ہے' لیکن جب معاشرہ کسی مخصوص تہذیبی دائرے تک محدود ہو کر رہ جاتا ہے تو ہر شخص گھٹن محسوس کرتا ہے اور کسی دوسری جگہ منتقل ہونے کی خواہش اس کے اندر کروٹ لیتی ہے۔ یہ انسانی کمزوری بھی ہے کہ وہ حال سے ہمیشہ غیر مطمئن رہا ہے۔ ان دیکھی چیزوں کو دیکھنا پسند کرتا ہے گویا وہ سفر کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اسی سفر کے دوران جلوہ گر ہونے والے تجربات و جذبات و مشاہدات اور احساسات کو وہ دوسروں تک منتقل کرنا چاہتا ہے۔ انتقال کی اس کوشش نے سفر نامہ کو جنم دیا۔ سفر نامہ کیا ہے؟ سفر نامہ وہ واحد بیانیہ صنف سخن ہے' جو انسانی علمیت میں اضافہ کرتا ہے۔ مبالغہ و تخیل کے بجائے چیزوں کے حقیقی روپ آشکار کرتا ہے۔ سفر نامہ نگار اپنی زبان کی رنگین تو کر سکتا ہے اور وہاں کے لوگوں کے بارے رائے زنی تو کر سکتا ہے۔ لیکن حقیقت نگاری کا دامن نہیں چھوڑ سکتا۔ سفرنامے کے بارے میں مختلف لوگوں نے اظہار خیال کیا ہے:۔

ہیلین ای ہینز (Helen_e_Hains) اپنی کتاب (Living with Books) میں سیاحت (TRAVELLS) کے باب میں لکھا ہے:۔

"سفرناموں کا خیال آتے ہی ان واقعات اور سفری کہانیوں کا خیال آتا ہے' جنہیں ہم آج تک مہماتی کہانیاں سمجھتے آئے ہیں۔"

مولانا شبلی نعمانی نے "سفرنامہ روم و مصر و شام" کے ابتدائیہ میں ملکی انتظامیہ کا طریقہ کار' عدالت و تجارت کے اصول اور عمارتوں کے نقشہ جات وغیرہ کو سفرنامے کے

لئے ضروری قرار دیا ہے۔ حتیٰ کہ انھوں نے سفرنامے کو تاریخی سلسلے کا ایک دلچسپ حصہ قرار دیا ہے... لکھتے ہیں:۔

"ترکی کے بارے میں یورپ کی تاریخی تصنیفات کا سرمایہ بہت کچھ انہی سفر ناموں سے لیا گیا ہے۔"

ڈاکٹر انور سدید سفرنامے کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:۔

"فنی طور پر سفرنامہ وہ بیانیہ ہے جو ایک سیاح دوران سفر یا اختتام سفر پر اپنے مشاہدات' کیفیات اور اکثر اوقات قلبی واردات سے مرتب کرتا ہے۔ اس صنف ادب کا تمام مواد منظر کے گردوپیش کی صورت میں خارج میں بکھرا ہوا ہوتا ہے۔ لیکن سفرنامہ نگار صرف خارجی ماحول کا ہی مشاہدہ نہیں کرتا بلکہ بیانیہ کو ہمہ جہت' بامعنی' مدلل اور دستاویزی بنانے کے لئے بہت سی دوسری جزئیات کو بھی سمیٹتا چلا جاتا ہے۔"

سفرنامہ کی ایک تعریف یہ بھی کی جاتی ہے کہ:۔

"سفرنامہ انسانی زندگی کے ذہنی ارتقاء کا نام ہے جہاں لکھنے والا جزو تماشا ہو کر تہذیب و تمدن کو اس طرح مرتب کرے کہ زندگی پوری طرح منعکس ہو۔"

سفرنامہ کم و بیش ہر زبان میں لکھا جاتا رہا ہے اور اکثر و بیشتر لوگوں کی دلچسپی کا موضوع رہا ہے۔ اس کی ابتداء کے بارے میں حتمی رائے دینا مشکل کام ہے۔ واسکوڈے گاما پہلا آدمی تھا جس نے پرتگال سے ہندوستان کا تیرہ چودہ سو میل کا سفر پیدل طے کیا' لیکن سفرنامے کے حوالے سے مارکوپولو کا سفرنامہ دنیا کا عظیم ترین سفرنامہ ہے۔ جس میں چین کی تہذیب و تمدن کے اہم نقوش ملتے ہیں۔ مارکوپولو کا بنیادی وصف یہ ہے کہ وہ قاری کو ساتھ لے کر چلتا ہے۔

فارسی میں ابن بطوطہ کا سفرنامہ خاص اہمیت کا حامل ہے۔ اس میں سندھ یونیورسٹی' علمی کتب خانے' موہنجوداڑو کی تہذیب اور شہروں کے بارے معلومات ملتی ہیں۔

پنجابی ادب میں لال سنگھ کملا اکالی کا "میرا ولایتی سفرنامہ" ۱۹۳۳ء میں چھپا'

جب کہ پنجابی میں زیادہ تر سفرنامے منظوم شکل میں ملتے ہیں۔ "گلزار مکہ" اور "گلزار مدینہ" بھی منظوم سفرنامے ہیں۔

اردو کے سفرناموں میں یوسف حسین کمبل پوش کے عجائبات فرنگ کو اولیت حاصل ہے۔ یہ سفرنامہ پہلی بار ۱۸۶۲ء میں شائع ہوا۔ مولانا مسیح الدین نے "سفر اودھ" لکھ کر اس صنف میں اضافہ تو کیا' لیکن فنی لحاظ سے یہ سفرنامہ اچھا نہیں ہے۔ سرسید احمد خان کے سفرنامے "مسافران لندن" میں جغرافیائی اور تاریخی پس منظر بیان کرنے کے ساتھ ساتھ وہاں کی تہذیب و ثقافت رہن سہن' کھانے پینے کے آداب اور لباس وغیرہ کی تفصیلات موجود ہیں۔ بیسویں صدی کے آغاز میں مولانا شبلی کا سفرنامہ "سفرنامہ روم و مصر و شام" کے نام سے چھپا۔ ۱۹۲۰ء میں سر عبدالقادر نے "مقام خلافت" لکھا جس میں استنبول کے سفر کے حالات اور ذاتی جذبہ و احساسات کی خوبصورت عکاسی کی ہے۔ قیام پاکستان کے بعد اہم اور چونکا دینے والا سفرنامہ محمود نظامی کا "نظرنامہ" ہے' جسے پہلا باقاعدہ سفرنامہ کہا جاسکتا ہے۔ محمود نظامی صرف جغرافیائی اور تاریخی اعداد و شمار بتانے کے بجائے اپنے احساسات و تاثرات بھی قاری تک پہنچاتے ہیں۔ ۱۹۵۰ء کے بعد سفرنامہ لکھنے کے رجحان میں نمایاں اضافہ ہوا۔ اختر ریاض الدین کے دو سفرنامے "سات سمندر پار" اور "دھنک پر قدم" بہت مقبول ہوئے۔ مستنصر حسین تارڑ نے سفرنامہ ہی کی بدولت شہرت حاصل کی۔ ان کے سفرنامے "اندلس میں اجنبی" "خانہ بدوش" اور "نکلے تیری تلاش میں" وغیرہ تخلیقی شان رکھتے ہیں۔ ابن انشاء نے "چلتے ہو تو چین کو چلیے" لکھ کر پہلی مرتبہ سفرناموں میں شگفتگی کا عنصر شامل کیا۔ اسی طرح عطاء الحق قاسمی نے بھی امریکہ اور بھارت کی سیر کا حال سفرناموں کی صورت میں لکھا۔ دور حاضر میں بے شمار سفرنامہ نگار موجود ہیں' جو اپنے اپنے انداز میں سفرنامے لکھ رہے ہیں۔ ان میں ایک اہم نام آغا سہیل کا ہے۔ آغا سہیل کی اصل پہچان افسانہ نگاری اور تنقید کے حوالے سے ہے' لیکن گزشتہ چند برسوں میں انہوں نے سفرنامے بھی لکھے ہیں۔ جن میں سے "افق تا بہ افق" سفرنامہ انگلستان چھپ چکا ہے' جب کہ "ایران میں چودہ روز" سفرنامہ ایران زیر طبع ہے۔

آغا سہیل ہمہ پہلو شخصیت کے مالک ہیں۔ افسانہ نگار اور نقاد کی حیثیت سے وہ برصغیر کے علمی و ادبی حلقوں میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ ان کے افسانوں کے مجموعے "بدلتا ہے رنگ آسماں" (۱۹۷۵ء) "شہرنا پرساں" (۱۹۷۷ء)' "تل برابر آسمان" (۱۹۸۰ء)' اور "اگن کنڈلی" (۱۹۹۶ء) چھپ چکے ہیں' جب کہ ایک مجموعہ "بوند بوند پانی" زیر طبع ہے۔ آغا سہیل نے افسانہ نگاری کی دنیا میں زندگی اور فن کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے ایک اچھے اور پختہ کار افسانہ نویس کے طور پر پذیرائی حاصل کی ہے۔ ان کے افسانوں کا بنیادی موضوع سکڑتا ہوا انسان' سماج اور سماجی کارکن کی سرگرمیاں ہیں۔ ان کا نظریہ زندگی اور سیاسی خیالات تمام کرداروں میں برابر طور پر بٹے ہوئے ہیں۔ "بدلتا ہے رنگ آسماں" ۲۳ افسانوں پر مشتمل ہے' جن میں روایتی افسانوں کے ساتھ ساتھ اودھ کی تہذیب کی عکاسی کرنے والے افسانے بھی موجود ہیں۔ اس مجموعے کا ٹائٹل افسانہ جاگیردارانہ نظام پر گہرا طنز ہے۔ جن میں ترقی پسندی کا ولولہ اور تصور قومیت کے ساتھ وابستگی کے عناصر اپنی تمام تر معنویت کے ساتھ موجود ہیں اور انھیں اردو کے معتبر افسانہ نگاروں کی صف میں کھڑا کرتے ہیں۔ "شہرنا پرساں" بھی ۲۳ افسانوں پر مشتمل مجموعہ ہے' جس میں سانحہ پاکستان کے ارتعاشات بھی واضح ہیں۔ ان افسانوں میں حقیقت نگاری کی روایت کے ساتھ ساتھ جدید تر افسانوی اسلوب بھی دکھائی دیتا ہے۔ اب ان کا مزاج لکھنؤ کے بجائے لاہور سے ہم آہنگ ہو چکا ہے۔ نئی سرزمین میں پوری توانائی کے ساتھ ان کے قدم جم چکے ہیں۔ اب وہ زندگی کی تفہیم چاہتے ہیں' لہٰذا مقصدیت کا عنصر غالب ہے۔ کہیں کہیں ملکی صورت حال پر بھی طنز ہے۔ "تل برابر آسمان" ایک کامیاب افسانوی مجموعہ ہے۔ اس میں موجودہ دور کی بے چہرگی کی مرقع نگاری بڑی کامیابی کے ساتھ کی گئی ہے۔ داستانی لب ولہجہ ہونے کے باعث کہانی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔ گویا آغا سہیل اس وقت ان گنے چنے افسانہ نگاروں میں سے ہیں' جن کے نظریاتی اور فنی سفر میں بتدریج استقامت اور پختگی آ رہی ہے اور وہ اپنے سفر میں نئی منزلوں کی طرف بڑھ رہے ہیں۔

آغا سہیل معتدل مزاج افسانہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ بالغ نظر نقاد بھی ہیں۔

ان کے تنقیدی مقالات کے مجموعے "معارف سہیل" اور "ادب اور عصری حسیت" کے نام سے طبع ہو چکے ہیں۔ وہ طالب علمی کے دور میں ہی انجمن ترقی پسند مصنفین کی گرما گرم تنقیدی بحثوں میں حصہ لیتے تھے۔ تنقیدی مضامین اور افسانے سناتے تھے۔ حتیٰ کہ جب ڈاکٹریٹ کر لی تب بھی انھوں نے یہ سلسلہ جاری رکھا۔ ابتداء میں تو ان کا لہجہ سخت تھا مگر دھیرے دھیرے اعتدال پر آتا گیا اور یوں اب وہ اپنی تنقید میں ایک معتدل نقاد کا لب و لہجہ اختیار کئے ہوئے ہیں۔

"افق تا بہ افق" آغا سہیل کا پہلا سفرنامہ ہے۔ اس سفرنامے کے بارے وہ پیش لفظ میں لکھتے ہیں:۔

"یہ ایک ایسا بے تکلف سفرنامہ ہے' جس میں جو جو باتیں جس جس طرح پیش آئیں' ان کو اسی طرح سادگی سے سپرد قلم کر دیا گیا ہے۔ مجھے یہ بھی احساس ہے کہ اس سفرنامے کے قارئین کا حلقہ ذرا مختلف ہو گا اور چونکہ ان کے خون کی گردش میں اس سفرنامے سے کوئی سرعت اور تیزی پیدا نہ ہو گی۔ نہ گرمی اور نہ جوش و ولولہ اس لئے اس کی مقبولیت کا دائرہ انہی لوگوں تک محدود رہے گا' جو ہر شے کے مشاہدے کے بعد اس کے بارے میں غور و فکر سے بھی کام لیتے ہیں۔" اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ سفرنامہ آغا سہیل اور قارئین کی توقعات پر کہاں تک پورا اترتا ہے۔ وہ کون سا تفکر کا عنصر ہے' جو اس میں موجود ہے۔ گویا اس کے لئے ضروری ہے کہ جب وہ گھر سے نکلتا ہے' نئی شخصیات اور نئے تجربات سے دو چار ہوتا ہے تو ان ذاتی تجربات کو وہ ایک خاص اسلوب میں بیان کر کے قاری کو بھی اپنے اپنے سفر میں شامل کر لیتا ہے۔ آج کے سائنسی دور میں فاصلے سمٹ گئے ہیں قربتیں بڑھ گئی ہیں' وہ سفر جو پہلے بڑی صعوبتیں برداشت کر کے سالوں میں طے ہوتا تھا۔ اب وہی سفر چند گھنٹوں میں طے ہو جاتا ہے۔ انسان ایک دوسرے کے اس قدر قریب ہو گیا ہے کہ دل کی دھڑکنیں تک سنی جا سکتی ہیں۔ یہ صورت حال سفرنامے کے لئے نقصان دہ

ثابت ہوئی اور اس کے معیار پر بھی اثر انداز ہوئی۔ زمانہ قدیم کے سفرناموں کی مقبولیت کا راز یہی ہے کہ سفرنامہ نگار کو بہت سی صعوبتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ جب تک انسان مشاہدات و تجربات سے نہ گزرے' اس کی شخصیت پختہ اور سنجیدہ نہیں ہوتی۔ ورجل نے ایک جگہ لکھا ہے کہ:۔

"میں اپنے شعراور مصرعوں کو اس طرح چاٹتا ہوں' جس طرح ریچھنی اپنے بچوں کو چاٹتی ہے۔"

لیکن ورجل نے مرتے وقت وصیت کی تھی کہ موت کے وقت انہیں میرے ساتھ دفن کر دیا جائے' حالانکہ یہ اشعار اس کی چودہ سالہ محنت کا ورثہ تھے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ تمام تجربات کے بعد ہی شخصیت اور اسلوب کی تشکیل ہوتی ہے۔ آغا سہیل نے دوران سفر بہت سے تجربات کئے۔ انہوں نے جس چیز کا مشاہدہ کیا' اس کی گہرائیوں تک اسے پرکھنے کی کوشش کی اور انہوں نے اپنے سفرنامے کو پیدل چلنے والے شخص کے سفرنامے کے قریب تر لانے کی کوشش کی۔ وہ لکھتے ہیں کہ:۔

"لندن کی سڑکیں اور عمارتیں نئی بھی ہیں اور پرانی بھی۔ عمارتیں باہر سے کچھ پرکشش بھی ہیں اور سادہ بھی اور مکانات بھی سادہ ہیں۔ لیکن بعض پر کہنگی اور خستگی طاری ہے۔ ٹریفک میں نظم و ضبط کے قوانین کا یکساں احترام ہے۔ سڑکوں پر صفائی ستھرائی موجود ہے اور کوڑا کرکٹ نظر نہیں آتا۔"

فن کار اپنے فن پارے کو زندہ جاوید بنانے کے لئے تصویر کشی یا مرقع نگاری کے فن کو بھی استعمال کرتا ہے۔ مرقع میں تمام نقش و نگار تصویر کی صورت میں نظر آتے ہیں۔ حتیٰ کہ گھاس کا ہلکا سا تنکا بھی واضح ہو جاتا ہے۔ میتھیو آرنلڈ نے اسے حسن کلام کہا ہے۔ شاعری میں مرقع نگاری کے میدان میں ولی دکنی نے خوب طبع آزمائی کی ہے۔ میر تقی میر کے مکان کا بیان اور اس کے گھر کا مرقع ان کی مثنوی "خواب و خیال" میں واضح ہے۔ مثنوی "سحرالبیان" میں باغ کا نقشہ' محل کا نقشہ اور دیگر درخشاں مرقع نگاری کی مثالیں موجود ہیں۔ اسی طرح میر انیس کے مرثیوں میں مرقع نگاری کی بہت سی مثالیں موجود ہیں'

لیکن درج بالا تمام مثالیں شاعری کے حوالے سے ہیں۔ گو شاعری میں کم الفاظ کے استعمال سے تصویر واضح کی جاتی ہے' لیکن آغا سہیل بنیادی طور پر نثر نگار ہیں نہ کہ شاعر۔ ان کا بنیادی وصف یہ ہے کہ وہ اپنی نثری تخلیق میں بھی کم الفاظ کا استعمال کرتے ہیں۔ موزوں الفاظ کے استعمال سے وہ بخوبی واقف ہیں۔ انہوں نے جزئیات نگاری کو مرقع نگاری میں شامل کر کے اسے ایک اچھوتا رنگ دیا ہے۔ وہ دو تین جملوں میں ایسی بات کہہ جاتے ہیں کہ کوئی منظر یا کردار جیتا جاگتا اور ہنستا ہوتا نظر آ جاتا ہے۔ درج ذیل مثال کو پڑھنے کے دوران یوں محسوس ہوتا ہے کہ جہاز میں سفر صرف آغا سہیل ہی نہیں کر رہے بلکہ ہم بھی ان کے ہمسفر ہیں:۔

"یہ جہاز ڈی سی ٹائن تھا۔ اور بھاگم بھاگ اڑا چلا جا رہا تھا' جیسے اسے ہمارے جذبات کا اندازہ تھا کہ ہمیں لندن پہنچنے کی جلدی ہے۔ کبھی بادلوں کی دھند میں جہاز ڈوب جاتا' کبھی بادلوں سے ہزاروں فٹ کی بلندی پر ہم پرواز کرنے لگتے۔ کبھی بادلوں کے رنگ بدل جاتے' اودے نیلے اور گہرے اودے یا سیاہ' کبھی سرخ اور کبھی کاہی' کبھی آسمان نظر آ جاتا۔ یہ سلسلہ جاری ہی تھا کہ کھانا آ گیا اور میں نے مینو کا جائزہ لیا تو مٹر پلاؤ قسم کی ایک چیز تھی' مرغ نہایت فربہ تھا' کچھ سلاد وغیرہ اور کچھ جوس اور دوسری بہت سی اشیاء تھیں۔ سویٹ ڈش بھی تھی نیز پنیر مکھن مارملیڈ اور بسکٹ بھی تھے۔" (افق تا بہ افق)

آغا سہیل جب کسی بکھرے ہوئے منظر کی مجموعی حالت کو بیان کرتے ہیں تو یہ ان کے فن کا کمال ہے کہ اس نظر افروز منظر کی کیفیات قاری کی آنکھوں کو خیرہ کرتی ہیں۔ ایسے مواقع پر ان کی قوت تحریر اپنی جولانی دکھاتی ہے۔ ان کے پیش نظر شہروں کی جگمگاہٹ' زندگی کی ولولہ انگیزی اور حسن فطرت کے جلوے موجود رہتے ہیں اور وہ قاری کی جھولی مسرتوں سے بھر دیتے ہیں۔

"ہمیں لندن کے مضافات سے گزرتے ہوئے بہت لطف آیا۔ جگہ جگہ باغات اور کھیت' سبزہ اور پھولوں کے تختے' چھوٹے چھوٹے پل اور صاف ستھری سڑکیں' تیز ہوتے ہوئے بھی نپی تلی رفتار سے ہم چلتے رہے' یعنی اس میں اتار چڑھاؤ نہیں کہ ڈرائیور

اپنی مرضی سے جب چاہے گاڑی تیز کر دے اور جب چاہے سست کر لے' نہ اوورٹیکنگ' نہ ٹریفک کی دھماچوکڑی۔" (افق تا بہ افق)

آغا سہیل نے مختلف شہروں کی تفصیل بیان کرتے ہوئے تاریخی پس منظر' معاشرتی حالات' مقامات و مضافات کا گہرا مطالعہ کیا اور اپنے مشاہدے کو ایک ماہر فن کی حیثیت سے بیان کیا۔ انہوں نے ان شہروں کے گلی کوچوں اور ان مقامات (جہاں تاریخی نوادرات رکھے گئے) پر ایک طالب علم کی حیثیت سے نظر ڈالی۔ ایسا طالب علم جو کچھ سیکھنا چاہتا ہو۔ پھر جو کچھ انہوں نے سیکھا اور دیکھا' اسے اپنی کتاب میں قارئین کی نذر کر دیا۔ انہوں نے مشرقی و مغربی اقوام کی سیاسی' تہذیبی اور ثقافتی زندگی کے مختلف مسائل کو جس انداز سے پیش کیا اس سے ان کا زاویہ نگاہ ہر جگہ عیاں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ تاریخی مقامات کو بیان کرتے ہیں تو یہ ایک قابل قدر تاریخی حوالہ بنتا ہے' جو ریفرنس کا کام دیتا ہے۔ آج کل ہر جگہ شیکسپیئر کا بہت چرچا ہے' آغا سہیل جب اس کے گھر کے بارے لکھتے ہیں تو قارئین اور شیکسپیئر کے مداحوں کی دلچسپی اور بھی بڑھ جاتی ہے:۔

"شیکسپیئر کے جنم گھر اور دوسرے متعلقہ مکانات اور مقامات کی کہانی اور بھی دلچسپ ہے کہ اس کی تعمیر کے اصل نشانات بھی اب باقی نہیں ہیں' مگر تعمیراتی خط و خال بتاتے ہیں کہ اس کا بڑا حصہ آخری چودھویں یا ابتدائی سولہویں صدی میں تعمیر ہوا ہوگا۔ اسٹریٹ فراڈ اپان ایوان کے دوسرے مکانوں کی طرح اس کی تعمیر کا سارا مال مسالہ مقامی رہا ہوگا۔ لکڑی قریبی جنگل آرڈن سے حاصل ہوئی اور ہلکا نیلا سفیدی مائل پتھر ولیم کوٹ گاؤں سے آیا' جہاں شیکسپیئر کی ماں نے لڑکپن کے ایام گزارے ہوں گے۔ مذکورہ عمارت کی بنیادیں نیچی دیوار کی ہیں' جس میں اوک کی لڑکی سے ڈھانچہ بنایا گیا ہے اور شہتیر اور دھنیاں بھی اوک درخت سے لی گئی ہیں۔" - "افق تا بہ افق" شیکسپیئر اگر ڈرامہ نگاری کی دنیا کے بے تاج بادشاہ ہیں تو شاعری کے میدان میں ایک خاص موضوع کے حوالے سے ورڈز ورتھ کا بھی کوئی ثانی نہیں۔ قدرتی مناظر سے اسے فطری لگاؤ تھا' اور یہی پہلو اس کی شاعری پر بھی غالب ہے۔ ورڈز ورتھ کے گھر کے احوال و آثار آغا سہیل یوں بیان کرتے

ہیں:-

"سب سے پہلے ورڈز ورتھ کے اس مکان سے مطالعے کا آغاز کیا' جہاں وہ پیدا ہوا تھا۔ جگہ جگہ گائیڈز بھی موجود تھے اور چھپا ہوا لٹریچر بھی۔ مثلاً جس کمرے کو مشیر تی کے طور پر استعمال کیا گیا۔ وہ اسی حال میں رکھنے کی کوشش کی گئی ہے' جو اس وقت رہا ہو گا' جن شخصیتوں سے ورڈز ورتھ فیملی کا قریبی تعلق تھا اور وہ کسی نہ کسی لحاظ سے اس خاندان پر اثر انداز ہوئی تھیں' ان کی تصویریں لگائی گئیں تھیں۔ فرنیچر' ملبوسات اور ظروف کو اسی ترتیب اور سلیقے سے سجایا گیا تھا' جو اس وقت کا عام مذاق تھا۔ تمام کمروں' راہداریوں اور اوپر کی منزل کے مکان کو باوقار طور پر محفوظ رکھا گیا تھا۔"

ورڈز ورتھ کے گھر کے بیان کے بعد آغا سہیل اس کی شاعری پر بھی تبصرہ کرتے ہیں' اس طرح ان کا سفرنامہ واقعاتی سفرنامے کے زمرے سے نکل کر تاثراتی سفرنامے کے ذیل میں آجاتا ہے اور یہ ان کے ادب سے گہرے لگاؤ کا ثبوت ہے کہ سفرنامہ نگار آغا سہیل کبھی کبھار سفر کے دوران نقاد آغا سہیل کے روپ میں بھی ظاہر ہوتے ہیں۔ ورڈز ورتھ کی شاعری کے بارے ان کا یہ تبصرہ حقیقت پر مبنی ہے کہ:۔

"ورڈز ورتھ تو ایک فطرت نگار شاعر تھا۔ اس کے بعض دوسرے معاصر رومانی شعراء جن کا اس وادی سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ جذبے' وجدان اور خیال کی سواریوں میں بیٹھ کر ماورائی سفر پر نکل جاتے ہیں' ان دیکھے آسمانوں اور فضاؤں کا ذکر کرتے ہیں اور اپنے قاری کو بھی انگلی پکڑ کر لے جاتے ہیں' لیکن یہ سارا ماورائی طلسم ہے۔ ورڈز ورتھ اس جنت ارضی کا ذکر کرتا ہے' ان خوبصورت وادیوں کا حسن اور ان کا تقدس ماورائی نہیں حقیقی ہے اور انہیں محسوس کرنا اس سیاح کا فرض ہے' جو یہاں پہنچتا ہے۔"

سفرنامہ نگار کے لئے غیر جانبدار ہونا اشد ضروری ہے' وگرنہ بہت سے معاملات اس کی ذاتی پسند و ناپسند کی ذیل میں آکر وجہ نزاع بن جاتے ہیں' چنانچہ آغا سہیل نے اس امر کو ملحوظ رکھا ہے اور "افق تا افق" میں اپنی غیر جانبداری کا مکمل ثبوت فراہم کیا ہے اور جہاں مغربی تہذیب و معاشرت کے روشن پہلوؤں اور روشنی ڈالی ہے' وہاں

منفی پہلو بھی بیان کر دیئے ہیں۔ یہ ان کے مزاج کے توازن کا ثبوت ہے کہ جو چیز انہیں اچھی لگی' اسے موثر انداز میں بیان کیا اور جو دل پر گراں گزری اس سے روگردانی نہیں کی' یہی وجہ ہے کہ درج ذیل مغرب کے ایک اہم معاشرتی پہلو سے انہیں نفرت ضرور ہے لیکن اسے نظرانداز نہیں کرتے:۔

"یہاں جگہ جگہ باغوں' شاہراہوں' اسٹیشنوں' گاڑیوں' پارکوں وغیرہ میں بوس وکنار کے مواقع وافر ہیں اور ایسے مناظر بکثرت ہیں جو برصغیر میں سکینڈل بنتے رہتے ہیں۔ نہ جنس یہاں شجر ممنوعہ ہے اور نہ بوس وکنار آداب معاشرت کے خلاف' نئی پود تو سنا ہے کہ شادی کے ارادے ہی کے خلاف ہے۔"

آغا سہیل جب برطانوی سماج کی بات کرتے ہیں تو جائز یا ناجائز اولاد کے بارے ان کا بیان غور طلب ہے' وہ لکھتے ہیں:۔

"برطانوی سماج کا ہر فرد بشر گو اپنے مفادات کے حصول میں کوشاں ہے' لیکن اپنی ضروریات کے حصار کو نہیں توڑتا۔ اپنی خواہشوں کو اپنی حیثیت کے اندر رکھتا ہے' گویا قانع رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ راشی نہیں ہے' چور نہیں ہے قوم اور ملک کا غدار نہیں ہے' بے شک وہ شرابی ہے' زانی ہے' ناجائز اولاد ہے یا ناجائز اولاد کا باپ ہے' یہ سب گناہ (ہمارے نقطہ نظر سے) اس کی شخصیت اور اس کی ذات تک محدود ہے' سماج کے نظام کو درہم برہم نہیں کرتے۔"

آغا سہیل کے اس بیان سے اختلاف کیا جاسکتا ہے کہ ناجائز اولاد سماج کے نظام کو درہم برہم نہیں کرتی' کہا جاتا ہے کہ بچے کا ذہن ایسی زمین کی مانند ہے' جس میں جس قسم کا بیج بویا جائے' وہ اگ آتا ہے لہٰذا اگر ایک بچے کی بنیاد ہی ناجائز ذرائع پر رکھی جائے تو وہ جوان ہو کر ناجائز ذرائع کو ہی فروغ دے گا۔ اسی طرح جس عمارت کی بنیاد ہی ٹیڑھی ہو' اس پر معمار خواہ اپنی معمار سازی کے جتنے جوہر جلا لے' وہ عمارت ٹیڑھی ہی رہے گی۔ لہٰذا مغربی اقوام اور مغربی معاشرہ میں بیشک سائنسی علوم کو فروغ ملا' وہاں انسانی اقدار کی پاسداری بھی کی جاتی ہوگی' لیکن مشرقی روایات کی اہمیت بھی مسلم ہے۔ مغربی معاشرے کی

روایات جاذب نظر ضرور ہیں' ان کے طرز معاشرت کو اپنانے کو جی چاہتا ہے' لیکن ان کے ہاں مستقل مزاجی کا فقدان ہے اور یہ معاشرت باطنی طور پر کھوکھلی ہے' کیونکہ اس کی بنیاد ناجائز ذرائع پر رکھی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اسلامی اقدار سے روگردانی کرتے ہیں' حالانکہ اسلام ہی وہ واحد مذہب ہے' جو کسی معاشرے کو مکمل ضابطہ حیات فراہم کرتا ہے۔

انسان جب پرانی چیز کو دیکھتا ہے تو پورا تہذیبی اور ثقافتی عہد اس کے سامنے آ جاتا ہے۔ یہ فطری عمل بھی ہے کہ جب ہم ان چیزوں کے حوالے سے تاریخی سچائیوں کی طرف رجوع کرتے ہیں تو دلچسپی کا عنصر اور بھی بڑھ جاتا ہے۔ آغا سہیل صرف تماشائی نہیں ہیں' بلکہ ہر شہر اور ہر مقام ان کے لئے ایک تجربہ اور واردات ہے۔ انہوں نے بعض مقامات پر ماضی کو حال سے جوڑ دیا ہے۔ وہ ان چیزوں کا ذکر کرتے وقت ماضی کی اس یادداشت کو بروئے کار لاتے ہیں' جن کا ایک چیز سے گہرا تعلق ہوتا ہے۔ گویا ان کا تخیل انہیں زمانہ حال سے قدیم عہد کی طرف لے جاتا ہے اور ایک پورا تہذیبی پس منظر ان کے شعور اور ذہن میں چمک اٹھتا ہے۔ یہ شعور ماضی یا تاریخی احساس ان کے سفرنامے کی اہم خصوصیت ہے۔ "افق تا بہ افق" میں ان کے تخیل نے بہت سی عمارات کو تخلیق کیا' لیکن وہ ماضی کے گورکھ دھندوں میں اکیلے گم نہیں ہوتے بلکہ قاری کو بھی ساتھ رکھتے ہیں۔ تاریخ کے ان اندھے غاروں میں جھانکنے کا یہ انداز ایک تخلیقی شان کا مالک ہے۔ ایسے مواقع پر ان کا قلم تیزی سے چلنا شروع ہو جاتا ہے' کیونکہ ان کے نزدیک ایسی چیز کی وہی اہمیت ہے جو ایک بھوکے انسان کے نزدیک روٹی کی ہے۔ آغا سہیل جب ورڈزورتھ کے گھر کو بیان کرتے ہیں تو تخیلاتی دنیا میں کھو جاتے ہیں۔ یہاں ایک افسانہ نگار بیدار ہوتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ ایک مثال ملاحظہ ہو:۔

"بعض کمروں اور اس میں آراستہ فرنیچر اور ملبوسات کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ ابھی فلاں دروازے میں ورڈزورتھ داخل ہوگا اور بڑھ کر اس کا اوور کوٹ اور ہیٹ اس سے لے لے گا اور پھر وہ آتش دان کے سامنے آرام دہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے اپنے دستانے اتار کر سائیڈ ٹیبل پر رکھے گا اور انگلیوں کو سینکتے ہوئے ابھی گردن بھی

نہیں گھمائے گا کہ خادمہ ایک طرف سے کافی کا پیالہ لئے داخل ہوگی اور وہ اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے پیالے کو منہ سے لگالے گا۔ ایک گھونٹ سپ کر کے پیالہ میز پر لگا دے گا اور یوں اپنے گھریلو ماحول میں جو تھوڑا سا شاعرانہ بھی ہے' جذب ہو جائے گا۔"

بعض اوقات انسانی شعور میں اس کی اپنی ذات اور تہذیبی ماضی کا فاصلہ ختم ہو جاتا ہے۔ ماضی و حال کی حد ختم ہو جاتی ہے۔ آغا سہیل نے جابجا تاریخی روایات اور واقعات سے بھی استفادہ کیا ہے' مگر ان تاریخی واقعات اور روایات کی بھرمار نہیں ہے' بلکہ مناسب مواقع پر انہیں حوالے کے طور پر پیش کیا ہے:۔

"حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے اللہ نے دریائے نیل کے بیچ سے ان کے عصاء کے ایک اشارے سے راستہ بنا دیا تھا اور حضرت موسیٰ اپنے تمام لشکر کو لے کر گزر گئے تھے اور فرعون غرق دریائے نیل ہو گیا تھا۔"

انسان کی یہ کمزوری ہے کہ وہ خود اپنی تعریف کرتا ہے اور دوسروں کی تعریف زیادہ نہیں سن سکتا۔ اگر نثر نگار اپنی تحریر میں اپنی ذات کو زیادہ نمایاں کرے تو بھی کبھی یہ انداز بھی یوں قاری کی قرابت کا باعث بنتا ہے کہ وہ سفر نامہ نگار کی ذات سے بھی دلچسپی رکھتا ہے۔ سفر نامہ نگار جس قدر "میں" کا لفظ بکثرت استعمال کرے گا۔ قارئین اتنے ہی متاثر ہوں گے۔ سفر کے دوران کسی موقع پر اگر مصنف کے ذہن میں کوئی الجھن ہوگی تو یہ قاری کی بھی الجھن ہوگی۔ اگر لکھاری کسی چیز' شخصیت یا منظر سے متاثر ہوگا تو قاری بھی ضرور متاثر ہوگا۔ چونکہ آغا سہیل نے بھی اپنے سفر نامے میں "میں" کا لفظ بکثرت استعمال کیا ہے' لیکن کبھی کبھی وہ حد سے تجاوز کر جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ ذاتی بائیو ڈیٹا (Bio_Data) تک لکھنے بیٹھ جاتے ہیں۔ "افق تا بہ افق" کے پہلے باب "سفر کی تیاری" کو ان کا بائیو ڈیٹا کہہ لیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں' کیونکہ اس باب میں سفر کی تیاری کے حوالے سے جو باتیں لکھی گئی ہیں' وہ نہایت ہی مختصر ہیں۔ لہٰذا اس باب میں بائیو ڈیٹا کے علاوہ دوسرا عنصر وعظ و نصیحت کا ہے۔ پہلے باب کو پڑھتے ہی قارئین آغا سہیل کے گھریلو حالات' ازدواجی زندگی' ان کا مزاج' قیام طعام وغیرہ سے واقفیت تو حاصل کر ہی لیتے ہیں' ساتھ ہی دوسرا تاثر یہ

ابھرتا ہے کہ یہ سفرنامہ یقیناً لمبے لمبے دروس پر مشتمل ہو گا۔ اس کی وجہ غالباً یہی ہے کہ آغا سہیل سفرنامہ سے بھی اصلاح کا کام لینا چاہتے ہیں۔ اسی لئے انہوں نے "پیش لفظ" میں یہ کہا ہے کہ:۔

"اس سفرنامے کے قارئین کا حلقہ ذرا مختلف ہو گا اور چونکہ ان کے خون کی گردش میں اس سفرنامے سے کوئی سرعت اور تیزی پیدا نہ ہو گی۔ نہ گرمی اور جوش و ولولہ' اس لئے اس کی مقبولیت کا دائرہ انہی لوگوں تک محدود رہے گا' جو ہر شے کے مشاہدے کے بعد اس کے بارے میں غور و فکر سے بھی کام لیتے ہیں۔"

یوں تو سفرنامہ نگار اور قارئین کے مزاج میں ہم آہنگی اشد ضروری ہے اور مصنف کی ذات کے حوالے سے وہ جاننا ضروری سمجھتا ہے' لیکن ان باتوں سے زیادہ وہ ان دیکھی چیزوں کو دیکھنے کا تقاضا کرتا ہے۔ آغا سہیل نے اپنے دوسرے سفرنامے "ایران میں چودہ روز" میں اپنی اس کمزوری کو دور کرنے کی کوشش کی ہے' جس میں وہ ممکنہ حد تک کامیاب بھی ہوئے ہیں' لیکن پھر بھی اگر ان کے سفرناموں سے ان کے حالات زندگی مرتب کرنا چاہیں تو یہ ایک علیحدہ مضمون (آغا سہیل کی کہانی خود ان کی زبانی بن سکتا ہے' کیونکہ جب وہ اپنی کتھا کے حوالے سے بات کرتے ہیں تو اپنی خوبیاں وہ خامیاں بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے عزیز و اقارب' دوست و شاگرد سب کی لمبی چوڑی فہرست قلمبند کر دیتے ہیں' اب ذرا ان کی کہانی سنیئے:۔

"ہم لاہور میں ایف سی کالج کے احاطے میں تقریباً پچیس سال یعنی ربع صدی سے مقیم ہیں۔ اسی اثناء میں بڑے بڑے اتار چڑھاؤ رونما ہوئے اور ہمارے گھر کی آبادی میں مسلسل اضافہ بھی ہوتا رہا۔ چنانچہ موجودہ صورت حال یہ ہے کہ ماشاء اللہ میرے آٹھ بچے ہیں' چار بیٹے اور چار بیٹیاں۔ ٹھہریئے میں' اپنا بائیو ڈیٹا جس مقصد کے لئے بیان کر رہا ہوں' وہ بھی اس سفر میں جگہ جگہ کام آئے گا۔ مسرت کے بعد محسن' جو انگریزی ادب کا ایم اے ہے اور لیکچرر ہے محسن سے چھوٹا مسعود ہے۔ جس نے حال ہی میں ایم بی بی ایس پاس کیا ہے اور سروسز ہسپتال میں سول سرجن ڈاکٹر ریاض مصطفیٰ کی نگرانی میں ہاؤس جاب کر

رہا ہے۔ اس سے چھوٹی طلعت ہے' جو اطلاقی نفسیات میں ایم ایس سی کی ڈگری چند ماہ میں لینے ہی والی ہے۔ نصرت ایم اے انگریزی میں داخلہ لے رہی ہے۔ ندرت "ایف بے" کے ایم بی بی ایس کے دوسرے سال میں ہے۔ معارف نے دسویں کے لئے ۱۹۸۶ء میں بورڈ کا امتحان دیا۔ سب سے چھوٹا احتشام ساتویں جماعت میں ہے' ۱۹۸۹ء میں سینئر کیمرج کرے گا یا میٹرک۔ گھر کی فضا میں درس و تدریس کا ماحول ہے۔ جگہ جگہ کتابیں بکھری ہوئی ہیں..... میں بے حد پھوہڑ بدسلیقہ اور غیر مرتب شخص واقع ہوا ہوں۔ میری بچیاں نہایت سلیقہ شعار' ذہین اور ہنرمند ہیں۔"

"افق تا بہ افق" کے پہلے باب بعنوان "سفر کی تیاری" میں جو دوسرا تاثر ابھرتا ہے' وہ یہ ہے کہ آغا سہیل کبھی واعظ کی حیثیت سے قلم اٹھاتے ہیں تو کبھی عمرانیات نفسیات اور سماجیات کی بات چھیڑ دیتے ہیں۔ کبھی تاریخ کے گورکھ دھندوں میں گم ہو جاتے ہیں تو کبھی صحافی اور ادیب کا رنگ اپنا لیتے ہیں۔ آغا سہیل پیشے کے اعتبار سے ایک معلم ہیں۔ پھر بھی وہ اپنے آپ کو معمولی طالبعلم کی سطح سے بھی کمتر سمجھتے ہیں۔ چونکہ وہ کوئی واعظ یا ملا نہیں ہیں' پھر بھی وہ وعظ و نصیحت کے موضوع پر صفحات در صفحات کالے کر دیتے ہیں' حتیٰ کہ وہ کبھی کبھار یہ بھول جاتے ہیں کہ سفرنامہ اتنے لمبے چوڑے دروس کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ ایک مثال دیکھیں:۔

"نیکی اور برائی بجائے خود کیا ہے' اس کا تعین کر لینے کے بعد جب کوئی نیکی پر چلے اور برائی سے بچے اور خلق خدا کو اپنی نیکی کے ثمرات تفویض کرے' پھر تو اسے نیک مانیئے..... مسلمان دعویدار ہے کہ کسی مسجد میں کوئی مسافر آکر ٹھہر جائے تو وہ اسلام کی فلاحی مملکت کا مہمان ہوتا ہے۔ تمام مسلم ممالک اپنے اپنے دساتیر کا جائزہ لیں اور اپنے گریبانوں میں جھانک کر دیکھیں اور غور کریں کہ ان کی مسجدوں میں مسلمان اور غیر مسلمان کتنے مسافر جمع ہوتے ہیں اور ان کے ساتھ کیا سلوک کیا جاتا ہے۔"

اسلوبیاتی سطح پر "افق تا بہ افق" کا تجزیہ کرنے سے پہلے یہ جان لینا ضروری ہے کہ آغا سہیل کی جنم بھومی لکھنؤ ہے۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم بھی اتر پردیش سے ہی حاصل

کی' حتیٰ کہ ایم اے کی ڈگری بھی وہیں سے حاصل کی' یہی وجہ ہے کہ انہوں نے لکھنے لکھانے کا آغاز لکھنؤ کے پرشکوہ ماحول سے کیا' جس کے اثرات عرصہ دراز تک ان کے اسلوب پر جاری رہے۔ ان کے ابتدائی دور کے افسانے لکھنؤی تہذیب ہی کی عکاسی کرتے ہیں۔ جب ان کا ناطہ لکھنؤ سے ٹوٹا تو انہوں نے لاہور میں ڈیرے ڈال لئے' لیکن لکھنؤ کی درخشاں یادیں اب بھی ان کے دل و دماغ میں خون کی طرح گردش کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے سفرنامے میں دیگر شہروں کی سیر کراتے کراتے کبھی کبھی لکھنؤ بھی لے جاتے ہیں اور وہ بلا تکلف لکھنؤی اسلوب اپنانا شروع کر دیتے ہیں۔ لیکن یہ انداز ان کا مستقل انداز نہیں ہے' بلکہ محض قدیم یادوں کو تازہ کرنے کے لئے' جب وہ لیڈز کے بازار میں جاتے ہیں تو پرانی یادیں عود کر آتی ہیں:۔

"وہ حسین صبحیں ہیں کہ ہزار ہا صبح بنارس نثار' وہ شامیں ہیں کہ ہزار ہا شام اودھ قربان اور وہ جمال میں ڈوبی ہوئی راتیں ہیں کہ شب مالوہ صدقے۔ ان بتان طناز' عشوہ ساز عربدہ جو بالیدہ کو دیکھ دیکھ کر حوران خلد شرمسار ہوں۔ نرم و گداز جسم زعفران کے سے پیلے پیلے بالوں کا چہروں پر چھنکا پڑا ہوا' نرم نرم خط و خال' موتیوں کے سے ہموار دانت' کھڑی کھڑی ستوان ناک' چھوٹا سا دہانہ' غزالان ختن کی سی غزالیں سرگیں آنکھیں عارضی گلگوں میں ہنستے وقت گڑھے پڑتے ہیں اور چاہ ذقن میں عشاق کے دل ڈوبتے ہیں۔ اس حسن و رعنائی' دلکشی اور زیبائی کو دیکھ کر اچھے اچھوں کا برا حال ہوتا ہے۔ زاہدوں کے ہاتھ سے تسبیح گر جاتی ہے۔"

ابن انشاء نے "چلتے ہو تو چین کو چلئے" میں پہلی مرتبہ مزاح نگاری کو سفرنامے میں شامل کر کے ایک نئے انداز کو متعارف کرایا۔ آغا سہیل یوں تو سنجیدہ مزاج کے آدمی ہیں۔ یہی سنجیدگی اور سلاست ان کے اسلوب کی اہم خصوصیت ہے' لیکن وہ کبھی کبھار قارئین کی دلچسپی کے لئے ہلکی پھلکی مزاح نگاری کو بھی ہاتھ لگا لیتے ہیں دراصل وہ مختلف انداز سے اپنی بات کی تفہیم چاہتے ہیں' گویا ہلکی پھلکی شگفتگی کے اس انداز نے ان کے اسلوب کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

"میں نے ایک پرانی گاڑی پر گاڑی چلانا سیکھی۔ اور شروع ہی میں دوسرے یا تیسرے روز بریک کے بجائے ایکسیلیٹر پر پاؤں رکھ کر گاڑی کو درخت سے روکا۔"

ایک اور جگہ رقمطراز ہیں:۔

"غلام قادر آزاد میں خوبیاں تو بہت ہیں ایک ایک آدھ ایسی خامی بھی ہے، جسے میں ہنر سمجھتا ہوں، ممکن ہے کہ یہ ہنر آپ کو بھی آتا ہے۔ مجھے تو اس میں کمال حاصل ہے اور کمال بھی ید طولیٰ کی حد تک ماشاء اللہ حاصل ہے اور وہ یہ کہ نہایت آسانی سے راستہ بھول جایا کرتا ہوں۔"

اس سفرنامے میں آغا سہیل نے جس طرح ملاقات اور تخیل کو یکجان کیا ہے، فطرت نگاری کے جو نمونے پیش کئے ہیں۔ تاریخی مقامات کو جس انداز سے پیش کیا اور ذاتی بائیو ڈیٹا کو جس انداز سے اس سفرنامے کے لئے ضروری بنا دیا ہے، اس سے ان کے اسلوب میں دلچسپی پیدا ہوئی ہے۔ اب جب کہ بہت سے سفرنامے ہمارے سامنے آگئے ہیں، مگر "افق تابہ افق" کی تاریخی اہمیت قائم و دائم ہے اور یہ سفرنامہ محض خارجی سفر کی روداد نہیں بلکہ باطنی کیفیات کو بھی نہایت خوبصورتی سے آشکارا کیا گیا ہے۔

"ایران میں چودہ روز" جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، ایران کا سفرنامہ ہے۔ یہ سفر نامہ قسط وار ماہنامہ "تحقیق" لاہور میں شائع ہوتا رہا ہے۔ اس سفرنامے میں آغا سہیل کا بنیادی وصف خاکہ نگاری ہے۔ جس شخصیت کا بھی ذکر کرتے ہیں، اس کا کوئی پہلو بھی پوشیدہ نہیں رکھتے۔ اس کی سیاسی، سماجی اور ادبی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ ظاہری خدوخال بھی واضح کرتے ہیں، خواہ وہ علی خامنائی ہوں یا ہاشمی رفسنجانی، ان کی وضع قطع، انداز خطابت، چال ڈھال، حتیٰ کہ ان کی زندگی کا کوئی پہلو آغا سہیل کی موئے قلم سے بچ نہیں سکتا، بلکہ اتنے اختصار سے کام لیا ہے کہ چند جملوں میں ہی شخصیت کا مکمل ڈھانچہ قاری کے سامنے رکھ دیتے ہیں۔ مثلاً حضرت خامنائی کے بارے لکھتے ہیں:۔

"آقائے خامنائی بلند قامت، کشادہ پیشانی، ستواں ناک، بڑی بڑی آنکھیں اور گھنی داڑھی کے سبب بڑے ہی خوبصورت آدمی ہیں۔ ان کی آواز میں کھنک اور گہرائی

ہے۔ ان کی خطابت میں توانائی ہے۔"

ایرانی صدر ہاشمی رفسنجانی کے بارے رقمطراز ہیں:۔

"آقائے رفسنجانی مشرق و مغرب دونوں خطوں میں مختلف انداز سے متعارف ہیں۔ اپنی سیاست اور میانہ روی اور تدبر کے ساتھ دور اندیشی کا وصف بھی ان میں موجود ہے اور مغربی دنیا کے مخصوص طرز فکر سے بھی وہ بخوبی آگاہ ہے۔"

اسلامی انقلاب ایران کے بانی امام خمینی کے بیٹے احمد خمینی کی شخصیت یوں واضح کرتے ہیں:۔

"حضرت احمد خمینی کی تقریر میں اپنے والد بزرگوار کے سانحہ ارتحال کے حوالے سے سچے اور گہرے جذبات بھی تھے اور ادبیانہ اور خطیبانہ رنگ بھی تھا۔ اس میں سیاست بھی تھی' لیکن سیاسی رنگ گہرا نہ تھا۔"

شہنشاہ ایران رضا شاہ پہلوی مملکت ایران کا صرف حاکم ہی نہ تھا بلکہ ایک بہت بڑا ڈکٹیٹر بھی تھا۔ ملکی اقتصادیات کو اس فرد واحد نے جس انداز سے نقصان پہنچایا وہ اسلامی انقلاب کے بعد پوری دنیا میں عیاں ہے کہ اس کے ایک ایک محل میں پورے ملک کی فوج سما سکتی ہے۔ لیکن یہی محلات اب آنے والی نسلوں کے لئے عجائب گھر کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ ایران کی موجودہ حکومت دراصل نئی پود کو یہ بتانا چاہتی ہے کہ کسی طور وہ ذاتی عیش و عشرت کی خاطر غریب عوام کو بھوک کی چکی میں پیستا رہا۔ ان عجائب گھروں کا (جو کسی زمانے میں شہنشاہ کے محل تھے) جب آغا سہیل ذکر کرتے ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ:۔

"جیسے ابھی ابھی کوئی یہاں سے گیا ہے یا بس ابھی کوئی آنے والا ہے۔"

شہنشاہ ایران جو اپنے دور کے لحاظ سے مغل شہنشاہوں سے بھی بڑا حکمران تھا۔

اس کے ایک محل کے احوال و آثار ذرا آغا سہیل کی زبانی سنیئے:۔

"محل میں داخل ہوتے ہی سب سے نمایاں چیز جو مرکز نگاہ بن کر نظر آتی ہے' وہ خوبصورت سیڑھیاں ہیں۔ جو اوپر کی منزل سے نیچے اترتی ہیں۔ سیڑھیاں ایک ایسے وسیع

لاؤنج میں اترتی ہیں' جو شاہی زمانے میں آراستہ و پیراستہ رہا ہوگا۔ سیڑھیاں ایرانی قالینوں سے مزین ہیں' البتہ سیڑھیوں پر چڑھنے کے لئے راستے کو بند کر دیا ہے کہ خوبصورت قالین خراب نہ ہو جائیں اور لوگ اپنی آمد و رفت سے تزئین و آرائش کو تباہ نہ کریں۔ لاؤنج کے مرکز میں بیلجیم کے شیشے جھاڑ کنول اور فانوس کی شکل میں لٹک رہے ہیں۔ جگہ جگہ منقش قد آدم روغنی تصاویر بھی آویزاں ہیں اور مناظر کی موقلم تصاویر بھی لگائی گئی ہیں۔ کمرے کھلے ہوئے ہیں لیکن ان پر کٹہرے لگا کر راستہ بند کر دیا گیا ہے۔ کوئی ملاقات کا کمرہ ہے' کوئی وزراء سے مشاورت کا کمرہ' کسی کو ڈرائنگ روم کہا گیا ہے' کہیں پر ڈرائنگ روم ہے اور یہ سارا لاؤنج بیضوی شکل میں بنایا گیا ہے۔ دائیں ہاتھ کو کچھ سیڑھیاں ایسی بنائی گئی ہیں جن سے آپ اوپر کی منزل کو جا سکتے ہیں۔ بائیں ہاتھ سے بھی اس کا اہتمام ہے۔ لیکن اوپر کے کمرے میں شاہ معدوم' ملکہ اور شہزادوں کی آرام گاہیں ہیں۔ کتب خانے ہیں۔ ایک طرف بالکونی سے محل کے اندرونی احاطے کا نظارہ کیا جا سکتا ہے اور غالباً سب سے اوپر کی منزل میں جس کا راستہ بند تھا' تمام محل کو بیک وقت اور بیک نگاہ دیکھا جا سکتا ہوگا۔ بائیں ہاتھ سے چلئے تو شاہ معدوم کے غسل خانے' ملکہ کے غسل خانے اور لکھنے پڑھنے اور کام کرنے کے لئے کچھ چھوٹے چھوٹے دفاتر موجود ہیں' تاہم فرنیچر اور تصاویر سب اعلیٰ درجے کی ہیں' جن میں نقش و نگار بھی بنے ہوئے ہیں اور بہترین منبت کاری موجود ہے چھتوں پر نقش و نگار بھی بنے ہوئے ہیں اور سونے کا پانی بھرا ہوا ہے۔ نقش و نگار اور پھول پتیوں میں ہیرے جواہرات جڑے ہوئے ہیں۔ ڈرائنگ روم میں بہترین کراکری اور کٹلری سجی ہوئی ہے۔"

شہنشاہ ایران کے دور میں ایران میں آمریت کا دور دورہ تھا۔ وہ اپنی شہنشاہیت کے نشے میں اس حد تک غرق ہو چکا تھا کہ اس نے اسلام سے روگردانی کی' وہ اسلام کا نام تو لیتا تھا' مگر وہ محمدی اسلام کی بجائے "امریکی" اسلام تھا کہ جس میں پردہ ممنوع تھا۔ شراب' زنا' بدکاری کی کھلی اجازت تھی' مکمل طور پر غیر اسلامی رسم و رواج لاگو تھے۔ لیکن انقلاب کے بعد اب وہی ایران ایک لحاظ سے اسلام کا مرکز بنا ہوا ہے۔ اس کے

حکمران اب شہنشاہ کے پٹھو نہیں بلکہ علماء اسلام ہیں۔ اسلامی احکامات کو لاگو کیا گیا ہے۔ گویا ایران میں حکومت بدلی تو عوام کا مزاج بدلا۔ مزاج جب بدلتے ہیں تو معاشرتی رسم و رواج از خود بدل جاتے ہیں۔ ایرانی رسم و رواج کے بارے آغا سہیل یوں لکھتے ہیں:۔

"جو بات قابل ذکر ہے' وہ یہ کہ اہل ایران کے مجموں میں تالی نہیں بجائی جاتی' اس کی جگہ درود و سلام کا ورد ہر ایک کی زبان پر رہتا ہے۔"

ایک اور جگہ پردہ اور لباس کے بارے رقمطراز ہیں:۔

"ایک بار پھر ہم نے یہ نظارہ کیا کہ پانچ پانچ' چھ چھ سال کی بچیاں سیاہ چادروں میں ڈھکی ہوئی تھیں' صرف ان کے چہرے کھلے ہوئے تھے' لڑکے زیادہ تر جینیز پہنے ہوئے تھے۔"

ایرانی عوام کا اپنے روحانی پیشوا امام خمینی سے عقیدت کا ایک پہلو ملاحظہ ہو:۔

"امام خمینی کا جب نام آتا ہے تو اہل ایران فوراً درود و سلام بھیجنا شروع کر دیتے ہیں۔"

آغا سہیل نے ایرانی تہذیب کے روشن و تاریک ہر پہلو کا بغور مشاہدہ و مطالعہ کیا' پھر اپنی پسند و ناپسند پر اپنی آراء پیش کیں جو کہ متوازن اور منصفانہ ہیں۔ گو آغا سہیل کو ایران سے ایک خاص عقیدت اور وابستگی ہے' لیکن پھر بھی وہ منفی پہلو بیان کرتے ہیں اور کسی قسم کی جھجک محسوس نہیں کرتے' بلکہ غیر جانبدارانہ آراء دیتے ہیں:۔

"میں جانتا ہوں کہ ایرانیوں میں بہت سی خوبیوں اور خوبصورتیوں کے باوجود بعض خامیاں بھی ہیں' مثلاً یہ کہ اپنی تہذیب اور شائستگی کے پردے میں وہ اپنے دل کی بات مطلقاً ظاہر نہیں ہونے دیتا' دوسرے لفظوں میں منافقت اختیار کرتا ہے' ایرانی کو اپنے آریاء ہونے پر ناز ہے۔ ایرانی نژاد آریاء جہاں جہاں پہنچے' انہوں نے وہاں وہاں دوسری قوموں کو مغلوب کیا اور اپنی تسکین نخوت' اپنی انا پرستی کا ایک گھروندا بنایا اور اس میں اپنے تشخص کو قائم کرلیا' وقس علیٰ ھذا ایرانیوں نے جتنی بھی غیر ایرانی قوموں سے جنگیں کیں' خواہ فتح پائی یا شکست' مگر اپنی شکست کو تسلیم نہیں کیا اور کسی نہ کسی شکل میں اپنی

شکست کا بدلہ ضرور لیا۔"

کہا جاتا ہے کہ عالم اسلام میں کسی نبی' صحابی' امام یا ولی کے روضہ اقدس کے گرد اتنا ہجوم نہیں ہوتا' جتنا کہ حضرت امام رضا کے روضہ اقدس کے گرد ہوتا ہے۔ دن ہو' رات ہو' صبح و شام' گرمی سردی' ہر وقت ہجوم کا ایک ہی سماں ہوتا ہے۔ مرد' عورت' بچے' بوڑھا غرض ہر کسی کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ ضریح اقدس کا بوسہ لے' یہی وجہ ہے کہ آغا سہیل جنہیں امام ہشتم سے خاص عقیدت ہے' وہ بھی ضریح پاک پر حاضری کو غنیمت سمجھتے ہیں۔ مشہد مقدس کے بازار' گلیوں میں گھومنے پھرنے کی بجائے وہ اپنی زندگی کے یہ چند لمحات ضریح میں ہی گزارنا چاہتے ہیں۔ روضہ اقدس کے گرد کیا حال ہوتا ہے' یہ بھی آغا سہیل سے ہی پوچھتے ہیں:۔

"بس ہجوم میں آپ کیسے اور کس طرح دریا کی موجوں کو چیرتے پھاڑتے ضریح تک پہنچ جاتے ہیں۔ آپ کو خود پتہ نہیں چلتا' ضریح کے غلاف اور کپڑوں کو لوگ بوسہ دیتے ہیں۔ ضریح کے کٹہرے کو پکڑ کر لوگ کھڑے ہو جاتے ہیں۔ بیشتر زارو قطار روتے ہیں اور دعا مانگتے ہیں۔ اکثر یہ بھی دیکھا کہ مجمع کے تیز اور تند دھاروں پر بہتے ہوئے آپ ضریح تک آئے اور اچانک دوسرا دھارا آپ کو بہا کر کسی اور طرف لے گیا..... ادب کا تقاضا تو یہ ہے کہ آپ دوسروں کو بھی موقع دیں۔ لیکن یہاں ادب سے زیادہ لوگ دل کی لگی کو دیکھتے ہیں اور دلی جذبات سے مغلوب ہو کر تادیر ضریح سے چمٹے رہتے ہیں' روتے ہیں' خضوع و خشوع سے دعا مانگتے ہیں۔ میں نے اس بات کا بھی اندازہ کیا کہ تمام دنیا کے ملکوں سے آئے ہوئے مختلف عقائد و مسلمات کے لوگ یہاں پائے جاتے ہیں' کیونکہ آپ ہر دو اوقات میں جب لوگوں کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے ہیں تو عقائد و مسلمات کا اظہار ہو جاتا ہے۔"

آغا سہیل نے یہ کوشش کی ہے کہ وہ جو کچھ دیکھیں وہ قاری کو بھی دکھائیں۔ جو کچھ خود محسوس کریں' وہی قاری محسوس کرے۔ وہ زمانہ حال کی بات کر رہے ہوں یا ماضی کے گورکھ دھندوں میں گم ہوں' انہیں اس بات کا احساس ضرور ہوتا ہے کہ قاری کا کہیں ہاتھ نہ چھوٹ جائے۔ وہ جب نادر شاہ کے مقبرے کا ذکر کرتے ہیں' تو ایک مرتبہ پھر

نادر شاہ کا دربار ہماری آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے۔ اس کے کردار گفتار اور انداز حاکیت پر پوری طرح روشنی ڈالتے ہیں۔ گویا نادر شاہ کے تاریخی دور کو زندہ کر کے پیش کرتے ہیں' اس کی مثال ملاحظہ ہو:۔

"نادر شاہ نے جو ایران میں عروج حاصل کیا تھا' اس کی بہت سی کہانیاں برصغیر میں پہنچتی رہی تھیں۔ اس کی فوج کا صیغہ نہایت مضبوط تھا۔ وہ خود ایک وجیہہ اور مضبوط سپاہی تھا اور اپنی سپاہیانہ وضع قطع کے طور طریقوں کی بنا پر انتہائی سخت گیر حیثیت رکھتا تھا۔ نہ خود آرام کرتا تھا نہ اپنے سپاہی کو آرام کرنے دیتا تھا۔ وہ ایک اعلیٰ درجے کا شہسوار بھی تھا۔ نیزے باز بھی اور تیغ زن بھی تھا اور دیگر تمام روایتی داؤ پیچ بھی جانتا تھا۔ دہلی کو فتح کرنے کے بعد نادر شاہ نے اس کی گلی گلی کوچے کوچے میں قتل و غارت گری کا بازار گرم کیا' گھروں کو لوٹا اور خوب دولت سمیٹی' یہاں تک کہ تخت طاؤس اور کوہ نور دونوں ہندوستان سے لے گیا۔"

یوں تو ماضی کے حالات بیان کرنا تاریخ کا کام ہے' عرصہ دراز تک ماضی پرستی کو سفرنامے کا جزو لازم تصور کیا جاتا رہا' لیکن جلد ہی ناقدین ادب نے اس سے روگردانی کی' گویا آجکل سفرنامہ میں تاریخی واقعات بیان کرنا مشکل کام ہے۔ یہ فنکار کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس انداز سے بیان کرے کہ اپنا مقصد بھی بیان ہو جائے اور قاری کو پتہ بھی نہ چلے کہ میں کہاں تھا اور کہاں چلا گیا۔ آغا سہیل جب مشہد امام رضا کے روضہ اقدس پر لے جاتے ہیں' تو ساتھ ہی داتا دربار لاہور کی بات چھیڑ دیتے ہیں۔ اصفہان کی قدیم مسجد کا ذکر آتا ہے تو لکھنؤ کے امام باڑہ آصفی کو بھی بیان کر دیتے ہیں۔ مثال ملاحظہ ہو:۔

"اس مسجد کے اونچے اونچے کشادہ دروں' گنبدوں اور میناروں کو دیکھ کر مجھے لکھنؤ کی بہت سی عمارتیں یاد آئیں جو ہو بہو انہی گنبدوں اور میناروں کی نقلیں ہیں۔ اس کاشی کاری اور بت کاری کے رنگ ڈھنگ اور طور طریقے بھی وہی ہیں۔ یہاں تک کہ لکھنؤ کا امام باڑہ آصفی جو اس عمارت سے کئی گنا بڑا ہے اور ۱۷۷۵ء میں تیار ہوا تھا' اس کی لداؤ کی چھت کی حکمت وہی ہے جو اس مسجد میں استعمال ہوئی ہے۔"

یہ مسلم حقیقت ہے کہ بعض جذبات' خیالات و احساسات خوابوں کی شکل اختیار کر کے نسل در نسل منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ ان خوابوں کو اگر ایک نسل پورا نہ کر سکے تو بسا اوقات دوسری یا تیسری نسل کو ایسے مواقع مل جاتے ہیں' جن کو پایہ تکمیل تک پہنچا کر وہ ذہنی آسودگی حاصل کر سکتے ہیں۔ آغا سہیل کے آباؤ اجداد کا تعلق اصفہان سے ہے۔ اس مادر گیتی' مہربان اصفہان کو دیکھنے کی خواہش بچپن ہی سے ان کے دل میں کروٹ لے رہی تھی۔ اب وہ خواہش پوری ہوئی' جب آغا سہیل اصفہان پہنچے تو گویا:-

"اصفہان میں سانس لیتے ہوئے مجھے صرف اور اپنے مورث اعلیٰ کے حوالے سے خود اپنے آپ کو دریافت کرنا تھا۔"

لیکن اس "نصف جہاں" یعنی اصفہان میں پہنچ کر مورث اعلیٰ کو دریافت کرتے کرتے خود اس کے پر کشش ماحول میں ڈوب گئے' وہ لکھتے ہیں:-

"مجھے اس فضا میں سانس لیتے ہوئے بڑی طمانیت اور آسودگی کا احساس ہوا۔ اس طمانیت اور آسودگی کو میں نے اپنے قلب کی گہرائیوں سے محسوس کیا اور ان تمام کیفیتوں کو میں نے اپنے پردادا آغا محمد حسن کی طرف منتقل کر دیا۔"

اصفہان عرصہ دراز تک ایران کا بیت سلطنت رہا ہے۔ پورے عالم میں آج بھی اسے قدر و منزلت سے دیکھا جاتا ہے۔ وہاں کی خوشگوار آب و ہوا اور پر کشش ماحول نے آغا سہیل کا دل موہ لیا۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ وادی اصفہان پر اترے تو اتنے جذباتی ہو گئے کہ آپے سے باہر ہو جاتے ہیں' وہ لکھتے ہیں کہ:-

"جب ہمارا جہاز اصفہان کی سرزمین پر لینڈ کر گیا اور ہم جہاز سے باہر آئے اور پہلی مرتبہ اس سرزمین پر کھڑے ہو کر وہاں کی فضا میں سانس لی تو بے تحاشا جی چاہا کہ اس سرزمین کو چوم لیجئے' سر بسجدہ ہو جائیے' مجنونانہ حرکتیں کرتے جائیے۔" آغا سہیل مستقل مزاج شخصیت کے مالک ہیں وہ لکیر کے فقیر نہیں ہیں اور نہ ہی زندگی کی ایک ہی ڈگر پر چلنے کے قائل ہیں' بلکہ اطراف و جوانب کا بھی دھیان رکھتے ہیں۔ ان کا مشن سماج کی اصلاح ہے۔ وہ تو سفرنامے سے بھی اصلاح کا کام لیتے ہیں۔ جگہ جگہ اپنی خامیاں بیان کر کے دیگر

ممالک سے ان کا موازنہ کرتے ہیں اور آخر میں ان کا حل بھی تلاش کرتے ہیں۔ گویا یہ ان کا وصف ہے کہ وہ قاری کے ساتھ سفر کرتے کرتے چند لمحوں کے لئے رک جاتے ہیں اور پھر آگے چل پڑتے ہیں۔ سفرنامہ میں ایسا کرنا گویا قصیدہ میں تشبیب سے گریز اور پھر گریز سے مدح کی طرف آنے کے مترادف ہے۔ ایسے مواقع پر دلچسپی کے عنصر کا دھیان رکھنا اشد ضروری ہے' ورنہ سفرنامہ میں جھول پڑ جائے گا اور قاری کا ہاتھ چھوٹ جائے گا۔ آغا سہیل نے تمام باتوں کا شعوری طور پر دھیان رکھا ہے' وہ لکھتے ہیں:-

"تہران کے بازار یورپ کے بازاروں کا تو مقابلہ نہیں کرسکتے' مثلاً میں نے لندن لیڈز' بریڈ فورڈ' برمنگھم اور نیو کاسل وغیرہ کے بازار دیکھے ہیں۔ یہاں وہ بات تو نہیں ہے' لیکن تھوڑی بہت یورپ کے بازاروں کی نفاست اور صاف ستھرائی ضروری ہے۔ اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ ہمارے پاکستانی بازار ان کا مقابلہ نہیں کرسکتے۔ ایران کے بعض ڈیپارٹمنٹل سٹورز اچھے وسیع اور کشادہ ہیں اور وہاں ایرانی سیلز گرلز بھی نہایت مستعدی سے کام کرتی ہوتی نظر آتی ہیں' جن کا پاکستانی ڈیپارٹمنٹل سٹورز میں تقریباً فقدان ہے' لیکن اگر پاکستان ڈیپارٹمنٹل سٹورز پر صنف نازک کی خدمات حاصل کی جائیں تو وہ کسی طرح بھی ایران سے پیچھے نہیں ہوں گی۔ اور اس طرح جو نفاست اور جمالیاتی پہلو سامنے آئے گا' وہ یقیناً پرکشش ہوگا۔"

آغا سہیل نے سفرنامے میں دلچسپی کے عنصر کو دوبار کرنے کے لئے کہیں کہیں مرقع نگاری کا بھی سہارا لیا ہے۔ وہ ایرانی لباس اور معاشرت کے نمونے بڑی عمدگی اور فنی چابکدستی سے پیش کرتے ہیں۔ ان کی بنائی ہوئی تصاویر میں جزئیات نگاری بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ تصویریں متحرک' چلتی پھرتی اور حرکت کرتی نظر آتی ہیں اور قاری خود کو اس منظر کا ایک حصہ شمار کرتا ہے۔

"ایران میں چودہ روز" میں موسموں کا بیان ہو یا شہر کے احوال و آثار' تاریخی عمارات کا تذکرہ ہو یا کسی جلسہ جلوس کی روداد' وہ اپنی آنکھ اور قلم کے کیمرہ سے قاری کے سامنے پورا متحرک منظر پیش کرتے ہیں۔ ایک مثال ملاحظہ فرمائیں:-

"بسوں کے اطراف کے شیشے بار بار ہاتھ سے صاف کر کے' اطراف کے مناظر دیکھے جاسکتے تھے۔ درختوں کے پتوں پر' شاخوں پر اور درختوں کے تنوں پر برف ہی برف تھی۔ ہوا چلنے سے اگر پتے ہلتے تو برف ڈھلک کر گر جاتی تھی' ورنہ تمام مناظر پر برف کا قبضہ تھا اور فضا کی کوئی شے بھی واضح نہ تھی۔"

آغا سہیل نے برجستہ تشبیہات واستعارات کے استعمال سے بھی اپنی تصویروں کو زندگی بخشی ہے وہ موزوں الفاظ کے استعمال کا سلیقہ رکھتے ہیں۔ وہ شہروں' آبادیوں تاریخی عمارتوں' بازاروں یا مزاروں کی سیر کرتے ہوئے ان کی فضاؤں میں گم ہو جاتے ہیں۔ کبھی کبھی وہ اپنے تخیل کے بل بوتے پر صدیوں پیچھے چلے جاتے ہیں۔ لیکن وہ تخیل کے گھوڑے نہیں دوڑاتے اور نہ ہی فضاؤں میں اڑتے پھرتے ہیں' بلکہ مذہبی' سیاسی' معاشرتی اور معاشی قوائد و ضوابط کو لطیف انداز میں پیش کر کے قاری کی معلومات میں اضافہ کرتے ہیں۔ ان کے اسلوب نگارش کا نمایاں پہلو یہ ہے کہ وہ قاری کے ذہن کو پوری طرح اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں اور حقائق کو مسخ نہیں کرتے۔ وہ کہیں کہیں عربی فارسی یا انگریزی کے الفاظ استعمال کر جاتے ہیں' لیکن پڑھنے والا متعلقہ الفاظ کو اردو کا ہی حصہ سمجھتا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

"ضریح کے اطراف و جوانب میں تل دھرنے کی جگہ نہیں ملتی۔ مجمعے کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر روضے کے اطراف میں اس صورت میں پھیلا ہوا ملتا ہے' جیسے شہد کی مکھیاں اپنے چھتے میں اور ہر قوم اور ہر قبیلے اور ہر لباس کے افراد آتے ہیں۔"

دوسری مثال دیکھیں:۔

"ویرائٹیز کی وجہ سے ایرانی اور اصفہانی گاز کسی شمار و قطار میں نہیں۔"

ایک اور مثال یوں دیتے ہیں:۔

"ہم ایسے نازک اندام بھی نہیں تھے کہ ذرا سی برف باری میں پریشان ہو جائیں اور چھینکنے لگیں۔ ہمارے اندر بھی ایک ایڈونچر سٹ پیدا ہو گیا تھا۔ بلکہ ہم سے زیادہ ڈاکٹر رفیق اس برف باری کو Enjoy کرتے تھے۔"

اس سفر میں مختلف اشخاص کا ذکر ہے' لیکن آغا سہیل ایسے افسانہ نگار ہیں کہ جو بذریعہ کردار نگاری سفرنامہ کو افسانہ بنا دیں۔ یہ انداز دراصل شفیق الرحمان کے سفرناموں کا ہے۔ آغا سہیل کے ہاں کردار' اشخاص و افراد آتے ہیں لیکن محسوس ہوتا ہے کہ انھیں تاثرات و احساسات سے زیادہ دلچسپی ہے۔ فکری سطح پر اس سفرنامے کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں گہری انسان دوستی کا سراغ ملتا ہے۔ انھیں ایران کے مختلف شہروں کے لوگوں سے واسطہ پڑا تو وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ اگرچہ انسانی تہذیبوں میں اور جغرافیائی ماحول میں ایک دوسرے سے الگ رہتا ہے' لیکن چند اشیاء پوری نسل انسانی کو ایک وحدت میں پرو دیتی ہیں اور ان کے درمیان کوئی نہ کوئی رشتہ ضرور نکل آتا ہے۔ اس کو احمد ندیم قاسمی نے اپنے سفرنامے میں یوں بیان کیا ہے:۔

وہ اعتماد ہے مجھ کو سرشت انساں پر
کسی بھی شہر میں جاؤں' غریب شہر نہیں

"افق تا بہ افق" اور "ایران میں چودہ روز" بنیادی طور پر دو الگ الگ واردات کے سفرنامے ہیں۔ اول الذکر مغرب کے سماج' تہذیب اور انداز فکر و نظر کی عکاسی کرتا ہے' جب کہ ثانی الذکر مشرق کی بچی اور واضح تصویر لے کر سامنے آتا ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ یہ دونوں سفرنامے ایک ہی فنکار کے رشحات قلم کا نتیجہ ہیں۔ لیکن اسلوب اور بیان کے اعتبار سے ان میں نمایاں فرق محسوس ہوتا ہے۔ "افق تا بہ افق" میں مصنف نے معروضی انداز میں اپنے سفر کے احوال کا قلم بند کیا ہے اور غیر جانبداری کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ یوں کہہ لیجئے کہ مصنف نے جو کچھ دیکھا' اور محسوس کیا' اسے من و عن قاری کے سامنے بیان کر دیا۔ کہیں کہیں صورت حال کی وضاحت کے لئے ایسی مثالیں فراہم کیں' جن کا تعلق مصنف کے ذاتی احوال سے ہے۔ یوں کہہ لیجئے کہ مصنف اس سفر نامے کے ذریعے جہاں اپنے سفر کی روداد بیان کرتا ہے' وہاں تاریخ سے اکتساب کر کے معلومات اور واقعات کا ذخیرہ بھی فراہم کرتا ہے۔ لیکن دوسرے سفرنامے "ایران میں چودہ

روز" میں صورت حال مختلف نظر آتی ہے۔ اس سفرنامے کا تعلق مصنف کے معتقدات سے ہے۔ وہ اس سفرنامے میں اپنے عقائد اور بطور خاص اپنے آباؤ اجداد کے مسکن قدیم اصفہان کے حوالے سے ایک جذباتی کیفیت سے دو چار ہوتا ہے۔ اس جذباتی کیفیت میں کہیں کہیں افراط و تفریط کا رنگ بھی غالب نظر آتا ہے' لیکن اتنا ضرور ہے کہ مصنف جذبات کے بہاؤ میں بہنے کے بجائے اپنے اصل مقصد کو نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونے دیتا اور یہی بات اس سفرنامے کو اہم بنا دیتی ہے۔ اگر ہم ایک جملے میں ان دونوں سفرناموں کا موازنہ کرنا چاہیں تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ "افق تا بہ افق" خارجی صورت حال کو نمایاں کرتا ہے' جب کہ "ایران میں چودہ روز" مصنف کے باطنی سفر کو سامنے لاتا ہے۔

ناول

⊛ ناول

آغا سہیل کے ناول

ڈاکٹر خالد اشرف

آغا سہیل کے ناول

ڈاکٹر خالد اشرف

یہ مضمون ڈاکٹر خالد اشرف کے مطبوعہ مقالے "برصغیر میں اردو ناول" سے ترتیب دیا گیا ہے۔ راقم کو مصنف کے بعض خیالات سے جزوی اور بعض سے مکمل طور پر اختلاف ہے۔ (مرتب)

ادب زندگی کا ایک شعبہ ہے اسی لئے زندگی کے مقصد سے ہٹ کر ادب نہ اپنی منزل حاصل کر سکتا ہے اور نہ یہ ممکن ہے۔ ایک انسان اور ایک ادیب کے فرائض و مقاصد یکساں اور مشترک ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ادیب اپنے ماحول کی ترجمانی کرتا ہے جبکہ عام انسان اس سے متاثر ہوتا ہے۔ ادب انسانیت کا نقاد ہے' وہ اس کی کجرویوں کو ظاہر کرتا ہے اور اس کی خام کاریوں کو بے نقاب کرتا ہے۔ اس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انسان کی حیات مستعار کو دائم و قائم بنائے۔ ادب کی بے کلی اور تڑپ اس لئے ہے کہ آدمی کو سمجھائے کہ وہ حالات کا غلام نہیں بلکہ حالات اس کے غلام ہیں۔ وہ آدمی کو بتلانا چاہتا ہے کہ وہ آپ اپنی زندگی کا مالک ہے اور اسے جس روش پر چاہے لے جا سکتا ہے۔ اس لحاظ سے ادب تغیر پسند قدامت شکن اور دور جدید کا پیش رو ہے۔ آج کے سماج کے حالات پہلے کے سماج سے زیادہ پیچیدہ اور مختلف ہیں۔ آج بھی ہمارا گردو پیش مختلف مسائل سے دوچار ہے۔ سماجی زندگی کا ہر ایک شعبہ شدید قسم کی عدم ہم آہنگی سے معمور ہے انسان اور اس کی محبت کی بے قدری ہمارے نظام کی پہچان ہے۔ کمزوروں اور بے شناخت و بے نام عوام اور پس ماندہ طبقات پر عرصہ حیات روز بروز تنگ ہوتا جا رہا ہے۔ انصاف' صداقت' انسان دوستی' مساوات اور بھائی چارہ جیسی قدریں ناپید ہیں اور نام نہاد رہنماؤں اور دانشوروں کے نعرے اور دعوے جھوٹ کا پلندہ بن کر رہ گئے ہیں۔ فکر و عمل کے درمیان اس قسم کی تفریق موجودہ نظام کا ناگزیر نتیجہ ہے تقریباً ہر سماج دوئی کے شکار ایسے

معاشرے میں یکسوئی' توازن اور اعلی تصورات کی بارآوری کی توقع کم رہ جاتی ہے۔ ایسی صورت حال میں ادیبوں اور شاعروں کا ایک گروہ نا امیدانہ رویوں پر قناعت کو ترجیح دیتا ہے اور دوسرا پسپائیوں اور عدم مساوات کے درمیان اپنی آنکھیں کھلی رکھتا ہے' اپنے قلم کو اپنے ضمیر کی آواز کی تشہیر کے لئے استعمال کرتا ہے اپنے شدید احساس پر وقت اور سماج کی مخالفانہ قوتوں کی اذیت ناکی کو جھیلتا ہے لیکن وہ سماج کی تبدیلی کا طلب گار ہوتا ہے کہ تبدیلی زندگی کی فطرت اور مزاج ہے۔ اس طبقہ کے تخلیق کاروں کی اپنے عہد کے سماجی حقائق اور مثبت انسانی اقدار سے وابستگی اٹوٹ ہے انہوں نے ایک بورژوا نیم جاگیردارانہ و نیم سرمایہ دارانہ معاشرے میں علامدگی کے فن کو قبول نہ کر کے خود کو اس طبقہ سے وابستہ کیا ہے جو مسلسل ناانصافی محرومی' تنگ دستی اور جبر و تشدد کا شکار ہے۔ وہ طبقہ جس کی خودی اور خودداری شکست و ریخت سے گزرتی ہے۔ اناروز پامال کی جاتی ہے اسے نہ اپنے آپ کو دریافت کرنے کا حق ہے نہ اپنے تشخص ذات کو منوانے کی اجازت۔ سماجی ذمہ داریوں کو سمجھنے اور ادب کو سیاست کے محسوس و غیر محسوس جبر کے خلاف ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کرنے والے ادیبوں نے اسی پامال اور محکوم طبقے کا دفاع کرنے کے لئے اپنی تخلیقات اور تحریروں کو استعمال کیا ہے۔ آج کا یہ سیاسی اور سماجی طور پر باشعور ادیب جس کو "کمٹیڈ ادیب" کہا جاتا ہے' یہ حقیقت بخوبی جانتا ہے کہ چاہے وہ برطانوی لبرل ازم پر قائم ہندوستانی جمہوریت ہو پاکستانی طور پر مذہب پرست فوجی آمریت ہو' ان بیمانہ حکومتوں کے مظالم' جبر و استحصال اور بشریت کش ریاستی نظام کے خلاف جہاد کرنا اس کا فرض منصبی ہے۔

ڈاکٹر آغا سہیل کا ناولٹ "غبار کوچہ جاناں" نظریاتی ناولٹ ہے۔ آغا سہیل نقاد ہونے کے علاوہ افسانہ نگار بھی ہیں اور ترقی پسند فکر و تحریک سے عملی طور پر وابستہ ہیں۔ قصے کا ہیرو جاوید شاید خود مصنف کی شخصیت کا عکس ہی ہے۔ وہ دو قومی نظریے میں یقین نہیں رکھتا اور لیگ کی رجعت پسندی اور تنگ نظر سیاست کے خلاف ہے۔ وہ مشترکہ ہندوستانی تہذیب کی پیداوار ہے اور متحدہ ہندوستان کا حامی ہونے کی بنا پر پاکستان کے قیام کو غیر فطری مانتا ہے۔

"میں ہندوستانی مسلمان کو الگ قوم تصور نہیں کرتا جس بنیاد پر
یہ ملک بنا ہے وہ جذباتی ہے اور جذبات ٹھنڈے ہوتے ہی خود
پاکستان میں لوگوں کو اپنی غلطی کا احساس شروع ہو گیا ہے۔ ایک
پنجاب کے دو پنجاب اور ایک بنگال کے دو بنگال......... بھلا
یہ بھی کوئی تقسیم ہے' کتنی غیر فطری جس نے لسانی وحدتوں اور
صوبائی کلچر کو تقسیم کر دیا ہے وہ کس قدر غیر دانشمندانہ تقسیم ہے۔
یہ قطعی اضطراری ہے۔ لاٹھی مارنے سے پانی جدا نہیں ہوتا
صرف وقتی طور پر پھٹتا ہے"

(غبار کوچہ جاناں لاہور ۱۹۶۷ء ص ۱۴)

اپنے ان نظریات کے باوجود تقسیم کے بعد ہندوستان میں کچھ اس طرح کے واقعات پیش آتے ہیں کہ جاوید کو مجبوراً پاکستان میں پناہ لینی پڑتی ہے اور وہ بھی مفاد پرست مہاجرین کے سماج کا ایک حصہ بن جاتا ہے۔

آغا سہیل کا دوسرا ناول "کہانی عہد زوال کی" (۱۹۹۱ء) برصغیر کے غیر ترقیاتی یافتہ انسان دشمن معاشرے کی استحصالی جہات کو سامنے لاتا ہے۔ ناول کا مقاماتی کینوس لکھنؤ لاہور اور لندن کے شہروں پر محیط ہے۔ مصنف نے ہندوستان اور پاکستان دونوں کے حکومتی نظام کے پس پردہ چلنے والی غیر جمہوری روایات اور عوام دشمن فضا کو آشکار کرتے ہوئے واضح کیا ہے کہ حریت پسندوں اور استحصال مخالفین کی شخصیت اور اتحاد کو پارہ پارہ کرنے کے لئے ہر دو ممالک کے سیاسی قائدین نے بدعنوان بیورو کریسی کے تعاون سے اب بنیاد پرستی Fundamantalism کے تازہ ترین ہتھکنڈے کو استعمال کرنا شروع کیا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ پاکستان میں نظام مصطفےٰؐ کا نفاذ اور ہندوستان میں فرقہ وارانہ احیا دونوں ایک دوسرے کے مخالف ہونے کے باوجود ایک دوسرے کو مستحکم بھی کرتے ہیں اور یہ بھی سچ ہے کہ برصغیر میں ان دونوں شکلوں میں سیاست اور مذہب کی اس آمیزش نے

مساوات ' معاشی عدل اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے انسانی اصولوں کو نقصان ہی پہنچایا ہے

اس ناول کی ایک اور سطح بھی ہے۔ وہ یہ کہ پہلی دنیا کے ترقی یافتہ سرمایہ دار ممالک تیسری دنیا کے ممالک میں اپنے ایجنٹوں اور گماشتوں کے ذریعے جس طرح معاشی لوٹ کھسوٹ کے ساتھ انسانی حقوق اور آئنی تحفظات غصب کر رہے ہیں ان عوامل کو بھی یہاں موضوع بنایا گیا ہے۔ مصنف چونکہ ترقی پسند خیمہ فکر سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے واقعات اور عوامل کو سمجھنے اور ان کا تجزیہ کرنے کا ان کا ایک سائنٹیفک مارکسی نقطہ نظر ہے۔ اسی نقطہ نظر سے آزادی سے قبل کے زوال زدہ مسلم لکھنؤی معاشرے کا تجزیہ کیا گیا ہے جس میں کوتاہ بینی کوتاہ اندیشی اور جہالت و بے عملی کی بنا پر وقت کے ساتھ ساتھ زندہ رہنے اور آگے بڑھنے کی قوت ارادی ہی ختم ہو گئی تھی۔

برصغیر کے اس انسان کش اور فرد دشمن معاشرے میں کچھ کردار ایسے بھی ہیں جو پسماندہ طبقات کے معاشی و انسانی حقوق کے حصول کے لئے جدوجہد کرنا اور ان کی حمایت میں سوچنا اور آواز اٹھانا اپنا دانشوارانہ فرض سمجھتے ہیں اور اس بنا پر ان کو تا عمر ہر طرح کے نقصانات اٹھانے پڑتے ہیں۔ جاوید اور رشیدے دو ایسے ہی آورش وادی نوجوان ہیں جن کے پاس تیسری دنیا کے دبے کچلے مظلوموں اور استحصال زدہ طبقوں کو جبر اور مظالم سے نجات دلانے کے لئے ایک بڑا VISION ہے ' لیکن ان کے مخالف سرمایہ داری ' جاگیرداری ' سیاست اور بیوروکریسی کی اجارہ داری قوتیں ہیں جن کو ہر طرح کی جمہوری تحریکات اور انسانی مساوات کے جمہوری تصورات کے فروغ سے اپنے طبقے کے مفادات کے مجروح ہونے کا خدشہ لاحق رہتا ہے۔

جاوید ایک وطن پرست ہندوستانی نوجوان ہے جو تقسیم وطن کے بعد اس مسلم معاشرے کا تعلیم یافتہ و حساس شہری ہے جو افلاس اور فرقہ واریت کا شکار ہے۔ جاوید کے اہل خاندان اپنے مستقبل کو بہتر و محفوظ بنانے کے لئے پاکستان ہجرت کر جاتے ہیں اور وہاں جا . ناجائز طریقوں سے راتوں رات دولت مند اور معزز ہو جاتے ہیں۔ یہ لوگ جاوید کے ساتھ بھی اپنی معاشی خوشحالی اور مادی آسائشوں کو بانٹنا چاہتے ہیں لیکن جاوید جو دو قومی

نظریے کا مخالف اور مشترکہ ہندو مسلم کلچر کا حامی ہے' پاکستان سے کسی طرح کی ذہنی مطابقت نہ رکھنے کی بنا پر ہجرت کرنے پر راضی نہیں ہوتا۔ جاوید تن تنہا مصائب کا مقابلہ کر رہا تھا کہ ہند پاکستان جنگ کے دوران اس کو بہت سے بے گناہ مسلمانوں کے ساتھ مشتبہ سمجھ کر حراست میں لے لیا جاتا ہے۔ جنگ ختم ہونے پر اسے ہندوستانی فوج کے سپاہی ایک دن سرحد کے پار دھکیل دیتے ہیں اور جاوید جو ہندوستان میں مختلف مسائل کا شکار تھا یک بیک پاکستانی شہری بن جاتا ہے۔

لیکن جاوید نے دیکھا کہ پاکستان میں جاگیرداروں' سرمایہ داروں اور سیاسی رہنماؤں نے مذہب کو حصول اقتدار کے لئے استعمال کر کے سارے معاشرے کو فرقہ وارانہ طور پر تقسیم اور باہم متصادم کر دیا تھا۔ مذہبی قوانین کی آڑ میں سیاسی آزادی اور انسانی حقوق کی لڑائی لڑنے والوں کی صفوں کو توڑا جا رہا تھا۔ اور جیل خانوں اور کوڑوں کی اذیتیں دے کر حریت پسندوں کے Morale کو پست کیا جا رہا تھا۔ دوسری طرف منشیات اور اسلحہ کو فروغ دے کر چند مجرمین معاشرے کو ایسی ذہنی و جسمانی بیماریوں کا شکار بنا رہے تھے جن کا علاج ممکن نہیں تھا۔ جاوید نے مشاہدہ کیا کہ مذہب کے نام پر وجود میں آئے اس نام نہاد اسلامی معاشرے میں سیاست 'مذہب' اور جرائم اس طرح شیر و شکر ہو کر عوامی ذرائع کی لوٹ کھسوٹ میں غرق تھے کہ معاشرے میں کسی خوددار' حساس اور انسان دوست مفکر کے لئے گنجائش ہی نہیں بچی تھی۔ جاوید اس تمام منفی صورتحال سے پریشان و مایوس ہو کر لندن چلا جاتا ہے جہاں وہ یکہ و تنہا زندگی بسر کرنے لگتا ہے۔ لندن جا کر اس نے دیکھا کہ ترقی یافتہ ممالک میں تیسری دنیا کے پسماندہ و غیر ترقی یافتہ ممالک کی لئے شدید نفرت اور تعصب کے جذبات موجود ہیں اور ان کے شہریوں کو جہالت افلاس اور پچھڑے پن کے اندھیروں سے نجات دلانے والا کوئی نہیں ہے۔

لندن میں جاوید کی ملاقات شیدے سے ہوتی ہے جو اس کی طرح حساس و دبے کچلے طبقوں کے تئیں دردمندی رکھنے والا انسان ہے شیدے چونکہ پاکستان میں اپنے خوابوں کو حقیقت کی شکل دینے کے لئے کاشتکاروں کی فلاح و بہبود اور زراعت کی ترقی کے لئے

عملی کام کر رہا ہے اس لئے وہ گاؤں کے کسانوں اور مزدوروں کی مدد سے ایوان حکومت میں پہنچ جاتا ہے۔ لیکن اپنے غیر روایتی افکار اور ترقی پسند پروگراموں کی بنا پر سارا Vested Interest اس کے خلاف متحد ہو جاتا ہے اور شیدے سے وزارت چھین لی جاتی ہے۔ وہ وزارت کے ذریعے عوامی فلاح و بہبود کے جن پروگراموں پر عمل پیرا تھا وہ ختم ہو جاتے ہیں اور ناول کے آخر میں وہ بھی جاوید کی طرح بے بسی کا شکار ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر آغا سہیل کا یہ ناول پاکستان اور ہندوستان کے معاشروں میں سیاست اور معیشت کی مایوس کن صورتحال کی نشاندہی کرتا ہے جہاں جرائم فرقہ واریت اور پسماندگی نے سارے انسانی سماج کو اپنی گرفت میں جکڑ رکھا ہے اور اس معاشرے میں مساوات اور انسانی قدروں کے لئے لڑنے والے چند سر پھرے دانشور تمام زندگی تنہائی، تنگدستی اور بے بسی کا شکار رہتے ہیں۔

گفتگو

⊛ گفتگو

آغا سہیل سے ایک ملاقات

ڈاکٹر حسن رضوی

آغا سہیل سے گفتگو

زاہد بشیر

آغا سہیل سے استفسار

طاہر مسعود

آغا سہیل سے چند باتیں

سعدیہ شفقت

ڈاکٹر آغا سہیل سے ایک ملاقات

ڈاکٹر حسن رضوی

س: آپ نے اپنی ادبی زندگی کی ابتداء کس صنف ادب سے کی؟

ج: افسانے سے' پہلا افسانہ تھا "راشی" جو "الوارث" بمبئی کے سیماب نمبر میں چھپا' غالباً ۱۹۳۸ء' ۱۹۳۹ء کا واقعہ ہے۔

س: افسانہ نگاری کی طرف کیسے مائل ہوئے؟

ج: داستانیں پڑھتے پڑھتے اور کہانیاں سنتے سنتے خود بخود افسانہ نگاری شروع کر دی' لیکن بہت جلد احساس ہوا کہ پریم چند' کرشن چندر' عصمت چغتائی' علی عباس حسینی' اعظم کریوی' سعادت حسین منٹو' راجندر سنگھ بیدی کے علاوہ گورکی' چیخوف' موپساں' او ہنری' ڈکنز ہیوگو' داستوفسکی وغیرہ کی بنائی ہوئی بھی ایک ایسی دنیا ہے جس میں کہانیاں اور افسانے موجود ہیں۔ بلکہ مغرب کے افسانے میں اولاً موپساں' بعد میں گورکی' چیخوف اور او ہنری نے تو مجھے ایسا جکڑا کہ مدتوں ان کے طلسم کا اسیر رہا۔

س: کیا ابتدائی دنوں میں لکھنؤ میں قیام کے دوران آپ کو وہ مقبولیت بحیثیت افسانہ نگار حاصل ہو سکی جس کے آپ مستحق تھے؟

ج: بہت زیادہ نہیں لیکن اتنی کم بھی نہیں' بہرحال ادبی حلقوں میں متعارف ضرور رہا۔

س: اب تک آپ کے افسانوں کی کون کونسی کتابیں شائع ہو چکی ہیں؟

ج: افسانوں کے تین مجموعے چھپ چکے ہیں۔ ۱۔ بدلتا ہے رنگ آسمان ۲۔ شہر نا پرساں ۳۔ تل برابر آسمان۔ شاید چوتھا مجموعہ بھی جلد آ جائے۔

س: آپ کی کہانیوں میں داستانوی انداز کے ساتھ کہیں کہیں علامتی اسلوب بھی ملتا ہے' اس کی کیا وجہ ہے؟

ج: روایتی کہانی میں میرا اسلوب شاید داستانی ہے اور افسانے کو چونکہ میں کہانی سے ذرا مختلف چیز سمجھتا ہوں۔ اس لئے غالباً۔ افسانے کے اسلوب میں علامت آگئی ہے' اس کی وجہ جو آپ پوچھتے ہیں تو غالباً۔ یہی ہے کہ میری کہانیوں میں کہیں نہ کہیں پر داستانوں کا اثر موجود ہے' یا لکھنؤ کے قدیم جاگیردارانہ نظام میں تہذیبی زندگی کے ایک آدھ حصے پر داستان کی صنف کا غلبہ ہے۔ اب آپ آر کی ٹائپ محرکات میں اس کے اسباب خود تلاش کرلیں۔ میں اپنے شعور' لاشعور' تحت الشعور' قبل شعور اور ماقبل شعور سے معروضی طور پر رجوع نہیں ہو سکتا۔ اگر باریک بین نقادوں کو کبھی ضرورت محسوس ہوئی تو یہ زحمت وہ خود ہی کرلیں گے' جہاں تک علامتی افسانے کا تعلق ہے' میں نے عملاً۔ یا از خود یہ اسلوب اختیار نہیں کیا' علامت خود ہی افسانے میں آگئی۔ اصل میں اسلوب خود بنایا نہیں جاتا بن جاتا ہے۔ ہاں کہانی کو میں خام مٹی سمجھتا ہوں۔ جس سے افسانے کا مطلوبہ ظرف تیار ہو جاتا ہے۔ بالکل ویسے ہی' جس طرح شاعر غزل میں شعر کہتا ہے اور شعر اپنی جگہ ایک اکائی' وحدت یا یونٹ ہوتا ہے' جو بجائے خود مکمل ہوتا ہے' لیکن اس کے اندر جو مفروضات ہوتے ہیں' وہی اس کی معنوی گہرائی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

س: کیا ایک افسانہ نگار گھٹن کے ماحول میں اپنی بات اپنے قاری تک پہنچا سکتا ہے؟

ج: جی ہاں! تخلیق اپنا راستہ خود بنالیتی ہے' بلکہ کبھی کبھی ایمائیت کے پیدا ہو جانے سے خوبصورتی پیدا ہو جاتی ہے۔

ع نالہ پابندِ نے نہیں ہوتا

یعنی جذبہ صادق شرط ہے' قاری بھی بہت سمجھدار اور تربیت یافتہ ہو چکا ہے۔

س: آپ کی ایسی کونسی کہانیاں ہیں' جن میں آپ وہ سب کچھ کہہ پائے ہیں' جو آپ کہنا چاہتے ہیں؟

ج: ابھی تک میں نے وہ کہانی لکھی ہی نہیں، جس میں وہ سب کچھ کہنے میں کامیاب ہوا ہوں، جو میں کہنا چاہتا ہوں، شاید یہ میرا فنی عجز ہو، یا

ع: کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لئے

کے مصداق مجھے کسی اور پیمانے کی تلاش ہو۔ پھر بھی میں اپنے ہر دور کے کسی نہ کسی افسانے اور کسی نہ کسی کہانی سے تھوڑا بہت مطمئن بھی ہوا ہوں۔ ایک اطمینان تو وہ ہے، جسے آسودگی کہتے ہیں اور جو لکھنے والے کو اس وقت میسر آتی ہے، جب وہ کہانی یا افسانہ لکھ لینے کے بعد خود اپنے آپ کو شاباش دیتا ہے۔ دوسری آسودگی وہ ہے، جو ذہین قارئین اور سمجھدار نقادوں کی پسندیدگی کی صورت میں فراہم ہوتی ہے۔

س: کیا اس عہد میں ترقی پسند تحریک کی تنظیم از سر نو ہونا چاہیے۔

ج: ہر اچھی تحریک کی تنظیم نو ہونا چاہیے، ترقی پسند تحریک نے تو اردو ادب کو بہت کچھ دیا ہے، بلکہ سرسید تحریک کے بعد اردو ادب کی نشاۃ الثانیہ اگر ہوئی ہے تو اسی تحریک کی بدولت ہوئی۔ میری ناچیز رائے میں ہم جو تیسری دنیا کے ممالک ہیں وہاں اس تحریک کی تنظیم از سر نو ہونا چاہیے۔

س: ترقی پسند تحریک نے ہمارے ماضی کے ادب اور آج کے ادب پر کیا اثرات مرتب کیے؟

ج: ماضی میں بھی زندگی آمیز ادب اس تحریک کی بدولت پیدا ہوا کہ قارئین اور مصنفین دونوں کے ذہنی افق کو وسیع کرنے میں اس تحریک نے نمایاں کردار ادا کیا۔ جن قوموں کا استعماریت نے استحصال کیا تھا، انھیں احساس دلانے، انھیں منظم کرنے اور مزاحمت پر آمادہ کرنے میں اس تحریک کا حصہ ہے۔ ترقی پسند کے نام سے بدکنے والے کون لوگ ہیں؟ ذرا آپ خود سوچیے، اگر استعماریت کے حاشیہ بردار، استحصال کنندہ عناصر کے قائم کیے ہوئے خان بہادر، رائے بہادر، خان صاحب، رائے صاحب کل پیدا ہوتے تھے اور سرکار والا تبار کے وفادار

اور خیر خواہ رہتے تھے۔ خطابات اور جاگیریں پاتے تھے تو آج بھی بڑے بڑے سرمایہ داروں کے ایجنٹ تیسری دنیا میں موجود ہیں۔ خود بھی استحصال کر رہے ہیں اور استحصال میں بالواسطہ یا بلاواسطہ مددگار بھی بن رہے ہیں۔ میری ان باتوں اور ان اشاروں کو آپ بھی سمجھتے ہیں قارئین بھی بخوبی جانتے ہیں' بلکہ ان کے اذہان میں ایسے تمام مکروہ چہرے موجود ہیں' جو خوبصورت نقابیں اوڑھ اوڑھ کر نمودار ہوتے ہیں اور مقدس نعروں کے پیچھے چھپ کر استعمار کے ہاتھ مضبوط کرتے ہیں۔ امریکہ جیسے متمول ملک میں جہاں فلک بوس عمارتیں موجود ہیں اور دن رات حسن برستا ہے' وہیں سلمز میں رہنے والی سیاہ فام مخلوق بھی موجود ہے' جس کا صدیوں سے استحصال ہو رہا ہے۔ لہٰذا تیسری دنیا افریقہ کے قحط زدہ علاقوں سے لے کر امریکہ کے ایوانوں تک پھیلی ہوئی ہے۔ انہیں منظم اور منضبط کرنے کے لئے آج بھی اس تحریک کو فعال بنانے کی ضرورت ہے۔ ادب میں جن لوگوں نے اس تحریک پر قدغن لگائے وہ عوام الناس کے بھی دوست نہیں اور جمہوری اقدار کے بھی ہمدرد نہیں' بلکہ صرف اپنے مفاد کی خاطر بک جانے والے عناصر ہیں۔ خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ بات ہو رہی تھی ادب کی ماضی کے ادب میں جمہوری اقدار اور جمہوری سوچ کی ترویج اور اشاعت میں آمریت' کلاسیت' تمرد اور آمریت کے خلاف احساسات' خیالات' افکار اور نظریات پیدا کرنے میں اس تحریک نے بڑا کام کیا بلکہ بھائی حسن رضوی ہمارا آپ کا پیغمبر بھی اللہ کی طرف سے انقلابی دین لے کر آیا تھا اور انسان پر انسان کی حاکمیت اعلیٰ کے خلاف انسان پر اللہ کی حاکمیت اعلیٰ قائم کرنا چاہتا تھا۔ ابوجہل پڑھا لکھا آدمی تھا لیکن ابوجہل صرف اس لئے بنا کہ وہ اللہ کی حاکمیت اعلیٰ کے خلاف تھا۔ انسان پر انسان کی حاکمیت اعلیٰ چاہتا تھا۔ ایسے ہی تنگ نظر' برخود غلط اور کم سواد عناصر کے خلاف اقبال نے کہا تھا۔

شعر

آئین نو سے ڈرنا' طرز کہن پہ اڑنا

منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

اب اگر آپ بلحاظ نظم و نثر تمام اصناف کا جائزہ لیجئے تو آپ کو ترقی پسند ادب کی تحریک نہایت محکم اور شاندار نظر آئے گی' اسالیب میں بھی اور مواد میں بھی اردو ادب کو انسانی ذہن کو رومان کے دھندلکوں سے نکال کر حقائق کی سرزمین پر سوجھ بوجھ کے سورج کی روشنی میں چلنا سکھایا' یہ محض شاعرانہ جملہ نہیں اظہار حقیقت ہے

س: کیا ادیب یا شاعر کو وقتی تقاضوں کے مطابق مصلحت اندیشی اختیار کرنی چاہئے؟

ج: وہ شخص ادیب نہیں ہے' جو وقت کے فرعونوں اور یزیدوں کے ہاتھوں بیعت کرتا پھرتا ہے اور بزعم خویش شاعر یا ادیب بنتا ہے۔ ادیب اور شاعر تو قوم کا ضمیر ہوتے ہیں اور اپنے وقت کے موسیٰ' ابراہیم اور حسین ہوتے ہیں۔ مصلحت چہ معنی دارد' مصلحت کا لفظ شاعر اور ادیب کی لغت میں آجائے تو ادب سے اس کا نام خود بخود خارج ہو جاتا ہے۔ خواہ اپنی پی آر او کا وہ سارا زور کیوں نہ لگا دے۔ آنے والے کل کے صحیفے میں اس کا نام زندہ رہنے والوں میں بھی نہیں لکھا جائے گا' زندہ لفظ وہی لکھتے ہیں' جو خون دل میں انگلیاں ڈبوتے ہیں۔

س: ہمارے یہاں کے ایسے کونسے ادیب اور شاعر ہیں' جو اپنے نظریات کے برعکس مصلحت اندیشی اختیار کر لیتے ہیں؟

ج: وہی جو دار و رسن سے ڈرتے ہیں اور مفاد کے لئے خود کو' اپنے ضمیر کو اور ملک و قوم کو فروخت کر دیتے ہیں۔ انہیں کی نسبت لکھا جاتا ہے تاریخ میں:

"قوے فروختند وچہ ارزاں فروختند"

س: پاکستان میں تخلیق پانے والے مزاحمتی ادب کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

ج: اچھا اور جاندار ادب ہے' ہماری تاریخ کا زندہ اور پائندہ حصہ ہے' بلکہ یہی ادب وہ آبرو ہے جو مستقبل کی تاریخ میں پاکستان کے باشندوں کو معزز اور

محترم بنائے گا اور نہ کوئی قابل ذکر صنعت ہے' نہ کوئی تمول اور نہ اعلیٰ اقدار حیات' ہماری غزل' ہمارے افسانے' ہمارے ناول اور نظم میں وہ جاندار سرمایہ محفوظ ہے' جس میں کم از کم ہمارا ضمیر زندہ ہے۔

س: ہمارے ایسے کونسے شعراء ہیں' جو مزاحمتی شاعری تخلیق کر رہے ہیں؟

ج: فیض احمد فیض کے بعد بھی ایک اچھی اور معقول کھیپ کی کھیپ نظر آتی ہے۔ نام گنواؤں گا تو دفتر بنز جائے گا' مختصر یہ کہ وہ تمام تخلیق کار جو اسٹریم آف کانشس کو دریافت کر کے پوری دیانت کے ساتھ دوسری نسلوں تک اسے منتقل کرنے میں کامیاب ہو رہے ہیں' وہی قابل ذکر ہیں ان کا فن اور ان کا اسلوب ثانوی ہے کہ بجائے خود فن جذبہ صداقت کے بغیر جسد بے روح ہے۔

س: پاکستان اور بھارت میں تخلیق پانے والے اردو ادب کی مختلف اصناف ہیں کون سی قدریں مشترک ہیں اور کن کن باتوں میں آپ فرق محسوس کرتے ہیں؟

ج: ہندوستان میں تحقیق و تنقید کا پلہ بھاری ہے' ہمارے ہاں تخلیق کا۔ ہم تخلیق کے انبار لگاتے چلے جا رہے ہیں' وہ تحقیق و تنقید کے دفتر تیار کر رہے ہیں۔ نوع بشر اور اس کی جبلت ایک ہے اور اس کے حوالے سے جہاں تخلیق ہو گی' وہاں آفاقی صداقت ہو گی۔ اس میں کوئی تقسیم اور تخصیص نہیں ہے البتہ تہذیبی' ثقافتی' لسانی تفریق کے حوالے سے کہیں کہیں رنگوں کا فرق ہے' جو ناگزیر ہے' البتہ یہ بات ضرور ملحوظ رکھنا چاہئے کہ بھارت میں اردو ادب کی زندگی کے دن گنے چنے رہ گئے ہیں کہ نئی نسل کا ذریعہ اظہار اردو ادب نہیں رہا نیز یہ کہ اردو زبان اس اعتبار سے وہاں سکڑ اور سمٹ رہی ہے کہ سکولوں اور کالجوں میں قریب قریب ختم ہو چکی ہے۔ یونیورسٹیوں اور اکیڈمیوں میں جس حد تک باقی ہے' وہ چند پرانے نام لیواؤں کے سبب باقی ہے۔ جب یہ باقیات الصالحات بھی باقی نہ رہیں گے تو اردو کے مزاروں پر چند مجاور رہ جائیں گے' جن کی روٹیاں اجداد کی کمائی پر کچھ دن چلتی رہیں گی اردو کے ضمن میں

ہندوستان جیسے وسیع و عریض جمہوری ملک میں یہ حقیقت آج چالیس سال بعد سامنے نہیں آئی ہے بلکہ باقاعدہ احیائی ذہنیت کے تحت منظم منصوبہ بندی کا نتیجہ ہے۔ انگریزی استعمار نے فارسی کو کہ قومی ملی اور ثقافتی زبان تھی' برصغیر سے ہٹا کر مشرق وسطیٰ اور برصغیر کے مابین قائم شدہ ایک مضبوط پل کو توڑا تھا اسی طرح ہندوستان کے زعما نے برصغیر کے مابین قائم شدہ ثقافتی پل اردو کو ہٹا کر توڑنے اور اپنا تشخص قائم کرنے کی فکر میں بین العلاقائی روابط کو ختم کر دیا ہے۔ اس کا یہ ہرگز مطلب نہیں کہ اردو شاؤنزم کے نتیجے میں علاقائی زبانوں اور علاقائی ثقافت کا استحصال کیا جائے' ہرگز نہیں' بلکہ اس پل کو باقی رکھنے کے لئے ہندوستان کے ارباب حل و عقد کو کشادگی' نمادگی' وسیع الظرفی اور وسیع النظری کا ثبوت دیتے ہوئے اردو بولنے والوں کو باقی رکھنا چاہئے تھا' لیکن اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ ہندوستان میں اردو کے بلیک وارنٹ پر دستخط ہو چکے ہیں اور پلوں کے نیچے سے کافی پانی بہہ چکا ہے۔ لہٰذا وہاں کا تخلیق کار کسی طرح بھی نہ خود کو محفوظ سمجھتا ہے' نہ اپنے ادب کو' چنانچہ فطری طور پر تخلیق کے بجائے تحقیق پر لگ گیا ہے' تاہم بعض بعض علاقوں میں جو ادب تخلیق ہو رہا ہے' وہ اس تناظر میں اہم ہے کہ قابل لحاظ اکثریت کے مقابلے میں اقلیت تنازع للبقا کی جنگ لڑ رہی ہے۔ مزاحمت اور مدافعت بھی کر رہی ہے۔ تخلیق کے میدان میں وہی ادب زندہ ہے اور اپنا تشخص قائم کر رہا ہے' جو صداقتوں کی ترجمانی کر رہا ہے۔ پاک و ہند دونوں میں تخلیق کا منظرنامہ تسلی بخش ہے۔

س: بھارت کے مقابلے میں ہمارے یہاں تحقیق کی ضرورت ہے؟

ج: ہم سہل نگار قوم ہیں' محنت سے بھاگتے ہیں۔ تحقیق و تدقیق جیسے جان جوکھوں کے کام میں نہیں پڑتے۔ تحقیق کرتے بھی ہیں اور تحقیق شدہ دوسرے درجے کی چیزوں پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ کنویں کے مینڈک ہیں یا بسم اللہ کے گنبد میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ چالیس سال میں تحقیق و تدقیق کے نام پر ہم نے کیا کچھ نہ

ہے۔ ہندوستان میں چونکہ تنازع للبقا کی جنگ جاری ہے اور سخت مقابلہ ہے' اس لئے تحقیق کا کام نہایت مستعدی اور استواری سے جاری ہے۔ ہمارے یہاں صرف وزیر الحسن عابدی جیسا عالم محقق و مدقق پیدا ہوا تھا۔ جسے ہم نے اپنی ناقدری سے ضائع کر دیا یا باقی چھٹ بھیوں میں دال بھات بٹا کرتی ہے اور ہم تماشا دیکھا کرتے ہیں۔ ویسے پاک و ہند میں بابائے اردو مولوی عبدالحق' قاضی عبدالودود' ڈاکٹر جمیل جالبی' ڈاکٹر محمد حسن' ڈاکٹر گوپی چند نارنگ' ڈاکٹر گیان چند جین' ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی' مالک رام مرتضیٰ حسین فاضل' ڈاکٹر نیر مسعود' ڈاکٹر شارب ردولوی اور کاظم علی خان وغیرہ جیسے بزرگوں نے بہت کچھ کام کیا ہے اور بہت کچھ کام کر رہے ہیں۔

س: آپ بطور افسانہ نگار کس کس افسانہ نگار سے متاثر ہوئے؟

ج: ابتداء ہی میں اس بات کا ذکر آچکا ہے' تکرار کی ضرورت نہیں۔

س: کیا کسی شاعر اور نقاد نے بھی آپ کو متاثر کیا؟

ج: نقادوں میں تو میرے استاد احتشام حسین تھے اور شاعروں میں غالب سے متاثر ہوں۔

س: وارث' علوی اور انیس ناگی بحیثیت نقاد کیسے لگتے ہیں؟

ج: اچھے لگتے ہیں' دونوں محنتی اور سمجھدار لوگ ہیں' البتہ وارث علوی نے جب سے ٹریک بدلا ہے اور حتمی انداز میں' جزئیات میں مصروفیت کے نام پر ذاتی تاثراتی نقد و نظر کو داخل کر کے محمد حسن عسکری' سلیم احمد وغیرہ کے اتباع میں فقرے بازی شروع کی ہے' مجھے زیادہ معتبر نظر نہیں آتے۔ انیس ناگی محنتی نقاد ہے۔ وسیع النظر بھی ہے اور وسیع المطالعہ بھی' اسے ہمدردی اور محنت سے پڑھنے کی ضرورت ہے اور وہ جو کچھ کہتا ہے اس کا اپنا کہنے کا طریقہ ہوتا ہے۔ لوگ طریقے سے بدکتے ہیں' اس کی گہرائی میں نہیں جاتے' تاہم آپ انیس ناگی سے جزوی اختلاف کر سکتے ہیں' وہ خود بھی اس کی اجازت دیتا ہے' لیکن اسے رد

نہیں کر سکتے کہ اس کی بصیرت اور آگہی کا کرشمہ دامن دل کو پکڑ لیتا ہے کہ جا اینجاست۔

س: کیا بڑا ادیب یا شاعر بننے کے لئے کسی خاص ادبی گروہ سے وابستگی ضروری ہے اور یہ فرمایئے کہ آپ کا تعلق کون سے ادبی گروہ سے ہے؟

ج: میں ادب میں گروہ بندی کا مطلقاً قائل نہیں ہوں اور نہ اس مقصد کے لئے کسی خاص گروہ سے منسلک ہونے کی ضرورت ہے' کیونکہ جب آپ گروہ کا صیغہ استعمال کرتے ہیں تو ہر گروہ کے کچھ نہ کچھ مفادات ہوتے ہیں اور مفادات کے لئے استعمال کرنا یا استعمال ہونا ایسے لوگوں کا مقدر ہوتا ہے۔ استعمال کرنا بھی استحصال ہے اور استعمال ہونا کمزوری اور عجز ہے لیکن اگر کوئی اعلیٰ نصب العین رکھنے والی منظم تحریک ہے تو وہ گروہ کی تعریف سے خارج ہے۔

س: ایک زمانے میں آپ کشور ناہید گروپ کے بہت قریب تھے اور پھر اس کے بعد فاصلے بڑھتے چلے گئے' اس کی کوئی خاص توجہ؟

ج: آپ نے پھر کشور ناہید گروپ کا صیغہ استعمال کیا ہے' جسے میں تسلیم نہیں کرتا۔ رہا کشور کے قریب آنے یا دور بھاگنے کا مسئلہ' سو یہ ہے کہ اس میں افراط و تفریط کبھی نہیں رہی' نہ میں کشور سے بہت قریب تھا' نہ اب بہت دور ہوں' دوستی میں' میں حفظ مراتب کا ہمیشہ سے قائل ہوں۔ کشور میری کل بھی دوست تھی' آج بھی مجھے عزیز ہے' اس کی شاعری بھی مجھے پسند ہے اور شاعرانہ اسلوب میں بے باکی اور دیانتداری بھی اچھی لگتی ہے' نیز یہ کہ اپنی نسل کی اچھی پڑھی لکھی شاعرہ ہے' جس کا ذہنی افق نہایت وسیع ہے اور اردو کے ترقی پسند شاعروں میں اسے اچھا سمجھتا ہوں' کل بھی سمجھتا تھا اور جب تک اس سے بہتر شخصیت کی کوئی دوسری شاعرہ مجھے نظر نہیں آتی' آئندہ بھی سمجھتا رہوں گا' یہ میری دیانتدارانہ رائے ہے اور ریشنل سوچ' اس میں نہ رومان ہے' نہ جذبات نہ ہیرو ورشپ کہ اب میں اس عمر سے آگے نکل چکا ہوں۔

س: آپ اب تک کن کن سفرنامہ نگاروں سے متاثر ہوئے اور کیوں؟

ج: احتشام حسین' ساحل و سمندر' اپنے ہم عصروں میں مستنصر' عطاء' کاظم' رام لعل اور اختر۔

س: آپ کی بعض تحریروں کو پڑھنے کے لئے ڈکشنری کی ضرورت پیش آ جاتی ہے' کیا یہ مشکل پسندی شعوری طور پر اختیار کر رکھی ہے؟

ج: میں جس زبان میں جس طرح سوچتا ہوں' اسی طرح بولتا اور لکھتا ہوں کہ زبان میں نے کتابوں' لغتوں اور تحریروں سے نہ سیکھی۔ میری زبان میرے عمرانی پس منظر سے تعلق رکھتی ہے۔ میری زبان سے لغت مرتب ہو سکتے ہیں' میں لغت کا تابع نہیں ہو سکتا' آپ جس مشکل کا ذکر کر رہے ہیں۔ یہ ایک ایسا انقلابی تغیر ہے' جس کے سبب ہمارے معاشرے سے بولنے والی زبان رخصت ہو رہی ہے اور اخباری زبان بولی جا رہی ہے کہ ہم روز بروز کاروباری ہوتے جا رہے ہیں اور کاروباری زبان میں گفتگو کرنے لگے ہیں' زبان کا ایک تہذیبی' ثقافتی اور ثقہ ادبی پس منظر بھی ہوتا ہے۔ جو بدبختی سے مجھے میسر آیا اور میری زندگی کا حصہ بنا۔ اب نہ تو میں اس حصے سے علیحدہ ہو سکتا ہوں' نہ یہ حصہ مجھ میں واقع ہے تو مجھے افسوس ہے' لیکن اظہار مافی الضمیر کے لئے' نیز تفہیم کے دائرے میں وسعت کے لئے الفاظ ضروری ہیں بلکہ غالب کے الفاظ میں عاجزانہ طور پر بھی یہ کہوں تو لوگ تعجیز اور تعلی سمجھیں گے' مگر ہے حقیقت کہ:

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے
جو لفظ کہ غالب میرے اشعار میں آوے

س: آپ کے نزدیک آپ کی پہچان بحیثیت افسانہ نگار ہونی چاہئے یا بحیثیت نقاد؟

دونوں حیثیتوں میں' میں دونوں کا بیک وقت اسیر بھی ہوں اور طالبعلم بھی۔ ہر شخص ایک بند مکان ہے' اس میں جتنے چاہو دروازے بنالو' سو میرے لئے اظہار کے یہی دو راستے ہیں۔

ڈاکٹر آغا سہیل

(ایک ماہر تعلیم اور ادیب - آغا سہیل سے گفتگو) زاہد بشیر

۶ جون ۱۹۳۲ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ایم اے تک تعلیم لکھنؤ یونیورسٹی سے حاصل کی۔ ڈاکٹریٹ کی ڈگری پنجاب یونیورسٹی سے لی۔ اور ایف سی کالج لاہور میں گذشتہ تیس سال سے درس و تدریس سے وابستہ ہیں۔ اس سے پہلے وہ پشاور میں بھی رہے اور بھی کئی شہروں میں رہے لیکن تقریباً تیس سال ہو گئے کہ وہ یہیں لاہور میں ہیں اور ایف سی کالج میں پڑھا رہے ہیں ابھی تک ان کی جو کتابیں آئی ہیں ان میں افسانوں کی چار کتابیں ہیں اور کچھ مقالات ہیں۔ کچھ خاکوں کے مجموعے ہیں اور کچھ لسانیات پر کام کیا ہے۔ ان کا ڈاکٹریٹ کا تھیسس بھی چھپ گیا ہے۔ اس طرح کل چودہ کتابیں ابھی تک آ چکی ہیں کچھ معرض تحریر میں یا زیر تصنیف ہیں۔ گذشتہ دنوں پروفیسر ڈاکٹر آغا سہیل سے میری ملاقات ان کے گھر پر ہوئی۔ ان سے کچھ سوال و جواب کا سلسلہ چلا۔ جو درج ذیل ہے۔

سوال نمبر۱ آپ ادب کے میدان میں ایک مدت سے خدمات انجام دے رہے ہیں۔ آپ کے نزدیک کیا پاکستان میں ادیبوں کو وہ مقام حاصل ہے جو دوسرے ممالک میں ادیبوں کے لئے متعین ہے؟

جواب اول تو یہ کہ اس سوال میں کئی سوالات ہیں۔ پہلا حصہ اس کا یہ ہے کہ ظاہر ہے میں ۱۹۴۸ء میں میرا پہلا افسانہ چھپا تھا اور اس کے بعد سے مسلسل افسانے ہی کی صنف میں زیادہ تر انحصار کر رہا ہوں۔ اب جو آپ کے سوال کا دوسرا حصہ ہے کہ کیا آپ کے نزدیک پاکستان میں ادیبوں کو وہ مقام حاصل ہے جو دوسرے ممالک میں ادیبوں کے لئے متعین ہے۔ تو میرا جواب نفی میں ہے کہ نہیں حاصل ہے اور اس کے بہت سے اسباب ہیں۔ من جملہ ان کے ایک سبب یہ بھی کہ پاکستان میں ادب کا معاملہ فل ٹائم نہیں ہے۔ پارٹ ٹائم ہے اور سوائے مستثنیات کی کوئی شخص بھی ادب سے روٹی اور روزی نہیں کما سکتا

کوئی وکیل ہے کوئی ڈاکٹر ہے کوئی مدرس ہے اور اس صورت سے پہلے تو وہ اپنی روٹی کی فکر کرتے ہیں کما لیتے ہیں اس کے بعد پارٹ ٹائم ادب تخلیق کرتے ہیں۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ ہمارے ملک میں اولاً تو ادیب نہ پورے طور پر خدمت انجام دے رہا ہے اور نہ اس کو کوئی مقام حاصل ہو سکا ہے۔ دوسری چیز یہ ہے کہ ہمارا معاشرہ کئی اعتبار سے جعلی ہے اس میں بہت سے ادیب بھی جعلی ہیں اور جس کو ہم اعلیٰ درجے کی اور جعل تخلیق کر سکتے ہیں یا تصنیف کر سکتے ہیں وہ ہمارے سامنے نہیں آتی۔ اکثر کتابیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ تو سرقہ کی ہیں اکثر تحریریں ترجمہ ہیں یا آزاد ترجمہ ہیں اپنے اندر سے نکلی ہوئی کوئی چیز بہت کم سامنے آتی ہے تو اس لحاظ سے بھی ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارا جو ادیب ہے وہ صحیح معنوں میں COMITTED نہیں ہے نہ ادب سے SINCERE نہ زندگی سے نہ ملک سے اور نہ قوم سے۔ جب تک یہ تمام باتیں صحیح خطوط پر استوار نہ ہوں تو ہم اس کو صحیح تناظر میں دیکھ بھی نہیں سکتے تو میں یہ سمجھتا ہوں کہ ہمارا ادب بھی سوتا ہے ہمارا ادیب بھی GOMMITMENT کے لحاظ سے نہیں لکھ رہا ہے اور ظاہر ہے کہ یہی وجہ ہے کہ ہم عرصہ دراز سے اس بات کو تلاش کر رہے ہیں کہ کاش ہمارے ادب میں وہ گہرائی ہو اور دل کو پکڑنے والی باتیں اس کے اندر ہوں دماغ میں چمک بنانے والی باتیں اس میں ہوں اور اس میں فکر کا اور عقل کا عنصر ہو۔ ہمارے ادیب زیادہ تر کنویں کے مینڈک ہیں ان کا ذہنی افق جس کو آپ انگریزی میں HORIZON MENTAL کہیں گے۔ وہ بہت زیادہ وسیع نہیں ہے بہت محدود ہے اور اس کے بھی اسباب ہیں وہ آپ کے سامنے ہیں۔

سوال نمبر ۲ عام طور پر شکایت سنی جاتی ہے کہ بھارت اور پاکستان میں ناشر دوسرے مصنفین کی کتابیں شائع کر لیتے ہیں اور اصل مصنفین کو رائلٹی نہیں ملتی اس کا کوئی حل؟

جواب اولاً تو آپ نے یہ بات بالکل صحیح کہی یہاں کی کتابیں وہاں چھپ جاتی ہیں اور وقتی رائلٹی نہیں ملتی ابھی ایک دو سال پہلے آپ کو یاد ہو گا کہ قرۃ العین حیدر یہاں آئی تھیں ان کی آنے کی جہاں اور بہت سی وجوہ تھیں ان میں ایک بھی تھی کہ

کتابیں ہائی لائٹ ایڈیشن کے طور پر اور نقل کے طور پر ان کے یہاں چھپتی رہیں۔ وہ اس کی رائلٹی حاصل کرنا چاہتی تھیں۔ لیکن اس میں ان کو ناکامی ہوئی اور انہوں نے میرے اور کشور ناہید کے ذریعے سے اور کچھ دوسرے لوگوں کے ذریعے سے بعض ذمہ دار افراد سے ملاقاتیں کیں جنہوں نے کچھ امید بھی بندھائی لیکن بعض بہت با اثر افراد نے باقاعدہ منضبط طور پر اور ہمہ گیر طور کوشش کی کہ ان کو رائلٹی نہ دی جائے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ پھر اس طرح کے بہت سے کیسز نکل آتے۔ بہت سے ہندوستانی ادیب یہاں آتے اور کلیم کرتے کہ ہمارا بھی معاوضہ دلاؤ۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کا کوئی قانون دونوں ملکوں کے مابین موجود نہیں ہے اور اس کی وجہ سے دونوں کو ناکامی ہوتی ہے لیکن ایک خاتون ایسی بھی تھیں جن کا نام ہے جیلانی بانو۔ جب وہ آئیں تو اس وقت کی حکومت نے ان کی تھوڑی سی مدد کی اور کچھ ناشرین کو پکڑ کر ان کو کچھ معاوضہ دلا دیا اور واقعی ہماری بہت سی کتابیں وہاں چھپ جاتی ہیں ہم کو پتہ بھی نہیں چلتا اور وہاں جاکر یہ پتہ چلتا ہے کہ فلاں کتاب چھپ گئی ہے چونکہ یہاں پر کوئی قانون موجود نہیں ہے۔ نہ رائلٹی کا قانون یہاں موجود ہے نہ وہاں موجود ہے۔ اس لئے استحصال ہوتا ہے بے چارے ادیبوں کا اور ناشرین دھڑا دھڑ اس سے پیسے کماتے ہیں۔ یہ نہایت المناک اور افسوسناک بات ہے واقعی ہم اپنے ادیبوں کو جو ایک باوقار مقام ملنا چاہئے تھا ابھی تک نہیں دلا سکے اور ادیبوں کو گویا اس صورت سے آپ جانتے ہیں Expicit بھی کیا جاتا ہے۔ ان کا استحصال بھی ہوتا ہے اور ان کے حقوق کا تحفظ بھی نہیں ہوتا۔ سو یہ آپ نے بالکل صحیح کہا ہے۔ اس کا یہی حل ہو سکتا ہے کہ دونوں ملکوں کے مابین کوئی اس قسم کا معاہدہ ہو اور اس معاہدہ کے تحت ان کو رائلٹی ملنا چاہئے۔ ایک بات اور بھی ہے جو بہت افسوسناک بات ہے۔ میں آپ کی خدمت میں عرض کروں۔ غالباً 1966 یا 1967 کا زمانہ ہوگا۔ میرے پاس ایک صاحب اس ڈرائنگ روم میں آئے بیٹھے تھے اور ایک بہت بڑے پبلشر نے میری ایک کتاب چھاپی تھی۔ وہ صاحب ایک یورپی ملک سے تعلق رکھتے تھے۔ اسی اثناء میں میری کتاب آئی اور اس کی پانچ دس کاپیاں پبلشر نے مجھے بھیجیں یہ دیکھ کر انہوں نے مجھے کہا کہ ARE YOU A WRITER میں نے کہا: ——

OF COURSE I AM وہ کھڑا ہو گیا اور ایک دم اس نے مجھے سلیوٹ کیا۔ میں نے کہا کہ کیا اس میں کوئی EXTRA ORDINARY بات ہے اس نے کہا اب آپ لکھ پتی اور کروڑ پتی ہو جائیں گے۔ کچھ دن کے بعد آپ تو بہت بڑے آدمی بن جائیں گے۔ میں نے کہا کہ آپ اپنے ملک کی بات نہ کریں ہم تو بہت معمولی لوگ ہیں۔ بڑے لوگ تو آپ لوگ ہیں یہ ایک ہزار کتاب چھپی ہے ہماری اور اس ایک ہزار میں سے ہمارا معاوضہ ۱۵ فیصد کے حساب سے اس نے بہت زیادہ رکھا ہے۔ تو ہمارا یہ معاوضہ اتنا بنے گا جو اس کتاب کی قیمت ہے۔ اس کو بہت تعجب ہوا اور اسے افسوس ہوا تو اب آپ دیکھ لیں اور اندازہ کریں۔ کہ کتنا AMOUNT PETTI ہے جو کسی رائٹر کو ملتا ہے۔

سوال نمبر ۳ آپ کے نزدیک کیا آج کا پاکستانی ادیب پاکستان کے استحکام اور ترقی کے لئے اپنا فرض ادا کر رہا ہے؟

جواب یہ فرض اکثریت ادا نہیں کر رہی ہے اور اس کے بھی اسباب ہیں کہ کیا اس بیالیس تینتالیس سال کے عرصے میں ادیب کو پاکستان نے کچھ دیا۔ ان ادیبوں کو جنہوں نے پاکستان کی تعمیر اور تشکیل میں کوئی حصہ لیا تھا اس کی تعمیر میں ان کا خون لگا تھا انہیں کچھ نہیں ملا۔ جیسا کہ کسی نے کہا کہ منزل انہیں ملی جو شریک سفر نہ تھے۔ ہمارے ہاں جو بیورو کریٹس آتے رہے اور حکومت میں بھی حصہ بناتے رہے تعلیم میں بھی تدریس میں بھی ہر شعبے پر چھائے رہے اور ادیب کو کسی مقام پر بھی جو اس کا حق تھا نہیں ملا اور نہ ہی اس کو نمائندگی ملی تو ظاہر ہے کہ پاکستانی ادیب نے استحکام پاکستان کے لئے جو اس کو کرنا چاہئے تھا۔ وہ واقعی نہیں کیا۔ لیکن کچھ لوگ ایسے بھی تھے۔ جن کو آپ دیوانہ کہیئے سودائی کہیئے۔ لیکن ان کو وطن سے محبت تھی اور وطن سے بے پناہ محبت کے طور پر انہوں نے پاکستان کے لئے بہت کچھ کیا۔ انہوں نے بے نیاز ہو کر کتابیں لکھیں اور یہ سوچ کر کے لکھیں کہ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا رہا ہے۔ فردوسی کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ آپ کو معلوم ہے۔ فردوسی کے بعد بھی آنے والی بہت سی نسلیں شاعروں کی بھی۔ انشا پردازوں کی بھی۔ کی بھی۔ فلسفیوں کی بھی۔

مدبروں کی بھی۔ تاریخ دانوں کی بھی ایسی آتی رہی ہیں کہ جنہوں نے تمام باتوں سے بے نیاز ہو کر یہ کام کیا۔ بلکہ بعض دیوانے تو ایسے بھی تھے۔ مثلاً مجھے عرفی کے دو شعر یاد آ رہے ہیں کہ اس نے بے نیازی کے ساتھ اپنا کام جاری رکھا۔ ایک قصیدہ اس کا ہے۔ اس کا عنوان تو جو کچھ بھی ہو اس میں کہتا ہے کہ (ترجمہ) میری مفلسی سے امیروں کے دلوں میں داغ پڑ گئے ہیں۔ کیونکہ جو دولت میرے پاس علم' بے نیازی اور معرفت الٰہی کی ہے وہ ان امیروں کے پاس نہیں ہے۔ لہٰذا میری دولت کبھی ختم نہیں ہوگی اور ان کی دولت کو زوال آجائے گا۔ اس بناء پر میری مفلسی کے باوجود میرے پاس جو امارت ہے جو دولت ہے جو متاع بے بہا ہے۔ اس کو دیکھ کر ان امیروں کے دلوں میں داغ پڑ گئے ہیں اور میری بے نیازی اور بے مہری کی وجہ سے درہم کا منہ پیلا پڑ گیا ہے۔ تو اب آپ دیکھ لیں کہ اس طرح کے لوگ کم ہوتے ہیں۔

ایک صاحب مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ یونیورسٹی میں لائے گئے۔ ایران میں وہ کام کر رہے تھے۔ ایران کے لوگوں نے ان کے علم و فضل کی تعریف کی اور حکومت پاکستان کی بار بار توجہ ان کی طرف منعطف کرائی لیکن جس طرح سے وہ یہاں آئے تھے اور یہاں پچیس تیس سال ریڈر کی حیثیت سے کام کیا آخر تک وہ اسی حالت میں رہے۔ وزیر الحسن عابدی ان کا نام تھا ان کی کتابیں عالمی شہرت رکھتی ہیں اور یہاں اکثر لوگ جانتے ہی نہیں کہ وزیر الحسن عابدی بھی کوئی تھا۔ امیر خسرو پر انہوں نے یادگار کام کیا۔ جو عالمی شہرت رکھتا ہے۔ غالب پر ان کا فارسی کے حوالے سے جو کام ہے وہ تحقیق اور تخلیق میں بھی ایک مقام رکھتا ہے۔ لیکن اس عالم کی کسی نے بھی قدر نہیں کی۔ پھر بھی بے نیازی کے ساتھ وہ آخر تک کام کرتے رہے۔ وہ یہ سوچ کر کے کہ جیسا غالب نے کہا تھا "کہ میرے اشعار کی شہرت میرے بعد تمام روئے ارض پر پھیل جائے گی۔" اس وقت لوگوں نے اس کو نہیں سمجھا اور اس کی قدر نہیں کی لیکن اس کو پرواہ نہیں تھی ایسے لوگ بے نیازی سے کسی گوشے میں بیٹھے ہوئے تحقیق اور تخلیق کے میدان میں بھی کام کرتے رہے ہیں۔ مگر میں یہاں پر یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ تخلیق بہت بڑی قوت ہے بہت بڑی طاقت ہے۔ تنقید اور تحقیق کی

حیثیت وہی ہے کہ جیسے اعلیٰ درجے کے لوگوں کے پیچھے ہاتھ باندھے ہوئے غلام اور کنیزیں چلتی ہیں بالکل اسی صورت سے تخلیق کے پیچھے تنقید و تحقیق چلتی ہے لیکن وہ تحقیق بسا اوقات لوگوں کی نگاہ میں نہیں آئی کیونکہ جس طرح سے اور ہمارے فنکار سوڈو ہیں اور سوڈو معاشرے میں رہتے ہیں ہمارا نقاد بھی سوڈو ہے اور اکثر وہ یہ کرتا ہے کہ کوئی اچھا افسانہ نگار اور شاعر ابھرتا ہوا نظر آیا تو وہ اس کے کندھے پر چڑھ کر اپنا قد نکالنے کی کوشش کرتا ہے اور یہ نہیں سوچتا کہ اس کی اپنی کیا صلاحیت ہے اور اس کے لئے اسے کیا کرنا چاہئے۔ چونکہ آپ کو معلوم ہے کبھی نقاد کا کام یہ ہوتا ہے کہ اگر کوئی ٹائم گیپ آجائے اور ٹائم گیپ کی وجہ سے کسی کی تحریر کے سمجھنے میں معاشرے کو دقت ہو تو نقاد کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ اس گیپ کو دور کرے اور اس کے لئے تعلیم و تفسیر مہیا کرے کہ جس طرح سے کوستہ داوستہ پارسیوں کی ایک کتاب صدیوں چلتی رہی اور کئی صدیاں گزرنے کے بعد ان کی زبان سمجھی نہیں گئی تو اس کی تفسیر لکھی گئی۔ شرح لکھی گئی۔اور ٹائم گیپ آیا اس زبان کو بھی لوگ سمجھنے سے قاصر رہے تو اس شرح کی شرح لکھی گئی۔ اب اس گیپ کو دور کرنے کا فرض ہوتا ہے "نقاد" کا۔ لیکن اگر نقاد اپنے فرض کو نہ پہچانے اور صحیح طور پر انجام نہ دے تو پھر ظاہر ہے جو کچھ بھی ہو سکتا ہے وہ آپ کے سامنے ہے نقاد اور محقق بھی یہ دیکھ رہا ہے کہ کون سا ادارہ اس کی کون سی کتاب کتنے پیسوں میں خریدے گا اور ان چیزوں کو وہ سامنے رکھ کر لکھتا ہے اور نہیں سمجھتا کہ قوم اور ملک کو ضرورت کس کی ہے۔Genuine ضرورت کیا ہے اور یہ بھی نہیں سوچتا کہ اس کی اس تحقیق کو جاری رہنا چاہئے وہ مستقبل کی طرف نہیں دیکھتا اور مستقبل کی ضرورت اور آنے والی نسلوں کو نہیں دیکھتا کیونکہ بڑا فنکار بڑا نقاد اور بڑا تخلیق کار وہی ہوتا ہے۔ جو ماضی کی صحت مند روایات کو سامنے رکھ کے اور حال کے تقاضوں کو سمجھ کر یہ فیصلہ کرے کہ آنے والے زمانے یعنی مستقبل میں کن چیزوں کی ضرورت ہوگی اور کن چیزوں کو آگے بڑھاتا ہے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا اور اس میں کامیاب نہیں ہوتا وہ قوم ملک اور انسانیت اور اپنی نسل کے ساتھ اور انسانی نسل کے ارتقاء کے ساتھ غداری کرتا ہے۔ تو ہمارے یہاں ایسی

صورت بھی ہے اور آپ کو معلوم بھی ہے اس لئے میں یہ سمجھتا ہوں کہ ہمارا ادیب نہ صحیح معنوں میں پاکستانی نہ وطن پرست اور نہ قوم پرست ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ نہ اپنے حق کو پہچان رہا ہے اور نہ اپنے فرض کو ادا کر رہا ہے۔

سوال نمبر ۳ آپ اکادمی ادبیات پاکستان' مقتدرہ قومی زبان' مجلس ترقی ادب مغربی پاکستان اردو اکیڈمی اور ایسے ہی دوسرے اداروں کی کارکردگی کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں۔

جواب بھی بات تو یہ ہے کہ اس میں بعض ادارے نوزائیدہ ہیں اور نوزائیدہ اداروں کی جو تشکیل ہوئی وہ اپنے اپنے وقت کی حکومتوں کے سامنے رکھ کر یا ان حکومتوں میں اپنے مفادات کو ملحوظ رکھ کر کی گئی۔ گویا نظریہ ضرورت یہاں بھی کام کر رہا تھا۔ مثلاً اکادمی ادبیات پاکستان ایک ایسے دور میں معرض وجود میں آئی کہ جب پاکستان کے دانشوروں کو بعض چیزوں کے سلسلے میں مطمعن کرنا تھا اور اس وجہ سے اس ادارے کی تشکیل ہوئی اس نے زیادہ تر جو بڑے بڑے جلسے' کانفرنسیں' سیمینار اور سمپوزیم منعقد کئے سمجھ میں یہ آیا کہ یہ صرف ایک آدمی کی حکومت کو تقویت پہچانے کے لئے کئے گئے تھے اب جو نیا زمانہ آیا ہے اس کو ہم جمہوری دور کہہ سکتے ہیں جس میں رفتہ رفتہ ادارے بحال ہو رہے ہیں۔ اس حوالے سے دیکھاجائے تو ابھی تک اکادمی ادبیات پاکستان نے کوئی قابل لحاظ اور کوئی وقیع کام انجام نہیں دیا۔ ہمیں انتظار کرنا چاہئے۔ ممکن ہے کہ مستقبل میں کوئی اچھا کام کرے۔ اب رہا مقتدرہ قومی زبان تو قومی زبان کے لئے جس طرح سے اس کو کام کرنا چاہئے تھا۔ وہ ابھی تک نہیں ہوا۔ ڈاکٹر وحید قریشی کے زمانے میں بھی یہی کچھ ہوا اور زیادہ تر ایسے موضوعات پر کام ہوا کہ جو تقریباً مردہ تھے۔ میری ہے کہ جس کو فرسودگی اور کہنگی آجائے اور جو آگے چل کر کام نہ آسکے۔ ان پر کام کرنے کی کوئی بہت زیادہ فائدہ نہیں ہو تا۔ جب بھی کام کرایا جائے کام ایساہونا چاہئے۔ جو مستقبل میں بھی کام آئے۔

میں یہاں بھی عرض کروں کہ ابھی حال ہی میں مجھے ایران جانے کا اتفاق ہوا۔ تو ایران

میں بعض ایسے ادارے ہیں جو کلاسیکل نوعیت کے کام کر رہے ہیں۔ وہاں بھی میں نے یہ دیکھا کہ بہت سے معاملات کو ترقی پذیر معاشرے کے لئے جن خطوط پر استوار کرنا چاہئے وہ ابھی تک وہاں بھی استوار نہیں ہیں۔ خیر وہ ان کا مزاج ہے ان کی قوم کا معاملہ ہے۔ ممکن ہے کہ آگے چل کر نئے خطوط دریافت کریں' لیکن ہمارے ہاں مقتدرہ قومی زبان کے ادارہ میں ڈاکٹر وحید قریشی کے بعد جب ڈاکٹر جمیل جالبی آئے تو امید یہ تھی کہ وہ زیادہ واضح طور پر اپنے ساتھ کوئی منصوبہ رکھتے ہوں گے۔ ترجمے وغیرہ بھی ہوئے لیکن دیکھنا یہ تھا کہ کیا قومی زبان کی حیثیت سے اردو کا ان لسانی خطوط پر مطالعہ ہو رہا ہے جس پر ہونا چاہئے تو اس کا جواب نفی میں ہے کہ نہیں ہو رہا ہے۔ کیونکہ جیسا میں عرض کر رہا تھا۔ وہ یہ ہے کہ لسانیات کے ذریعے سے ہم ادب کا زیادہ صحیح مطالعہ کر سکتے ہیں۔ زیادہ صحیح مطالعہ کا مطلب یہ ہے کہ لسانیات ایک ایسا علم ہے کہ یورپ اور امریکہ کی بعض یونیورسٹیوں میں تو اس کی شاخوں پر بھی ڈیپارٹمنٹ بن گئے ہیں اب ان پر ریسرچ ہو رہی ہے۔ مثلاً فانٹک ڈیپارٹمنٹ الگ ہے تو فلمنتک ڈیپارٹمنٹ الگ ہے۔ اصوات کے اوپر۔ مصوتوں کے اوپر۔ مصمتوں کے اوپر الگ الگ شعبے اور لیبارٹریز قائم ہیں اور ان کے اوپر کام ہو رہا ہے لیکن ہمارے یہاں کچھ نہیں ہو رہا ہے۔ تو اب مسئلہ یہ ہے کہ اگر یہ مقتدرہ قومی زبان اس سمت میں کچھ کام کرتی تو وہ ملک قوم اور اس کے مستقبل کے لئے زیادہ مفید ہوتا اور جو کام ہو رہا ہے وہ ایسے کلاسیکی خطوط یا فرسودہ خطوط ہو رہا ہے جو آؤٹ ڈیٹ ہیں اور بیکار ہو چکے ہیں۔ اس سے نہ زبان کو کوئی فائدہ پہنچے گا نہ ہمارے کسی اور ادارے کو نہ یونیورسٹیز کو نہ طلبا کو۔ مثال کے طور پر جب کوئی اس طرح کی ریسرچ ہوتی ہے تو استاد اور طالب علم دونوں کے کام آتی ہے اور استاد کے لئے نئے راستے کھولتی ہے یہ سب کچھ نہیں ہو رہا ہے۔ اب مجلس ترقی ادب ہے۔ اس نے بہت اچھا کام شروع کیا تھا۔ لیکن جو Aid اس کو آج سے بیس سال پہلے ملتی تھی وہی آج بھی ملتی ہے۔ جبکہ کاغذ بہت مہنگا ہو چکا ہے اور دوسرے اخراجات جو اس کے متعلق ہوتے ہیں وہ بھی زیادہ ہو چکے ہیں بسا اوقات ان کے پاس اتنا پیسہ نہیں ہوتا کہ وہ اپنے عملے کی تنخواہیں دے سکیں ان کو قرض لینا پڑتا ہے تو اب بتایئے کہ مجلس ترقی

ادب اپنا کام کیسے کرے گی۔ مغربی پاکستان اردو اکیڈمی' ڈاکٹر وحید قریشی اس کے سربراہ ہیں۔ میری ایک کتاب انہوں نے چھاپی ہے۔ ابھی تک مجھے اس کا معاوضہ نہیں ملا۔ میرے علاوہ اور بہت سے لوگ ایسے ہیں جن کو معاوضہ نہیں ملا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ان کے پاس ایڈ نہیں آ رہی ہے۔ مالیات کا سرا کمزور ہے لیکن ان اداروں کے سامنے بھی ایک واضح اور اچھا نصب العین ہونا چاہئے جو نہیں ہے اور اس میں بہت سی خامیاں ہیں اور جیسا کہ میں نے عرض کیا اردو سائنس بورڈ بھی ایک ایسا ادارہ ہے جس سے ہم بڑا موثر کام لے سکتے ہیں اس کو بھی اسے خطوط کے اوپر استوار کیا جائے اور بھی بہت سے ادارے ہیں۔ بزم اقبال ہے' ادارہ ثقافت اسلامیہ ہے اور ہمارے یہاں لاہور میں علامہ اقبال کے حوالے سے ان کی شخصیت کے حوالے سے کہ انہوں نے تعمیرو تشکیل پاکستان کے حوالے سے اور مصور پاکستان کی حیثیت سے بڑا کام کیا۔ اس میں جو کام ہوتے رہے۔ ان میں تکرار بہت ہے۔ اور کوئی اسے دیکھنے والا نہیں تھا کہ بھئی اس تکرار کی کیا ضرورت تھی۔ مختلف لوگوں سے کام لیا جاتا۔ لیکن کار پردازوں نے اس پر توجہ نہیں دی بلکہ ہوا یہ کہ "اندھا بانٹے ریوڑیاں ہر پھر اپنوں کو" آپ میرے دوست ہیں۔ آپ کی جیب میں اتنا پیسہ جانا چاہئے اور اس لحاظ سے آپ کو کوئی کام دے دیا۔ وہ کام اعلیٰ درجے کا نہیں۔ جاننے والے نے تو مروت میں کر دیا ہے اتنے عرصے کے باوجود بعض اداروں کے پاس ان کی اپنی عمارتیں نہیں ہیں پھر بھی تیس تیس ہزار روپے ماہانہ کرایہ دیا جا رہا ہے۔ جبکہ بسا اوقات وہ عمارتیں ایسی ہیں کہ ان کا چار پانچ ہزار سے زیادہ کرایہ ہی نہیں بنتا۔ کرائے پر اتنا کیوں صرف کیا جا رہا ہے۔ اتنے عرصے میں جب لاکھوں کے حساب سے کرایہ دیا جا رہا ہے تو کیا لاکھوں روپے کی عمارت نہیں بن سکتی۔ گویا اس میں منصوبہ بندی بھی صحیح نہیں ہوئی یہاں پر بھی بیورو کریسی آڑے آتی ہے۔ جو صحیح منصوبہ بندی نہیں کرتی۔ اور "سونے سے گھڑائی مہنگی"۔ یہ کتابیں تو آپ نے چھاپیں چار۔ جن کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ لیکن ان کے اوپر جو صرف ہوا ہے۔ کروڑوں کے حساب سے ہوا ہے۔ پھر اس لحاظ سے یہ ادارے بے کار ہو جاتے ہیں ان کی معنوی حیثیت اور ان کی عرفی حیثیت دونوں متاثر ہوتی ہیں۔ تو میں اکثر اداروں سے

مطمئن نہیں ہوں اور میں سمجھتا ہوں کہ ان کی تشکیل پھر سے ہونی چاہئے اور ان کو مناسب ایڈ ملنی چاہئے اور ان کا انتظام بھی صحیح ہاتھوں میں ہونا چاہئے۔ تاکہ قوم اور ملک کو ان اداروں سے واقعی فائدہ پہنچے۔ لیکن میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ بعض ادارے ایسے ہوتے ہیں کہ جن سے فوری طور پر کوئی فائدہ نہیں پہنچتا اور فائدے کا جو تصور ہوتا ہے وہ کہیں بہت دور مستقبل میں جا کر ملے ہوتا ہے۔ یہ سوچ کر کے کہ یہ کوئی ایسی مشین ہے جس میں ہم چونی ڈال دیں۔ تو فوراً وہ ایک سو روپے کا نوٹ بنا کر ہم کو دے دے۔ تو یہ ادارے ایسے نہیں ہوتے۔ یہ کوئی انڈسٹری نہیں ہے۔ اس کا فائدہ بہت دیر سے پہنچتا ہے اور اس طرح سے بالواسطہ یا بلاواسطہ قوم اور ملک کو فائدہ ہوتا ہے۔

سوال نمبر۵۔ پاکستان کے المیاتی لمحات ۱۹۷۱ء کا سانحہ اور اب سندھ کراچی کے پس منظر میں ثقہ قسم کے شاعروں اور ادیبوں نے وہ کچھ نہیں لکھا جو انہیں لکھنا چاہئے تھا۔ آپ نے یقیناً اس پس منظر میں افسانے لکھے ہیں لیکن میں مجموعی ادیبوں کی بات کر رہا ہوں۔ اس کی وجہ کیا ہے؟

جواب پہلی بات تو یہ ہے کہ پاکستان کے المیاتی لمحات ۱۹۷۱ء کا سانحہ' اس کے پیچھے ایک نہیں بلکہ بہت سے واقعات۔ محرکات اور بہت سے عوامل ہیں۔ اور اس پر بہت کچھ صدیق سالک نے بھی لکھا۔ مسعود مفتی نے بھی لکھا اور جو لوگ وہاں پر موجود تھے۔ انہوں نے جو کچھ وہاں دیکھا وہ بھی لکھا۔ خود وہ لوگ جو مشرقی پاکستان کے حق میں تھے یعنی بنگالی۔ انہوں نے بھی لکھا۔ کچھ نے پہلے بھی اپنی تحریروں میں اس طرح کے اشارے کئے تھے۔ کچھ نے اس زمانے میں کئے اور کچھ نے اس کے بعد بھی کئے اب آپ یہ خیال کریں کہ ۱۹۷۱ء کا جو سانحہ تھا اس کا کوئی ایک سبب نہیں تھا اس کے معاشی اسباب بہت تھے اور ان کی محرومیاں بہت تھیں اس میں سیاسی اسباب بھی تھے۔ یعنی اقتدار سے ان کو دور رکھا۔ اقتدار سے وہ محروم رہے اور ان کو اقتدار میں شریک نہیں کیا گیا۔ پھر ان کا جغرافیائی تناظر میں جو قومی مزاج بنتا تھا اس کو ہمدردی سے نہیں سمجھا گیا۔ ایک تو یہ سبب ہوا اور اس کے ذیل میں

ناعاقبت اندیش قسم کے جو صاحبان اقتدار آتے رہے۔ مثلاً یحییٰ خان فوجی آدمی تھا۔ بندوق چلانا جانتا تھا۔ لیکن عمرانی حالات کا تجزیہ نہیں کر سکتا تھا اور جن لوگوں کو اس نے اپنا مشیر بنا رکھا تھا۔ وہ بھی فوجی ہی تھے۔ وہ ایسے ہی لوگ تھے مدبر نہیں تھے۔ تاریخ دان نہیں تھے۔ تاریخ صرف تاریخی واقعات کی کھتونی نہیں ہوتی بلکہ تاریخ کو آپ تاریخیت سمجھیں۔ اور تاریخیت کا علم باقاعدہ ایک سائنس ہے۔ جب تک کہ اس کو سائنس کے طور پر سمجھ کر اس کی صحیح Assesment نہ کی جائے۔ آپ صحیح طور سے کسی نتیجے تک نہیں پہنچ سکتے۔ لہٰذا مشرقی پاکستان جو اب بنگلہ دیش ہے اور اس میں جو کچھ بھی ۱۹۷۱ء میں ہوا اس میں غلطی ہماری بھی ہے۔ اگر ہم اس غلطی پر غور نہیں کریں گے اور آپ بھی نہیں کریں گے تو یہ ہمارے لئے بہت بڑا سبق ہے اور یہ سمجھیں گے کہ یہ سب اندرا گاندھی نے خود کر کے اس کو ختم کر دیا۔ بے شک اندرا گاندھی قصوروار ہے۔ لیکن ہم نے کیوں موقع دیا۔ بہرحال اس میں ہماری غلطیاں ہیں اب رہی سندھ کی بات تو سندھ کا معاملہ کوئی ایک چھوٹا سا واقعہ نہیں ہے۔ بہت سے واقعات کا یہ بھی مجموعہ ہے۔ مثال کے طور پر میں ایک واقعہ کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کو معلوم ہے کہ ۱۹۹۷ء میں ہانگ کانگ کا علاقہ چائنا کے حوالے کر دیا جائے اور یہ فری پورٹ بند ہو جائے گا اور یہ کوئی عرصہ سات آٹھ سال سے کراچی کو فری پورٹ بنانے کے لئے وہ تمام قوتیں اور طاقتیں یکجا ہو رہی ہیں ۔ جو بلیک منی پیدا کرتی ہیں۔ بلیک مارکیٹنگ کرتی ہیں ڈرگ مافیا کے ذریعے سے کاروبار کرتی ہیں۔ جن کے قحبہ خانے کھلے ہوئے ہیں جن کے جواخانے کھلے ہوئے ہیں اور تمام کالا دھندا کرنے والے وہاں پر جمع ہیں۔ وہ اس کو شفٹ کرنا چاہتی ہیں، کراچی کی طرف اور ان کو کوئی غرض نہیں کہ یہاں ضیاء الحق کی حکومت ہے۔ یا بے نظیر کی حکومت ہے کوئی ایکس وائی زیڈ کی حکومت ہو۔ وہ ہر ایک طاقت کو اپنے ماتحت رکھنا چاہتی ہیں۔

آپ یہ دیکھئے کہ جو عمل روس میں اس صدی میں شروع ہوا تھا۔ وہ یہ تھا کہ زرعی معاشرے کو صنعتی معاشرے میں بدلا جا رہا تھا۔ وہ عمل ہمارے سب کونٹیننٹ میں اب شروع ہو رہا ہے اور نتیجہ یہ ہے کہ وہ صنعت کار جو زرعی معیشت کی افادیت کو نہیں سمجھتا وہ

صرف اپنے مفادات کا تحفظ کرے گا' اور جو زرعی معیشت رکھتا ہے وہ صنعت کار سے کوئی ہمدردی نہیں رکھے گا۔ اور یوں تنازع للبقا کا مسئلہ پیدا ہو گا۔ جو ہمارے یہاں ہوا ہے ہمارے یہاں جاگیردار جس کے پاس زرعی زمینیں ہیں وہ اپنے مفاد میں ان کا تحفظ کرنا چاہتا ہے اور ہمارے یہاں جو صنعت کار ہے وہ راتوں رات ارب پتی' کھرب پتی ہونا چاہتا ہے۔ وہ یہ نہیں دیکھتا کہ ڈرگ مافیا ملک اور قوم کے لئے یا انسانیت کے لئے کتنی مضر ہے۔ انڈسٹری کیسے کرا سے اختیار کرتا ہے یہ بات بھی ہے کہ ہمارے یہاں فرسودہ نظام ابھی تک چل رہا ہے جو آؤٹ ڈیٹڈ نظام ہے۔ ہمارے یہاں قبائلی حوالے سے قبائلی سردار کی اہمیت ہے اور قبیلے جتنے ہمیں وہ ابھی انہی پرانے خطوط پر چل رہے ہیں ان کی نہ کوئی تاریخ ہے نہ تربیت ہے۔ ہمارا جاگیردار کوشش یہ کرتا ہے کہ اس کے مزارے پڑھنے لکھنے نہ پائیں۔ ان کے پاس علم نہ آئے۔ ہمارا صنعتکار تو چاہتا ہے کہ مزدور ہینڈ ٹو ماؤتھ رہے اور اس کی ضرورتیں ایسی رہیں کہ وہ ہمارا محتاج رہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ یہی وہ تینوں ایلیمنٹ ہیں جو سندھ میں بھی کام کر رہے ہیں اور ہم ایک مرتبہ پھر غلطی کر رہے ہیں کہ ہم انہی لیڈروں کے اوپر بھروسہ کر رہے ہیں۔

کہ جو فرسٹریشڈ ہیں اور جو صرف اپنے مفادات کا تحفظ کرنا جانتے ہیں اور ہم ایک مرتبہ پھر (CommonMan) کامن مین کو' لیبر کو' کسان کو اور وہ جو سرکاری نظام کی چکی میں پس رہے ہیں وہ کامن مین اس کو نہ ترقی دے رہے ہیں' نہ اسے آگے لا رہے ہیں۔ ہمارے مقابلہ میں ہندوستان ہم سے بہتر ہے کیوں کہ اس نے آزادی ملتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ ان پرانے Institutions کو جو فرسودہ ہو چکے تھے' ختم کر دیا۔ اب ایک چیز کی طرف میں اور اشارہ کرنا چاہتا ہوں۔ اس کا شکار ہم بھی ہیں اور ہندوستان بھی ہے اور وہ یہ کہ آپ کو معلوم بھی ہے کہ جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے یہاں پر اپنی عملداری شروع کی تھی تو سائنس اور ٹیکنالوجی تو وہ ضرور لائے تھے اور اس سائنس اور ٹیکنالوجی کے حوالے سے ہمارے معاشرے کو بہت کچھ فائدہ پہنچا لیکن وہ ایک ایسا نظام بھی ساتھ لائے تھے جس کو ہم استحصالی نظام یا Colonialism کہتے ہیں یا ہم اس کو استعماری نظام کہتے ہیں یا سامراجی نظام کہتے ہیں

ململ یارک شائر میں ہمارے ہی Sub Continent کا مال جاتا تھا اور وہاں کپڑا بنا جاتا تھا وہ ملیں کپڑا تیار کرتی تھیں۔ اسے ہم خریدتے تھے اور جب ہم خریدتے تھے تو وہ مہنگے داموں ہم خریدتے تھے اور ہماری جتنی بھی دیسی صنعتیں تھیں وہ ناکام ہو چکی تھیں۔ ناکام ہوئیں بھی اور ان کو ناکام کیا بھی گیا اور اس میں ایک انسٹی ٹیوشن تھا جس کو ہم مہاجن کہتے ہیں۔ بنگر کہتے ہیں۔ ہمارا جو بینکر تھا' سود خور وہ بھی ایک کردار ادا کرتا تھا۔ وہ اس وقت سے کردار ادا کرتا تھا کہ جب کوئی افسر بھرتی ہو کر انگلستان سے یہاں آنے لگتا تھا تو وہاں سے لے کر یہاں تک کے اس کے تمام سفری اخراجات وہ اٹھاتا تھا۔ باقی جب تک وہ یہاں رہتا تھا اس کے تمام اخراجات وہ بنگر اٹھاتا تھا۔ اس کا تمام پیسہ محفوظ رہتا تھا اور اس کے بعد وہ اس پر خرچ کرتا تھا ایک لاکھ تو بیس لاکھ اس سے کماتا تھا۔ یہ سب کہاں سے آتا تھا۔ یہ استحصال کس کا ہوتا تھا۔ یہ بنگر یہ بھی کرتا تھا کہ ان کو فائدہ پہنچانے کے لئے ہماری انڈسٹری کو نقصان پہنچاتا تھا اور ہمارے جو بے چارے چھوٹے موٹے کام کرنے والے تھے مثلاً کپڑا بننے والا' ڈھاکہ کی ململ ساری دنیا میں مشہور تھی تو اپنے مفادات کے لئے ان کے انگوٹھے کٹوا دیئے جاتے تھے۔ آپ یہ نہ بھولئے وہ ذہنیت آج بھی ہے ہندوستان میں بھی ہے اور ہمارے یہاں بھی ہے۔ لہٰذا اب یہ سندھ کا جو معاملہ ہے اس تناظر میں آپ دیکھئے اور جب تک کہ ہم ان تمام چیزوں کی صحیح طور پر نشاندہی نہ کریں' اپنے عوام کو Educate نہ کریں اور یہ تمام خطرات جو منڈلا رہے ہیں' ان سے ان کو آگاہ نہ کریں' ان کو یہ شعور نہ دیں۔ آپ یقین رکھئے کہ ہم بدستور انہی ناکامیوں کا شکار ہوتے رہیں گے اور یہ سندھ کا واقعہ میرے نزدیک صرف ایم کیو ایم کا یا پیپلزپارٹی کا نہیں۔ اس کے محرکات اور عوامل بہت گہرائی میں ہیں۔ ہمارے ملک میں بھی ہیں۔' ہمارے ملک کے باہر بھی ہیں۔

افسوس یہی ہے کہ ان تمام چیزوں سے ہمارے عوام بے خبر ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ حقائق سے بے خبر ہیں۔ یا عملاً چشم پوشی کر رہے ہیں اور اسے میں ان کی خود غرضی ہے' یا ان کی کم ہمتی ہے۔ دونوں صورتوں میں مستقبل کا جو پاکستان ہے وہ ان کو معاف نہیں کرے گا۔ تاریخ ان کو معاف نہیں کرے گی اور اب بھی اگر انہوں نے سمت میں قدم نہیں اٹھایا اور کام نہیں

کیا تو یقیناً مستقبل کا مورخ انہیں کبھی معاف نہیں کرے گا۔ تو یہ آپ نے بالکل صحیح کہا کہ میں نے یہ چند افسانے لکھے ہیں۔ اس سلسلے میں یا اس تناظر میں ان کی حیثیت تو ایسے ہی ہے جیسے کہ سمندر میں دو چار قطرے پھینک دیئے جائیں۔ ان کی کیا حیثیت ہے جب تک کہ یک جہتی نہ ہو اور ہم سب مل کر یہ کام نہ کریں۔ اس وقت تک کوئی اہم کام انجام نہ پا سکتا۔

سوال نمبر۶۔ پاکستان اور بھارت کے ادیب دونوں ممالک کے تعلقات کو معمول پر لانے اور خاص طور پر کشمیر کے مسئلہ پر تنازعہ کو ختم کرنے میں کیا کردار ادا کر سکتے ہیں؟

جواب۔ یہ کام ہم سے زیادہ ہندوستان کے ادیبوں کا ہے کہ وہ احساس دلائیں اور ایجوکیٹ کریں اور صرف اردو زبان کے ادیب نہیں کل چودہ علاقائی زبانیں ہیں ان سب کے ادیبوں اور دانشوروں میں یہ شعور پیدا ہو کہ ان کے ملک میں ایک بین الاقوامی ادارے نے Commitment کیا ہے کہ یہ ایک متنازعہ مسئلہ ہے اور یہاں پر استصواب رائے ہونا چاہئے اور اب وہ اس بات سے پھر گیا ہے کہ اب اس کی ضرورت نہیں رہی' کیوں نہیں رہی' ہم دو ملک ہیں اور ان دونوں ملکوں کے مابین یہ مسئلہ باقاعدہ ایک بین الاقوامی ادارے میں متنازعہ بھی ہے۔ آپ نے بھی تسلیم کیا ہے۔ ہم نے بھی کیا ہے اور اس استصواب ہونا چاہئے۔ ہندوستان کے ادیبوں کا ضمیر جگانا چاہئے۔ ہمارے ادیبوں اور دانشوروں کا کام یہ ہے کہ وہ ان کے تمام جو میڈیا ہیں ان کے ذریعے سے ان کو بیدار کریں اور ان کو بتائیں کہ یہ آپ کا کام ہے آپ کو کرنا ہے کیوں کہ سیاسی حکومتیں جو ہوتی ہیں۔ ان کے سیاسی مسائل ہوتے ہیں حکومتیں آتی رہیں جاتی رہیں اگر ان کے عوام اس معاملے کی طرف سے چشم پوشی کریں گے ان کا ضمیر سویا رہے گا۔ ہمارا موقف سیاسی طور پر عرب دنیا میں اور باقی دنیا میں پورے طور پر تسلیم نہیں کیا گیا۔ صرف چند ممالک نے جن میں سب سے آگے ایران ہے۔ ایران نے تسلیم کیا ہے' چند اور ممالک نے تسلیم کیا ہے اور وہ اسے اپنا مسئلہ سمجھتے ہیں لیکن یہ کہ باقی لوگوں نے تسلیم نہیں کیا۔ اس میں ہماری کمزوری ہے۔ ہمارے ادیبوں کی بھی۔ سفارتی بھی اور ہمارے لیڈروں کی بھی کمزوری ہے اور ہر اس ادارے کی کمزوری ہے جن کا اس معاملے میں بالواسطہ یا بلاواسطہ تعلق ہے۔

سوال نمبر۷۔ کیا آپ تدریسی نصاب میں شامل ادیبوں اور ادب کے معیار سے مطمئن ہیں؟

جواب جی نہیں، بالکل نہیں، قطعاً نہیں۔ اس کی بھی بہت سی مثالیں میرے پاس ہیں۔ جو المناک اور دردناک ہیں وہ یہ کہ آج سے کوئی تیس پینتیس سال پہلے ایک بہت بڑے ماہر تعلیم نے ہمارے اس برصغیر کے نظام تعلیم پر تمثیلی انداز میں ایک بڑا اچھا تبصرہ کیا تھا اور وہ یہ تھا کہ جب بھی میں اپنے اس برصغیر کے نظام تعلیم پر غور کرتا ہوں تو مجھے ایک قدیم یونانی کہانی یاد آجاتی ہے کہ جس میں ایک بادشاہ روزانہ ایک نئے مہمان کو بلاتا تھا۔ اس کی بڑی خاطر مدارات کرتا تھا اور اسے ایک مخصوص محل میں محل کے مخصوص کمرے میں لے جا کر ایک مخصوص مسہری پر لٹاتا تھا۔ اگر اس کے مہمان کا قد و قامت اس مسہری کے اندر فٹ ہو گیا تو خیر وہ بچ گیا لیکن اگر اس کا قد و قامت اس مسہری سے نکل جاتا تھا تو اس کے پاؤں چھانٹ دیئے جاتے تھے اور اگر اس کا قد و قامت اس سے چھوٹا رہ جاتا تھا تو اسے اتنا کھینچتے تھے کہ وہ مسہری کے برابر آجائے۔ اور انہوں نے یہ کہا کہ صاحب ہمارے اس برصغیر کا تعلیمی نظام یہی مسہری ہے جس میں ہم اپنے طلباء کے اذہان کو ٹھونس دیتے ہیں یا کھینچتے ہیں تو اب پہلی بات تو یہ کہ ہم نے نظام تعلیم ہی طے نہیں کیا اور نظام تعلیم کا مطلب ہے کہ نظریہ آپ کا کیا ہے۔ کن نظریات کی بنیاد پر آپ تعلیم دینا چاہتے ہیں۔ آپ اس کو بھی تاریخی تناظر میں دیکھئے اور وہ یہ کہ جب انگریز یہاں آیا تو اس کے سامنے اس ملک پر حکومت کرنا اس کا مقصد تھا۔ ملک پر حکومت کرنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ پورا (Sub Continent) برصغیر بہت سے علاقوں اور بہت سے خطوں میں تقسیم تھا اور یہ ایک ایسا علاقہ تھا کہ جہاں بہت سی زبانیں بولی جاتی تھیں۔ تو اس وقت ضرورت تھی کسی ایک زبان کی۔ یعنی تمام علاقوں اور خطوں میں لکھی پڑھی بولی اور سمجھی جاتی ہو۔ وہ اتفاق سے اردو تھی۔ اس سے پہلے مسلمانوں کی جو سرکاری اور قومی اور عدالتی زبان تھی وہ فارسی تھی۔ فارسی زبان سے مسلمانوں کو جو فائدہ تھا وہ یہ تھا کہ تمام مشرق وسطی کے ممالک اور

برصغیر کے ممالک کے مابین ایک تجارتی ثقافتی' مذہبی اور دینی پل بنا ہوا تھا۔ انگریز نے آکر اپنی سہولت کو تو سامنے رکھا لیکن اسی کے ساتھ اس نے مسلمانوں کو ایک شکست دے دی۔ اور وہ یہ تھی کہ اس پل کو توڑ دیا۔ یعنی فارسی زبان کو ختم کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ من حیث القوم مسلمان جو یہاں پر اقلیت میں تھے وہ اور کمزور ہو گئے۔ ہم مانتے ہیں کہ برصغیر میں اس کو حکومت کرنا تھی تو اردو زبان لے آیا۔ لیکن اردو زبان میں جو سائنس اور ٹیکنالوجی یورپ میں تھی اور جس کے ذریعے وہ یہاں حکومت کرنا چاہتا تھا وہ نہیں تھی۔ اردو زبان کی جو نثر تھی وہ مقفع مسجع اور مرصع تھی اور اس میں ترسیل خیال عوام کی سطح پر ہونا ممکن نہیں تھا۔ لہذا ضرورت تھی تو اس نے ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج قائم کیا اور یہاں بہت سی کتابیں اس نے لکھوائیں۔ پھر اس نے ۱۸۳۱ء اور ۱۸۳۲ء میں دہلی کالج قائم کیا۔ بس دہلی کالج کو آپ ہمارے اس سوال سے Related رکھیں۔ دہلی کالج میں ایک صاحب تھے جو پہلے تو ماسٹر رام چندر کہلاتے تھے اور بعد کو پروفیسر رام چندر کہے جانے لگے۔ پہلے وہ ہندو تھے اور بعد کو عیسائی ہو گئے تھے۔ یہ کالج وہی ہے کہ جس میں نذیر احمد بھی پڑھے ہیں' مولوی ذکاء اللہ بھی پڑھے۔ محمد حسین آزاد بھی پڑھے۔ پیارے لال آشوب بھی پڑھے اور دیگر بہت سے لوگ پڑھے اور ان میں سے بیشتر وہ لوگ ہیں جنہوں نے سرسید احمد خان کی تحریک میں ہراول دستے کا فرض انجام دیا۔ خیر جو بات میں یہاں کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اس وقت کے سب کانٹی نینٹ (Subcontinent) میں دو طرح کے نظام تعلیم رائج تھے۔ ایک تو ہندوؤں کا پاٹ شالائی نظام تھا اور دوسرے مسلمانوں کا درس نظامیہ تھا۔ نتیجہ یہ ہے کہ یہ دونوں فرسودہ تھے اور جدید تقاضوں سے یہ پورا معاشرہ کٹا ہوا تھا۔ اس کالج کے قائم کرنے کا انگریزوں کے سامنے یہ مقصد تھا کہ Ultimately وہ اپنے مطلب کے نوجوان اور اپنے مطلب کی ایک نسل پیدا کرنا چاہتے تھے لیکن اسی کے ساتھ ساتھ وہ جدید سائنس اور ٹیکنالوجی کو یہاں لانا چاہتے تھے تاکہ یہاں کے معاشرے کی رفتار تیز ہو جائے۔

اب آپ یہ بھی دیکھئے کہ جس وقت کلکتے میں باقاعدہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنا مستقر قائم کیا تھا۔ تو وہ زمانہ تھا کہ ۱۷۵۷ء میں ۱۸۵۷ء نہیں کہہ رہا ہوں۔ سراج الدولہ کی حکومت کو

ختم کر کے پورے بنگال پر انہوں نے قبضہ کر لیا تھا اور قلعہ بندیاں بھی اپنے ہاتھ میں رکھ لی تھیں اور تجارتی کوٹھیاں بنائی تھیں۔ تعلیم کا فروغ تجارت کے ذریعے سے بھی ہوا۔ لوگوں کو ایجوکیٹ کیا گیا۔ اس طرح سے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی چیزیں وہاں آگئیں۔ اگر ہماری بادبانی کشتیاں چلتی تھیں تو وہ دخانی کشتیاں لے آئے اگرچہ ہم جو تجارت کرتے تھے۔ اونٹوں کے اوپر خچروں کے اوپر۔ بیل گاڑیوں کے اوپر ہمارے قافلے برسوں میں ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچتے تھے۔ انہوں نے دخانی کشتیوں کے ذریعے سے دریائی راستے اختیار کئے۔ دوسرے انہوں نے ٹریک بچھا دیا آل اوور بنگال۔ اور ٹریک کے اوپر ٹرالیاں دوڑانے لگے۔ جب تک کہ ان کا مال ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچ کر سارا ایک کر اور اس کا نفع بھی پہنچ جاتا تھا۔ ہمارے قافلے کہیں راستے میں ہوتے تھے۔ اسی صورت سے انہوں نے ایجوکیشن کے لئے بھی یونیورسٹیز قائم کیں۔ کالجز قائم کئے۔ دہلی کالج شمالی ہند کے علاقے میں پہلا کالج تھا۔ اس اعتبار سے کہ مسلمانوں کو ہندوؤں کو سب کو اردو زبان میں تعلیم دی جاتی تھی لیکن جو علوم انہیں پڑھائے جا رہے تھے وہ جدید تر اکثر اس میں آکسفورڈ یونیورسٹی کے پیٹرن پر بہت سی چیزیں جو وہاں موجود تھیں۔ انگریزی پڑھائی جاتی تھیں۔ یہاں اردو میں پڑھائی جا رہی تھیں۔ پروفیسر رام چندر جن کا ابھی میں نے ذکر کیا یہ بہت سی کتابوں کے مترجم رہے۔ اور ان کی نگرانی میں یہاں سے تین رسالے نکلتے تھے۔ ایک کا نام تھا محب ہند' دوسرے کا نام تھا فوائد الناظرین' تیسرے کا نام تھا قران السعدین۔ یہ تینوں رسالے جو نکلتے تھے۔ اس وقت کے نوجوانوں کے ذہن کو اور ان کے ذہنی افق کو بدل رہے تھے۔ اور نیا طرز فکر لا رہے تھے اور یہ بتا رہے تھے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی انسان کی زندگی کے لئے' معاشرے کے لئے کس قدر اہم اور ناگزیر ہیں۔ اب یہاں سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے یہاں ایک نئے نظام تعلیم کی بنیاد پڑی لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ یہ نیا نظام تعلیم جو تھا وہ Ultimately اس سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ انگریز چونکہ استعماری نظام لا رہا تھا۔ وہ ہم سے مخلص Sincere کم تھا۔ وہ اپنے نظام سے (Sincere) زیادہ تھا اور اپنے نظام کے ذریعے سے ہمارا استحصال کرتا تھا۔

مت بھولئے کہ جب افریقہ کا آج سے کوئی پندرہ بیس سال پہلے ایک ملک آزاد ہوا تو اس ملک کے صدر سے یا وزیر اعظم سے جب پریس کے کسی نمائندے نے یہ سوال کیا کہ آپ کی کیا رائے ہے یہ جو Outgoing کالونیل ازم ہے اس کے بارے میں آپ کیا رائے دیتے ہیں تو اس بے چارے نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور کہا کہ کیا پوچھتے ہو۔ آج سے سو سال پہلے جب یہ سفید بادبانی کشتیوں میں بیٹھے ہوئے سفید چولے پہنے ہوئے ہمارے ساحلوں پر اترے تھے تو ان کی بغلوں میں بائبل دبے ہوئے تھے اور رات دن ہمارے ملک سے ہمارے ملک کا سونا لے کر ان کی کشتیاں اپنے ملکوں میں پہنچتی رہیں اور اب جب ان کی آخری کشتی جا رہی ہے تو ہمارے ملک کا سارا سونا ان کے ملکوں میں پہنچ چکا ہے۔ البتہ ان کی لائی ہوئی بائبلیں ہماری بغلوں میں دبی رہ گئی ہیں۔ یعنی مذہب کے نام پر بھی استحصال ہوا۔ سامراجی نظام نے استحصال کیا۔ لہٰذا ہم اس کے بارے میں کوئی اچھی رائے نہیں رکھتے ہیں۔ بہرحال ایسٹ انڈیا کمپنی کے ساتھ جو سائنس اور ٹیکنالوجی آئی۔ دلی کالج کے ذریعے سے جو علوم آئے۔ ان علوم نے ہمارے برصغیر میں زندگی کی جو سست رفتاری تھی۔ اس کو دور کیا اور اس میں تیز رفتاری پیدا کی اور اس وقت کے نوجوانوں کا ذہنی افق وسیع کیا میرے کہنے کا جو حاصل ہے وہ یہ ہے کہ پاکستان کو بنے ہوئے ۴۳ سال ہو گئے اور وہ کالونیل ازم گیا۔ لیکن کیا ہم نے اپنی یونیورسٹیز اور کالجز سے بھی اس Colonialism کو رخصت کیا۔ نہیں کیا' ہم نے یہ طے نہیں کیا کہ ہمارا نظام تعلیم کیا ہونا چاہئے کیوں کہ ہم نے یہ نہیں طے کیا کہ ہم قوم کی حیثیت سے کیا ہیں اور ہمیں کیا ہونا چاہئے۔ یقینی طور پر ہم کو ماضی کی طرف بھی دیکھنا ہے۔ ماضی کی صحت مند روایات کو لینا ہے۔ حال کے تقاضوں کو سمجھنا ہے او مستقبل کی طرف دیکھنا ہے۔ مستقبل کے لئے سب سے بڑی بات جو ہے وہ یہ ہے کہ اب سے تھوڑے دن پہلے تو یہ صورت حال تھی کہ جو معاشرہ پچاس سال میں ترقی کرتا تھا۔ وہ دس سال میں کرتا ہے۔ چونکہ آپ کے پاس جو تیز رفتار ذرائع آگئے ہیں۔ کمپیوٹر آگیا ہے کمپیوٹر نے بہت سی چیزوں کو آسان کر دیا ہے۔ تیز کر دیا ہے۔ اولاً تو ہمیں اس Age کے تقاضوں کو سمجھنا ہے اور کمپیوٹر ایج (Age) سے ہم آہنگ کرنا ہے اپنے نوجوانوں کو سائنس اور

یلنالوجی کی طرف ان کو لاتا ہے۔ اگر ہم نے اپنا نظام تعلیم ان لوگوں کے ہاتھوں میں دے دیا جو فنڈا میںٹلسٹ ہیں۔ جو بنیاد پرست ہیں۔ ہمارے قومی شاعر علامہ اقبال یہ کہتے ہیں کہ۔

ع اے کشتہ سلطانی و ملائی و پیری کہ ہم مسلمان بادشاہوں کے فرسودہ نظام کا شکار ہے اور ان کا کشتہ بنتے رہے۔ اور ہم تنگ نظر ملاؤں کا شکار رہے۔ ملا سے مطلب تنگ نظر ہے۔ کیوں کہ ملا آپ کو اولڈ ٹریک پر لے جانا چاہتا ہے۔ پرانے راستے پر لے جانا چاہتا ہے اور اس کو معلوم نہیں کہ سائنس کیا ہے' ٹیکنالوجی کیا ہے۔ اور وہ فرسودہ مابعد الطبیعات پر اڑا ہوا ہے۔ علامہ اقبال کہتے ہیں۔

آئین نو سے ڈرنا' طرز کہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

قوم کی زندگی میں سب سے مشکل منزل یہی آتی ہے کہ آپ نئے آئین سے ڈر جائیں۔ ہمیں اجتہاد کی ضرورت ہے۔ ہمیں ملا کی نہیں۔ بنیاد پرست کی نہیں۔ ہمیں مجتہد کی ضرورت ہے۔ جو نئے زمانے کے تقاضوں کو سمجھ کر اور قیمتی جو اصول ہیں جہاں Rigidity نہیں ہے Flexibility ہے۔ اس کے لحاظ سے تمام فرقوں کو ایک کرے' ایک مرکز پر لائے اور فروعات کو بھلا کر کم از کم یہ تو کرے کہ مستقبل کا راستہ صاف کر دے اور ہماری قوم اس پر رواں دواں ہو جائے۔ ہمارے نظام تعلیم میں سب سے بڑا نقص ہے کہ وہ کھینچا تانی ہو رہی ہے۔ ایک طرف ملا اپنی طرف کھینچ رہا ہے معاشرے کو۔ دوسری طرف سائنس' ان کے تقاضے کچھ اور ہیں۔ سائنس دان کو بنیاد پرست یہ کہتا ہے کہ وہ کافر ہے یہ مذہب سے منحرف ہو گئے ہیں۔ یہاں پر آکر بے چارا سائنس دان جو ٹیکنالوجسٹ ہے خاموش ہو جاتا ہے کہ بھئی ہم پر فتویٰ لگ رہا ہے۔ وہ کچھ بول نہیں سکتا۔ تو مسئلہ یہ ہے کہ ہمیں جانا کدھر ہے۔ جب تک کہ ہمارے پاس کوئی صحت مند اور واضح نظریہ نہیں ہو گا۔ ہم اپنے یہاں کون سا نظام تعلیم لائیں گے۔ میں نہیں کہتا کہ آپ خدانخواستہ مذہب کو چھوڑ دیں' لیکن جو دین کہتا ہے اس کو سمجھیں تو سہی۔ کیوں کہ جس کا رسول ﷺ یہ کہتا ہے کہ علم حاصل کرو چاہے

اس کے لئے تمہیں چین کیوں نہ جانا پڑے۔ اس کا ملا کھڑے ہو کر کہتا ہے کہ مسلمانوں یقین نہ کرنا' چاند پر آدمی نہیں پہنچ سکتا۔ یہ انہوں نے کسی پہاڑ پر کھڑے ہو کر تصویر اتروائی ہے۔ اگر تم نے یقین کیا اس بات پر تمہاری ماؤں کے نکاح ٹوٹ جائیں گے۔ اب بتائیے آپ کو ملا سچا ہے یا آپ کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم سچا ہے۔ رسول کہتا ہے علم حاصل کرو اور ملا ہمیں اس کے خلاف لے کر جا رہا ہے۔ کیا رسول صلی اللہ علیہ وسلم خدانخواستہ نعوذباللہ یہ کہنا چاہتے تھے کہ علم دینی مجھ سے بڑھ کر کوئی چین میں سکھانے والا موجود ہے اس سے جا کر سیکھو۔ نہیں علم دینی کے لئے نہیں کہا تھا۔ علم دینی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑا کوئی سکھانے والا نہیں تھا۔ نہ پیدا ہوا تھا' نہ پیدا ہوا ہے نہ پیدا ہو گا۔ یہ ہمارا آپ کا ایمان ہے تو مسئلہ یہ ہے کہ کس علم کے لئے کہتے تھے۔ اگر وہ اسی دنیا کے علم کے لئے کہتے تھے اور چین سے مراد فاصلہ ہے کہ فاصلے طے کرو۔ دور دور تک جاؤ علم کو حاصل کرو جہاں سے ملے' تو پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان پر ہر مومن پر مومنات پر' علم حاصل کرنا بھی فرض ہے اور یہ ہمارا قومی فریضہ بھی ہے۔ ہمارے ملک کا فریضہ بھی ہے۔ یہ ہمارے کالجز میں بھی ہونا چاہئے۔ ایڈوانس ٹیکنالوجی ہونا چاہئے۔ ایڈوانس سائنس ہونا چاہئے جبھی ہم ترقی کر سکتے ہیں۔ جب ہمارا نصاب صحیح ہو گا۔ ہماری فکر صحیح ہو گی اور ہماری فکر کا قبلہ صحیح ہو گا۔ اور جب تک کہ ہم بنیاد پرستوں کے چکر میں پڑے رہیں گے تو یقین کیجئے ۴۳ سال میں ہم کچھ نہیں کر سکے۔ آئندہ بھی کچھ نہیں کر سکیں گے۔ اس لئے ضروری ہے کہ تدریس کے سلسلے میں نصاب صحیح ہو اور صحیح ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ایڈوانس سائنس اور ٹیکنالوجی کے مطابق ہو اور ہمارے جو دانشور ہیں ادیب ہیں' ان سے مشورے کے بغیر یہ نہیں ہونا چاہئے اور جن کے پاس Knowledge (نالج) کم ہے یا وہ سوڈو Intelectual ہوں۔ ان سے رجوع نہیں کرنا چاہئے۔ جو کہ ابھی تک ہم یہ کرتے رہے ہیں اور مصلحتوں کا شکار رہے ہیں۔ کیوں کہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ "اسمہ ساڈا بندا ہے" اس کو تو کچھ نہ کچھ دینا ہی دینا ہے۔ "ساڈا بندا" نہیں چلے گا۔ علم کو اگر چلانا ہے تو کہیں باہر سے بھی لانا پڑے گا۔ سرسید احمد خاں نے جب اپنا کالج قائم کیا جو بعد میں یونیورسٹی بنا۔ تو اس چیز کو ہمیشہ خیال میں رکھا گیا کہ کسی علم کا جاننے والا جرمنی میں ہے' امریکہ میں ہے' فرانس

میں ہے' اس کو لے کر آتے تھے۔ آٹھ سال دس سال پچاس سال اسے رکھتے تھے اور اس شعبے کو مستحکم کر دیتے تھے۔ علامہ اقبال کے استاد پروفیسر آرنلڈ علی گڑھ یونیورسٹی سے آئے تھے۔ علی گڑھ یونیورسٹی میں انہوں نے کچھ Contribute کیا تھا۔ یہ روایت ہر زمانے میں وہاں قائم رہی یہی وجہ ہے کہ وہ ایشیا کی کم از کم اگر واحد یونیورسٹی نہیں تو چند بڑی اور اچھی یونیورسٹیز میں آج بھی شمار ہوتی ہے تو ایسی یونیورسٹیز بھی قائم کرنا پڑیں گی۔ ایسے ادارے قائم کرنا پڑیں گے۔ ریسرچ کے سنٹرز انسٹی ٹیوٹس قائم کرنا پڑیں گے اور جب تک کہ ہم یہ نہیں کرتے ظاہر ہے کہ نہ ہمارا یہ فرسودہ نظام تعلیم ہمیں کچھ دے سکتا ہے اور نہ ہم اپنی قوم سے کچھ کام لے سکتے ہیں اور نہ ہمارا ملک ترقی کر سکتا ہے۔

وقار الادب' ڈاکٹر آغا سہیل سے استفسار

پروفیسر طاہر مسعود

اردو ادب میں ڈاکٹر آغا سہیل کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ آپ نصف صدی سے علم و ادب کی آبیاری میں مصروف ہیں۔ ایک محقق' نقاد' افسانہ نگار' ناول نگار اور سفرنامہ نگار کی حیثیت سے پورے برصغیر میں آپ ممتاز مقام پر فائز ہیں۔ ذیل میں ڈاکٹر صاحب سے طویل گفتگو کا ایک اقتباس پیش خدمت ہے:۔

طاہر: لکھنؤ کے جاگیردارانہ نظام کو پسند نہ کرنے کے باوجود لکھنؤ سے آپ کی محبت میں کچھ کمی واقع نہیں ہوئی جس کا اظہار ہوتا رہتا ہے۔ آپ کے اکثر و بیشتر افسانے پاکستان کی سیاسی و سماجی صورت حال کی نمائندگی کرتے ہیں جس میں ایک سچا' کھرا اور دردمند پاکستانی نظر آتا ہے۔ آپ کے سفرنامہ ایران سے پتہ چلتا ہے کہ آپ ایران کے شہر اصفہان سے بھی جذباتی تعلق رکھتے ہیں۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ ایک ہی شخصیت مختلف ٹکڑوں میں کیونکر تقسیم ہوئی ہے؟

آغا سہیل ہر شخص میں فطری طور پر ایسا ہوتا ہے۔ ہمارے اجداد کا تعلق اصفہان سے تھا۔ ایران گیا تو جی چاہا کہ اصفہان شہر دیکھا جائے۔ اتفاق سے موقع بھی مل گیا اور چلا گیا' لیکن جب وہاں پہنچا تو لوگوں نے کہا کہ بھئی یہاں پر بستی قزلباشاں ہے' آپ وہاں جا کے اپنے اجداد کے عزیزوں کو معلوم کریں تو اچانک یہ خیال آیا کہ اگر ہم نے معلوم بھی کر لیا So What پھر کیا ہوگا!.... لیکن وہ جو محبت ہمارے خون میں ہے اس حوالے سے کہ اصفہان ہمارے اجداد کا وطن ہے کیسا شہر ہے؟ اس کا جغرافیہ کیا ہے؟ اس کا جغرافیائی ماحول کیا ہے؟ فضاء کیا ہے؟ اس کی معیشت کیا ہے؟ معاشرت کیا ہے؟ کلچر کیا ہے؟ ثقافت کیا ہے؟ اور اس طرح اس سرزمین پر قدم رکھ کر بڑی تسکین ہوئی بڑی تسلی ہوئی۔ اس فضاء میں سانس لے کر بڑی فرحت محسوس ہوئی۔ اب رہی لکھنؤ کی بات تو وہ تو ہمارا وطن ہے کیونکہ

ہم نے وہاں جنم لیا۔ ہماری جنم بھومی ہے' اب وہاں کوئی بھی نظام ہو اس سے اختلاف کا حق پہلے بھی مجھے تھا آج بھی ہے۔ رہی پاکستان کی بات تو صاحب بات یہ ہے کہ جب سے تاریخی شعور پیدا ہوا یہ محسوس ہوا کہ سر سید احمد خاں نے جو دو قومی نظریہ پیش کیا تھا' اس دو قومی نظریے سے ہمارا کوئی خاص تعلق ہے اور ہم ایک قوم ہیں اور اس قوم کے ساتھ ہمارا جینا مرنا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مسلمان جب برصغیر میں آئے تو وہ کوئی Colony بنا کے یہاں رہنا نہیں چاہتے تھے کہ یہاں کی دولت بٹوریں اور لے جا کے کہیں اور رہیں جو انگریز نے کیا کہ وہ سامراج تھا۔ ہم تو یہاں آئے تھے رہنے کے لئے اور یہیں کی سرزمین میں سونے کے لئے مرمٹنے کے لئے لیکن جب ہم نے دیکھا کہ عرصہ حیات ہم پر تنگ کیا جا رہا ہے' نہ ہم محفوظ ہیں نہ ہماری زبان' نہ ہماری ثقافت اور نہ ہمارا Civil Libreties تو ظاہر ہے کہ تحریک پاکستان' دو قومی نظریہ سے ہماری فطری ہمدردی تھی' لاشعوری طور پر اس کے دو ایک واقعات میں آپ کو سنانا چاہتا ہوں ایک تو یہ کہ جس زمانے میں یہ تحریک چلا رہی تھی تو گھر میں اخبارات منگائے جاتے تھے اور پڑھے سنے جاتے تھے۔ ہمارے اندر بھی وہی ولولہ' وہی امنگ' وہی جوش پیدا ہوتا تھا۔ پھر ایک واقعہ یہ ہوا تھا کہ جب ہم سکول آتے جاتے تھے تو ایک راستہ ایسا بھی تھا جہاں بڑا سناٹا ہوتا تھا اور اس راستے سے گزرتے وقت عجیب Temptation یہ پیدا ہوتی تھی کہ ایک باغ کی دیوار تازہ تازہ بنی ہوئی تھی Cemented۔ اس کے اوپر انگریزی میں' اردو میں اور ہندی میں ہم لفظ "پاکستان" لکھ دیا کرتے تھے۔ دوسرے تیسرے دن دیکھتے تھے کہ وہ لفظ کسی نے مٹا دیا تو ہم پھر لکھ دیتے تھے۔ ایک دن اتفاق سے میں اس راستے سے بالکل اکیلا گزر رہا تھا اور میں نے دیکھا کہ دیوار کے اوپر وہ تحریر موجود نہیں تھی جو ہم کو بہت عزیز تھی۔ جس کے خواب ہم دیکھا کرتے تھے تو ہم نے پھر اس کو لکھنا شروع کیا اور اسی وقت کسی طرف سے ایک آدمی جو بہت موٹا تازہ اور مشٹنڈا تھا اور اس کو دیکھ کے ڈر بھی لگتا تھا' اس نے آتے ہی ہم کو پکڑ لیا اور کہا..... اچھا یہ تم ہو جو ہماری دیوار کو گندا کرتے ہو۔ اس نے یہ لفظ گندا جو استعمال کیا تو چونکہ پاکستان کے لفظ کے ساتھ گندگی کا جو تصور تھا وہ ہمارے معصوم ذہن میں کچھ فٹ

نہیں بیٹھتا تھا تو ہم نے بہت چھڑانے کی کوشش کی' اس کو برا بھلا بھی کہہ رہے تھے لیکن کسی صورت سے بھی وہ ہم کو چھٹنے نہیں دیتا تھا۔ اس نے ہماری دونوں کلائیاں ایک ہاتھ میں پکڑ رکھی تھیں کہ معاً اس طرف سے ہمارے ہی ہم محلّہ ایک حکیم صاحب گزرے اور انہی نے کہاں کیوں بھئی کیا بات ہے؟ وہ شاید ان کا مریض رہ چکا تھا' تو اس نے کہا کہ دیکھیے صاحب یہ ہماری دیوار کو گندا کرتے ہیں' خراب کرتے ہیں' روکتے ہیں تو نہیں مانتے۔ انہوں نے کہا اچھا آپ اس کو چھوڑ دیں۔ میں ضمانت دیتا ہوں یہ پھر نہیں لکھے گا۔ انہی نے چھڑوا دیا اور گھر آ کے کسی دن یہ بتا دیا کہ بیٹا یہ بڑی خطرناک فضا ہے حالات خراب ہیں۔ مسلمان قتل ہو رہے ہیں نہ معلوم کتنے واقعات روز ہو جاتے ہیں۔ تم ادھر سے نہ گزرا کرو اور یہ نہ لکھا کرو...... میں جو کچھ آپ کو بتانا چاہ رہا ہوں وہ یہ کہ پاکستان تو ہماری جڑوں میں بیٹھا ہوا تھا۔ ہمارے شعور میں بھی تھا لاشعور میں بھی تھا۔ تمام مسلمان اجتماعی طور پر یہ خواب دیکھ رہے تھے۔ لکھنؤ کی سرزمین سے اس کا ایک اور بھی تعلق تھا کہ اکثر مسلم لیگ کے جلسے وہاں ہوتے تھے اور راجہ صاحب محمود آباد کے گھر میں ہوتے تھے تو وہاں کی فضاء کچھ ایسی تھی' کچھ اخبارات ایسے نکلتے تھے کہ سمجھ میں آتا تھا کہ پاکستان سے مسلمانوں کا کوئی خاص تعلق ہے۔ اس لئے صاحب یہ پاکستان جو ہمارے شعور و لاشعور کا ہمارے تحت الشعور کا حصہ ہے تو ہم کو کیونکر عزیز نہ ہو گا۔ تو ظاہر ہے کہ ہم کسی ایسے نظام کے خلاف تو ہیں جس میں جبریت ہو اور اس کے خلاف ہم مزاحمت بھی کرتے ہیں اور مزاحمتی ادب جہاں بھی تخلیق ہوا ہے' اس میں کہیں نہ کہیں پر ہماری کمزور ہی سہی آواز شامل رہی ہے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ آپ کے اس سوال کا جو بہت طویل تھا' تشفی بخش جواب تو نہیں ہے' لیکن کچھ حصے شاید اس جواب میں آ گئے ہیں۔

طاہر آغا صاحب جہاں تک میری معلومات ہیں۔ آپ نے اپنے پہلے مجموعے سے لے کر آج تک اپنی کسی کتاب کے سلسلے میں تعارفی تقریب منعقد نہیں کی حالانکہ آپ ایسی تقاریب میں شرکت بھی فرماتے رہتے ہیں؟

آغا سہیل جہاں تک ان تقاریب میں شرکت کی بات ہے' تو طاہر صاحب اگر آپ اپنی کسی کتاب کا فنکشن کریں اور مجھ سے کہیں تو میں کیسے انکار کر سکتا ہوں' ظاہر ہے کہ مروت میں جاؤں گا اور جب مروت میں جاؤں گا تو آپ کی کچھ تحسین بھی کروں گا' لیکن اپنی عادت سے مجبور ہو کر تھوڑی سی نکتہ چینی بھی کروں گا' جو لوگوں کو بری لگتی ہے۔ اس لئے اب ان لوگوں نے مجھے بلانا بھی چھوڑ دیا ہے' پھر بھی اگر کچھ لوگ بلا لیتے ہیں اور میری تھوڑی سی کڑوی باتیں سن لیتے ہیں تو میں چلا جاتا ہوں۔ میں اپنی کسی کتاب کی تقریب کا قائل اس لئے نہیں ہوں کہ میں اس کو Show Business کا حصہ سمجھتا ہوں کہ آدمی صرف اپنی سستی اور سدی شہرت چاہتا ہے اور سامنے بیٹھ کر لوگوں سے کہتا ہے "پڑھو میری شان میں"۔ اب آپ خود سوچ لیجئے کہ یہ تمام چیزیں کتنی غلط ہیں اور مجھے اس میں کوئی خوبی' کوئی اچھائی' کوئی بہتری نظر نہیں آتی۔ تو اس لئے میں اس کا قائل نہیں ہوں۔ آپ کی تحریر میں اگر جان ہے تو وہ اپنی حیثیت خود منوائے گی۔ غالب پر اتنے اعتراضات ہوئے' لیکن غالب نے اپنی روش کو ترک نہیں کیا وہ جس طرح کہتے تھے' جس انداز سے کہتے تھے' جس کو صحیح سمجھتے تھے وہی کہتے تھے اور وہ کہتے رہے کہ

ع "شہرت شعرم بگیتی بعد من خواہد شدن"

اگر ان کے زمانے میں ان کا شعر مقبول نہیں ہوا تو ان کو یقین تھا کہ ایک زمانہ آئے گا کہ جب ان کے اشعار کی شہرت ہوگی اور تمام روئے ارض پر ان کی شہرت پھیل جائے گی' تو جو چیز Genuine ہوتی ہے وہ خود اپنا مقام پیدا کرتی ہے۔ اگر میری تحریر Genuine نہیں ہے اور وہ زندہ رہنے کی سکت اپنے اندر نہیں رکھتی اور اپنی فطری موت کی طرف جا رہی ہے تو اسے مرجانا چاہئے۔ کیونکہ انسان کو اس سے کوئی نفع نہیں پہنچ سکتا۔ معاشرے کی اصلاح نہیں ہو سکتی۔ انسان کو اور انسانی معاشرے کو جس تحریر سے کوئی فائدہ نہ پہنچے اور جس کی اپنی کوئی Worth نہ ہو' اگر وہ ان تقاریب کی بیساکھیوں کے سہارے چلے تو کتنی دور تک چلے گی۔ اچھی اور جاندار تحریر زمان و مکاں کے سیاق و سباق سے

شکل کر ہمیشہ ہمیشہ قائم رہتی ہے' زندہ رہتی ہے۔ اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ اگر میری تحریر میں بھی جان پیدا ہوگئی تو وہ خود ہی زندہ رہے گی اور اگر وہ زندہ نہیں رہ سکتی تو میں اس کو زندہ رکھنے کے لئے ہزاروں تقاریب منعقد کر دوں' اس سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ اس میں زندہ رہنے کی سکت نہیں ہے تو وہ مرجائے گی اور اسے مر ہی جانا چاہئے۔

طاہر آغا صاحب افسانے کی دنیا میں آپ روایتی افسانے سے جدید علامتی افسانے تک تو سفر طے کر چکے ہیں۔ کیا تجریدی افسانے کی طرف مائل ہونے کا ارادہ ہے۔ کیا آپ اس کے قائل ہیں؟

آغا سہیل طاہر صاحب یہ تینوں اسالیب ہیں' جن کا آپ نے ذکر کیا یعنی روایتی افسانہ بھی ایک اسلوب ہے' علامتی افسانہ بھی اسلوب ہے اور تجریدی افسانہ بھی ایک اسلوب ہے۔ میں نے ارادتاً کبھی کسی اسلوب کو اختیار نہیں کیا بلکہ مجھ سے خود اسلوب نے کہا کہ یہ تمہارا نظریہ یا یہ تمہارا موقف یا یہ تمہارا موضوع ہمارے اندر سما سکتا ہے۔ میں نے روایتی افسانہ بھی لکھا ہے۔ اگر نظریہ ضرورت کے تحت' موضوع کے تقاضے کے تحت وہ روایتی افسانے میں ڈھل گیا تو میں نے کہا ٹھیک ہے فبہا' اگرچہ اس کو علامت کی ضرورت ہوئی اور وہ علامت کے پردے میں چلا گیا تو سمجھ میں آیا کہ اس ایمائیت میں اور اس ایمائیت کے پردے میں یا استعارے کے پردے میں یا علامت کے پردے میں بات بڑی فنکاری سے کہی جا رہی ہے یا کہی جا سکتی ہے' میں نے اسے اختیار کر لیا۔ ابھی تک میں نے کوئی تجریدی افسانہ لکھا نہیں' لیکن اگر کوئی تقاضا ہوا کسی موضوع کا' وقت کا' حالات کا اور اس نے تجرید کی شکل اختیار کر لی تو ظاہر ہے کہ وہ کوئی شجر ممنوعہ تو ہے نہیں میں اسے اختیار کر لوں گا۔ میں نے کبھی Fashion کے طور پر یا فن برائے فن کے لئے یا اسلوب برائے اسلوب کے لئے کوئی افسانہ نہیں لکھا جیسی ضرورت ہوئی جیسا فن کا تقاضا ہوا میں نے اسے اس تقاضے کے بموجب پورا کر دیا۔ تو کوئی ارادہ نہیں ہے ہو سکتا ہے کہ کل ضرورت پڑ جائے اور تجریدی افسانہ لکھ دوں۔

طاہر آپ کے مختلف افسانوں اور مضامین کا مطالعہ کرتے ہوئے بعض موقعوں پر بظاہر یوں معلوم ہوتا ہے کہ واقعات یا معلومات کی تکرار موجود ہے' تاہم جب گہرائی سے مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ واقعہ تو وہی ہے لیکن نئے سیاق و سباق میں آپ نے کوئی نیا نکتہ سمجھایا ہے' کیا اس طریقے سے آپ کو تسلسل خیال میں مدد ملتی ہے یا کوئی اور وجہ ہے؟

آغا سہیل طاہر صاحب بات یہ ہے کہ آپ نے یہ جو سوال کیا ہے یہ میرے بعض معاصرین سے بھی کیا گیا ہے۔ ایک مرتبہ انتظار حسین سے یہی سوال کیا گیا تھا' تو انہی نے کہا کہ میں تو شروع سے ایک ہی افسانہ لکھتا چلا آ رہا ہوں' ایک ہی کہانی سناتا چلا آ رہا ہوں اور وہ کہانی مکمل ہی نہیں ہوتی۔ میں جب تک زندہ رہوں گا وہی کہانی وہی افسانہ لکھتا رہوں گا اور یہ شاید میری زندگی تک یونہی جاری رہے۔ میں اس انداز میں تو یہ بات نہیں کہوں گا لیکن میں یہ ضرور عرض کروں گا کہ تکرار کسی ایک لکھنے والے کا مرض نہیں ہوتا' مرض اگر آپ اسے کہیں تو یہ مرض سب میں پایا جاتا ہے۔ وہ بعض چیزوں کو اپنے اندر بھی Repeat کرتا ہے' اپنے اندر بھی اس کی تکرار ہوتی ہے اور اس تکرار کو وہ باہر بھی لاتا ہے۔ تو جہاں تک اس میں نئی معنوی جہت کی بات ہے تو زمانہ بدلتا رہتا ہے' حالات بدلتے رہتے ہیں' واقعات بدلتے رہتے ہیں اور چیزوں کی معنویت بھی بدلتی رہتی ہے۔ مثال کے طور پر یہ میز میں نے اس وقت ایک خاص زاویے سے یہاں رکھا ہوا ہے۔ اس کی معنویت یہ ہے کہ اس کی چوڑائی میرے سامنے ہے لیکن اگر اس کی ضرورت باقی نہ رہے اور ضرورت کی نوعیت بدل جائے تو ممکن ہے کہ مجھے اس میز کو سیدھا کرنا پڑے اور بجائے اس کے کہ اس کی چوڑائی میری طرف ہو بہت ممکن ہے کہ اس کی لمبائی میری طرف ہو تو اس بناء پر میں یہ سمجھتا ہوں کہ چیزیں اور ان کے دیکھنے کا زاویہ وقت کے سیاق و سباق کے لحاظ سے وقت کے تقاضے کے لحاظ سے بدلتا رہتا ہے تو بہت سی چیزوں کی تکرار اس وجہ سے ہوتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ ہونا چاہئے۔ بہت ممکن ہے کہ میں غلطی کر رہا ہوں لیکن میں نے بعض بڑے افسانہ نگاروں کے ہاں بھی یہ تکرار دیکھی ہے' کہ میں او ہنری کو پڑھ رہا ہوں تو

معاً- یہ دھوکا ہوا کہ میں نے اوحبری کے ہاں اس سے پہلے بھی یہ چیزیں کہیں پڑھی ہے۔ آپ نے معاً- اس کا کوئی دوسرا افسانہ دریافت کیا' معلوم ہوا کہ یہ چیزیں وہاں آئی تھی لیکن اس کی نوعیت اور تھی' کسی دوسرے طریقے سے آئی تھی' تو چیزیں جو انسان کے دماغ میں آتی ہیں' مشاہدے میں آتی ہیں اپنی نئی نئی معنوی جہتیں قائم کر کر کے آتی ہیں۔ اگر میں غلطی پر نہیں ہوں تو میرا خیال ہے کہ اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے بشرطیکہ یہ تکرار اتنی نہ ہو کہ لوگوں کو کھلنے لگے۔ اگر کھلنے لگے تو انسان کو چاہیئے کہ بدل دے۔ آخر بعض چیزیں انسان کھاتا ہے اور بعض چیزیں اس کو مرغوب ہوتی ہیں بار بار کھاتا ہے' لیکن جب ایک ہی چیز بار بار کھانے لگے تو پھر اس کو پہلے جیسا مزہ نہیں ملتا' وہ اس میں ذائقے کی تھوڑی سی تبدیلی چاہتا ہے' تو اگر ایسا ہو تو آپ مجھے متنبہ ضرور کر دیجئے گا۔

طاہر آغا صاحب کہا جاتا ہے کہ آپ اپنے افسانوں میں irony سے بڑا کام لیتے ہیں اور خالص استعاراتی اظہار پر آپ کو خوب دسترس حاصل ہے۔ کیا یہ مخصوص حالات و واقعات کی پیداوار ہے۔ یہ انداز ضرورت بن کر سامنے آیا ہے یا اسے طرز تحریر کے طور پر اپنایا گیا ہے؟

آغا سہیل نہیں میں نے عملاً- یا جان بوجھ کر تو کسی چیز کو نہیں اپنایا اور نہ اپنانے کی کوشش کرتا ہوں۔ بہت ممکن ہے کہ بعض چیزیں جو میرے شعور میں نہیں ہیں لاشعور میں ہیں اور وہ بار بار ابھر کے آتی ہیں یا کوئی خاص طریقہ اختیار کر لیتی ہیں اور یہ کہ اس میں irony ہے یا نہیں ہے یا اس کی کیا کیفیت ہے کتنی صحیح ہے' کتنی غلط ہے۔ یہ کام میرا نہیں ہے یہ تو قارئین کا ہے اور نقادوں کا ہے۔ آپ نقاد ہیں آپ فیصلہ کیجئے۔ میں اس سلسلے میں کیا کہوں۔

طاہر اکثر ترقی پسند ادیبوں کی تحریروں پر عموماً- بعض نقادوں اور خصوصاً- کلیم الدین احمد کی طرف سے یہ اعتراضات ہوئے ہیں کہ ان کی تحریروں میں ادبی محاسن عنقا ہیں اور یہ

الفاظ کی طرف سے بے اعتنائی برتتے ہیں۔ حسین الفاظ استعمال نہیں کرتے اور یہ کہ ان کی انشاء بے رنگ، خشک اور بے مزہ ہے، دوسری طرف جب ہم آپ کی تحریروں کو پڑھتے ہیں تو ان اعتراضات میں سے کسی میں بھی صداقت نظر نہیں آتی یعنی شاعری میں فیض احمد فیض نے اور نثر کے میدان میں آپ نے ترقی پسند فکر کو ایسے اسلوب میں پیش کیا ہے کہ مخالفین کو بھی اعتراف کئے بغیر مفر نہیں کیا یہ ترقی پسندوں پر ہونے والی تنقید کے رد عمل کا نتیجہ ہے؟

آغا سہیل اچھا طاہر صاحب آپ نے یہاں پھر کئی سوال کر لئے، ایک تو کلیم الدین احمد کے حوالے سے۔ جہاں تک کلیم الدین احمد کا ذہن ہے وہ کچھ مغربی ادب سے زیادہ قریب تھے اور وہ اعتراضات کچھ اسی حوالے سے کیا کرتے تھے۔ جہاں تک کلیم الدین احمد کی اس بات کا تعلق ہے کہ جو ترقی پسند لکھنے والے ہیں ان کی تحریر میں بقول ان کی جزالت نہیں ہے تو جزالت کو وہ کیا سمجھتے ہیں، دوسری بات یہ ہے کہ جو لوگ لفظوں کے لئے تحریر کی طرف مائل ہوتے ہیں میں ان کو نہ اچھا اور بڑا شاعر سمجھتا ہوں اور نہ اچھا اور بڑا نثر نگار سمجھتا ہوں۔ دیکھئے غالب نے بھی کہا تھا تو یہ کہا تھا کہ

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے
جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

تخلیق کار کے ذہن میں معنی پہلے آتے ہیں یعنی معنی اور مفہوم پہلے آتا ہے لفظ اس کے تابع ہوتا ہے۔ اگر لفظ پہلے ذہن میں آتا ہے تو معنی اس کے تابع مہمل ہوتے ہیں اور جب معنی تابع مہمل ہو جائیں تو وہ تخلیق کار اول درجے کا نہیں رہتا۔ یہ کلیم الدین احمد کیا کہہ رہے ہیں۔ دنیا کا کوئی بڑے سے بڑا شاعر قطع نظر اس سے کہ وہ ترقی پسند ہے یا نہیں وہ پہلے Conceive کرے گا معانی و مفاہیم کو اور لفظ اس کے بعد آئے گا۔ لفظ کی حیثیت ثانوی ہے۔ لفظ اس کا لباس ہے۔ لباس کی حیثیت ثانوی ہوتی ہے اس لئے کلیم الدین احمد کا

یہ جو اعتراض ہے وہ انہوں نے پہلے سے ایک مفروضہ بنا کے اس مفروضے کے بموجب اپنی بات کہی ہے۔ رہی میری بات تو میں اپنے بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں کہ اس میں کوئی خوبی ہے یا خامی ہے۔ اگر کوئی خوبی ہے تو میں یہ سمجھتا ہوں کہ قارئین کا حسن معنی ہے گویا یہ سمجھ لیں کہ ان کی تفہیم کی خوبصورتی ہے اور اگر خامی ہے تو میں اپنی تمام خامیوں کو قبول کرتا ہوں کیونکہ میں اپنے آپ کو ایک بہت معمولی درجے کا لکھنے والا طالب علم سمجھتا ہوں۔ تو اگر اس میں کچھ معنی پیدا ہو جاتے ہیں' کوئی خوبی آ جاتی ہے اور کوئی جزالت بھی ہے تو شاید اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ میں نے ہر تحریر میں کوئی نہ کوئی خوبصورتی تلاش کی ہے اور مجھے وہ خوبصورتی مل گئی ہے اور اگر وہ خوبصورتی میرے شعور یا لاشعور میں کہیں جذب ہو گئی اور وہی بار بار ابھر کر سامنے آ جاتی ہے تو یہ انہی لوگوں کا فیض ہے جن سے میں نے فیض حاصل کیا اور اگر اس میں کوئی خامی یا کمی رہ جاتی ہے تو میں نے کہا نا کہ میں اس خامی کو قبول کرتا ہوں کیونکہ میں خود کو طالب علم سمجھتا ہوں ----- طاہر صاحب آپ نے ردعمل کی جو بات کی ہے تو یہ کسی ردعمل کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ میں وہی زبان استعمال کرتا ہوں جو میرے گھریلو ماحول میں رچی بسی ہوئی تھی اور اگر اس میں جزالت بقول آپ کے پائی جاتی ہے' تو یہ میری ارادی کوشش نہیں ہوتی۔ الفاظ خود بخود مرے لاشعور یا تحت الشعور سے میرے مافی الضمیر کی ادائگی کے لئے ابلتے رہتے ہیں اور خود بخود اپنی مطلوبہ جگہوں پر پہنچ جاتے ہیں مجھے خبر بھی نہیں ہوتی۔ یہ میکانی عمل ہے اس کا تجزیہ کرنے کے لئے میرا خیال ہے عمرانی نقطہ نظر سے میرے نقادوں کو معروضی تجزیہ کرنا پڑے گا۔

طاہر آغا صاحب آپ کے ڈکشن کے بارے میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ آپ کی تحریروں کو پڑھنے کے لئے ڈکشنری کا سہارا لینا پڑتا ہے جیسا کہ ایک مرتبہ آپ سے یہ سوال کیا بھی گیا لیکن ایک دوسرے زاویے سے ٹی۔ ایس ایلیٹ کے حوالے سے اس بات کی صراحت کرتے ہوئے آپ کی تائید چاہتا ہوں۔ ٹی۔ ایس ایلیٹ کا خیال ہے کہ زمانے کی مادی تبدیلیوں کے دباؤ سے ماحول بدلتا ہے اور ہماری زبان بھی اس کے نتیجے میں مسلسل بدلتی

رہتی ہے۔ ایسی صورت میں ہمارا تعلق ماضی کے ادب سے اسی صورت میں برقرار رہ سکتا ہے کہ ہمارے پاس چند آدمی ایسے ہوں جو اپنے غیر معمولی ادراک و شعور کو اپنے غیر معمولی قدرت الفاظ کے ذریعے جوڑنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ میرے خیال میں اردو ادب میں فی الوقت یہ خدمت انتہائی خاموشی اور غیر محسوس طریقے سے آپ سرانجام دے رہے ہیں کہ کلاسیکی اور جدید ادب پر آپ کی بھرپور نگاہ بھی ہے۔ آپ کیا فرماتے ہیں اس سلسلے میں؟

آغا سہیل طاہر صاحب میں اپنے بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں لیکن جو بات آپ نے کہی ہے اس کے حوالے سے میری سمجھ میں ایک بات ضرور آتی ہے' وہ یہ کہ ہر زمانے میں لفظ اپنے اندر کئی کیفیتیں پیدا کرلیتا ہے اور اس کی وجہ بجائے خود لفظ نہیں ہوتا بلکہ خود انسان کے اندر ایک ارتقاء کا عمل ہے جو چلتا رہتا ہے۔ فرد کے اندر بھی چلتا رہتا ہے۔ معاشرے کے اندر بھی چلتا رہتا ہے۔ آج سے دو سو سال پہلے جو لفظ استعمال ہوتا تھا۔ اگر آپ اسی لفظ کو آج استعمال کریں تو اس کی معنوی جہات میں کئی گنا اضافہ ہو چکا ہوتا ہے۔ لفظ اپنے اندر معنی اور مفاہیم کے تعینات کو بدلتا رہتا ہے اور ایسا زمانی اور مکانی لحاظ سے ہوتا ہے۔ فرض کیجئے کہ دلی کے معاشرے میں ایک لفظ استعمال ہوتا تھا پچاس سال پہلے تو اس وقت دلی کی معاشرت کیا تھی' معاشرہ کیا تھا اور اس کا مبلغ علم کیا تھا' اس کی بصیرت کیا تھی' اس کے لحاظ سے اس کے معانی وہیں پر ٹھہر جائیں گے۔ جب وہاں سے پچاس سال بعد نکل کر دوسرے معاشرے میں وہ پہنچتا ہے تو زمان و مکان بدل جاتے ہیں۔ معنوی جہات بدل جاتی ہیں اور اگر دو سو سال پہلے کوئی لفظ استعمال ہوتا تھا کسی محدود معانی میں تو آج سائنس اور سائنسی مضامین کے ارتقاء کی وجہ سے اس کے معانی اور مفاہیم میں تبدیلی آجاتی ہے اور اس کی جہات بدل جاتی ہیں یا اس لفظ کے اندر جو معانی ہیں ان کے اور Shades پیدا ہو گئے ہیں کہ فرض کیجئے کہ اگر ہمارے زمانے میں بہت سی سائنس دریافت ہو چکی ہیں دو سو سال پہلے نہیں دریافت ہوئی تھیں۔ اگر پرواز کا لفظ دو سو سال پہلے استعمال ہوتا تھا تو پرواز کے کیا

معنی ہوتے تھے اور آج جب استعمال ہوتا ہے تو پرواز کے کیا معنی ہیں۔ پرواز کی اس معنویت میں تبدیلی کا عمل جاری ہوا تو سائنس اور سائنسی ترقی کی وجہ سے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کی وجہ سے اس کے تعینات بدل گئے۔ پرواز کے معنی ہی بدل گئے وہ پرواز کچھ اور تھی جو دو سو سال پہلے اس لفظ میں چھپی ہوئی تھی اور آج کی پرواز کچھ اور ہے۔ دو سو سال پہلے کی پرواز میں صرف پرندے کا تصور آتا تھا یا بہت سے بہت پری کا تصور آجاتا تھا یا تخت رواں کا تصور آجاتا تھا لیکن آج اس پرواز میں انسان کی پرواز بھی شامل ہے۔ ہوائی جہاز کی پرواز بھی ہے اور اس میں جتنی بھی خلائی پروازیں ہو سکتی ہیں وہ سب اس میں شامل ہیں' تو بتایئے معنی کہاں سے آگئے۔ ڈکشن بدلتا رہتا ہے تو اس کے معنی بھی بدلتے رہتے ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ میرے بارے میں لوگ کیا سوچتے ہیں۔ میرے فن کے بارے میں کیا سوچتے ہیں۔ میرے ڈکشن کے بارے میں کیا سوچتے ہیں لیکن میرے سامنے کبھی لفظ ہوتا نہیں۔ لفظ خود ہی آتا ہے۔ میرے پاس چل کے آتا ہے اور کبھی کبھی اگر ایک لفظ کی ضرورت مجھے محسوس ہوتی ہے تو اس جگہ پر آٹھ دس لفظ ویسے ہی آجاتے ہیں اور میں انتخاب کرلیتا ہوں کہ یہ نہیں اس کام کے لئے یا اس معنی کے لئے یا اس خدمت کے لئے یا اس مفہوم کے لئے اس لفظ کی زیادہ صحیح ضرورت ہے۔ یہ اس ضرورت کو پورا کرسکتا ہے تو ڈکشن خود بخود بنتی ہے ہر دور میں بنتی ہے' ہر فرد میں بنتی ہے معاشرے کے حوالے سے بنتی ہے اور اس کی جہات بدلتی رہتی ہیں۔

طاہر آغا صاحب کہا جاتا ہے کہ ترقی پسند ادیبوں میں ماسوائے پہلے اجلاس کے مختلف معاملات پر کبھی بھی اتفاق رائے پیدا نہیں ہوا۔ اگر ہم عصر حاضر کے حوالے سے بات کریں تو آپ کے افسانوں میں علامتی اظہار کے نمونے مل جاتے ہیں جبکہ اسی عہد میں ڈاکٹر محمد حسن علامت نگاری کو ادب اور زندگی کے رشتے کے خلاف ایک سازش تصور کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس طرح ادب اور زندگی کے درمیان ابہام کی دیوار کھڑی کردی جاتی ہے۔' آپ اس سلسلے میں کیا فرماتے ہیں؟

آغا سہیل آپ نے یہ کہا کہ پہلے اجلاس میں اتفاق تھا باقی کسی اجلاس میں اتفاق نہیں ہوا۔ تو اگر پہلے میں آپ سے یہ سوال کروں کہ وہ کون کونسے اجلاس تھے اور ان میں کہاں کہاں پر یہ اختلافی رائے پیدا ہوئی۔ اس کی کیا کوئی رپورٹ آپ کے پاس محفوظ ہے؟ ظاہر ہے کہ آپ کہیں گے کہ نہیں ہے لہذا یہ ایک سنی سنائی بات ہے۔

طاہر اس سلسلے میں وضاحتاً عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ظہیر کاشمیری صاحب کے اکثر انٹرویوز جو شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان میں انہوں نے اس کا باقاعدہ اقرار کیا ہے کہ اختلافات یا اختلافی پہلو موجود تھے؟

آغا سہیل بات یہ ہے کہ ظہیر کاشمیری صاحب کے سامنے صرف پاکستان کا معاشرہ ہے ہندوستان کا معاشرہ نہیں ہے جبکہ یہ عالمگیر تحریک ہے۔ جو انگلستان میں بھی موجود ہے' یورپ کے ملکوں میں بھی ہے۔ افریقہ میں بھی' ایشیاء میں بھی سب جگہ موجود ہے۔ ہمارے ہاں تو معاشرے میں اختلاف کے سوا کچھ ہوتا ہی نہیں رہا' لیکن ہندوستان کے اور انگلستان کے بعض اجلاسوں میں مجھے شرکت کا موقع ملا اور میں نے تو دیکھا کہ وہاں جتنی قراردادیں آئیں بالاتفاق یا تو وہ پاس ہو گئیں اور اگر اس میں جزوی اختلاف ہوا مثلاً جب انجمن ترقی پسند مصنفین کا پچاس سالہ جشن لکھنؤ میں منایا گیا تو وہاں جو اختلاف ہوا تھا وہ اردو اور ہندی کے حوالے سے تھا' باقی کوئی چیز ایسی نہیں تھی جس میں اختلاف ہو' سب میں اتفاق تھا۔ انگلستان میں بھی کچھ تھوڑے بہت فرق کے ساتھ اسی طرح ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اختلاف تو صحت مندی کی بنیاد ہے' یہ تو بہت اچھی بات ہے لیکن اختلاف اگر شخصیات کی بنیاد پر ہو تو مذموم ہے۔ ہمارے ہاں کراچی میں اجلاس ہوا۔ اختلاف وہاں بھی ہوا۔ کس چیز کا اختلاف تھا؟ وہاں پنجابی اور سرائیکی کے حوالے سے ہوا تو یہ اختلاف تو ہماری سوسائٹی میں موجود ہے۔ اس کے اظہار کے لئے ایک پلیٹ فارم کی ضرورت تھی جو نہیں ملتا تھا' انجمن ترقی پسند مصنفین کی صورت میں وہ مل گیا۔ تو یہ پلیٹ فارم کس نے فراہم کیا؟ یہ بھی تو ترقی پسندوں نے فراہم کیا۔ تو اختلاف ہمارے ہاں کس چیز میں نہیں ہے؟ یہاں تو افراد میں ہے وہ

تو ادارہ ہے اور اس ادارے کی عمر پاکستان کی عمر سے بڑی ہے۔ اس لحاظ سے اس میں تو بہت سے اختلافات ہو سکتے ہیں۔ اب رہی دوسری بات' ڈاکٹر محمد حسن نے بے شک علامت سے اس علامت سے جس میں Ambiguity ہو اختلاف کیا ہے اور اسے سازش قرار دیا ہے۔ میں بھی اسے سازش قرار دیتا ہوں۔ میں علامت کو ایک اسلوب سمجھتا ہوں اور وہ علامت جس میں Ambiguity ہو بجائے خود مذموم بھی ہے' مجہول بھی ہے' فضول بھی ہے' بیکار بھی اور سازش بھی کہ اس علامت کے چکر میں اگر ہم پھنسے رہیں تو اصل مسائل ہمارے ذہن سے محو ہو جائیں گے اور یقیناً یہ ہمارے معاشرے کے خلاف سامراج کی ایک سازش ہے۔ اس لئے میں یہ سمجھتا ہوں کہ ڈاکٹر محمد حسن کا موقف بھی اپنے اندر سچائی رکھتا ہے اور بالکل درست اعتراف ہے اور ہم بھی یہ اعتراف کرتے ہیں کہ جس علامت میں Ambiguity یا ابہام ہو اور ترسیل خیال ممکن نہ ہو وہ بیکار ہے' ورنہ ڈاکٹر محمد حسن ہی کے پرچے میں میرے افسانے چھپے ہیں۔ میرے ساتھ اور بہت سے دوستوں کے افسانے چھپے ہیں' جو علامتی ہیں اور وہ علامت Convey ہو رہی ہے۔ انہی نے اس کی تعریف کی ہے۔ انہی کے پرچے میں چھپے ہوئے وہ نوٹس موجود ہیں جس میں انہی نے تعریف کی ہے۔ مجھے اپنا ایک افسانہ یاد آتا ہے جس کا نام ہے "دروازہ بند ہے" یہ علامتی ہے۔ انہوں نے اس کی بڑی تعریف کی۔ میرا ایک ڈرامہ ان کے پرچے میں چھپا اور وہ بھی علامتی ہے انہی نے اس کی بھی تعریف کی ہے۔ تو مسئلہ یہی ہے کہ وہ اس علامت کی جو بجائے خود مبہم ہے تعریف نہیں کرتے' لیکن وہ علامت جو اپنے آپ کو Convey کرتی ہے' Communicate کرتی ہے' Dialogue کرتی ہے' آج بھی کر رہی ہے' آنے والے کل میں بھی کرے گی' وہ اس کی اہمیت سے انکار نہیں کرتے۔

طاہر آپ کا ناول "کہانی عہد زوال کی" جو تیسری دنیا کے تناظر میں ہے اور اس طرح سے پاکستان بھی اس کے موضوع کا ایک حصہ ہے بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ پاکستانی معاشرے کو مرکز یا بنیاد بنا کر آپ نے تیسری دنیا میں بہنے والے مثبت اور منفی دھاروں کو سمجھا اور

سمجھایا ہے۔ آپ یہ بتایئے کہ آپ اپنی دور اندیش نگاہوں سے تیسری دنیا کے مستقبل کو کیسا پاتے ہیں اور تیسری دنیا جس حصار میں گر چکی ہے اسے توڑنے میں کامیاب ہو سکے گی یا نہیں؟

آغا سہیل طاہر صاحب بات یہ ہے کہ تیسری دنیا جو پیدا ہوئی تو وہ پہلی اور دوسری دنیا کے گویا نظریاتی تصادم اور معاشرتی تصادم کے نتیجے میں ہوئی ہے۔ پہلی دنیا نے اس کا استحصال کیا سامراج کے ذریعے سے اور جنگوں کے ذریعے سے اور اس Exploitation کے نتیجے میں جس طرح کسی جسم میں سے خون نچوڑ لیا جائے تو اس کی حیثیت ایک مریض کی سی ہوتی ہے تو اس مریض کو غذا کی بھی ضرورت ہوتی ہے دوا کی بھی' تب کہیں اس کا وہ تن و توش جو پہلے تھا بحال ہوتا ہے۔ تیسری دنیا کے ملکوں نے دو بڑی جنگیں جھیلیں پہلی جنگ عظیم اور دوسری جنگ عظیم اور استحصال کرنے والوں نے خوب جی بھر کے اس کا استحصال کیا۔ یہ بھی آپ کو معلوم ہے کہ اس تیسری دنیا میں جو ممالک ہیں اس میں کچھ ہم سے بھی زیادہ غریب ہیں کیونکہ ان کے وسائل بہت کم ہیں اور مسائل ان کے بہت زیادہ ہیں اور کچھ ہمارے برابر ہیں' کچھ ہم سے بہتر ہیں کیونکہ یہ دونوں جنگیں جو ہوئیں ان کو ہم نے بہت دور سے یا بہت زیادہ قریب سے نہیں دیکھا تھوڑے سے فاصلے سے دیکھا ہے اور اس طرح Suffer کیا کہ جب دوسری اور پہلی جنگ عظیم ہو رہی تھی تو ہم نے افرادی قوت مہیا کی کیونکہ ہم غلام تھے اور سامراج کا حصہ تھے اور جو ہمارے Means تھے ان کو بھی انہی نے استعمال کیا اس جنگ میں پھونک دیا۔ تو آپ نے دیکھا کہ جو تیسری دنیا ایک لحاظ سے دوسری دنیا کے تھوڑا سا قریب تھی کہ زرعی معیشت کو وہ اپنی صنعتی معیشت دھیرے دھیرے بنا رہے تھے اس صدی کے شروع میں ان دونوں جنگوں کے نتیجے میں جو عمل ہمارے یہاں یعنی تیسری دنیا میں اور خاص طور پر پاکستان میں اب شروع ہوا ہے یعنی ہم اب زراعت کو صنعت بنانے پر قادر ہوئے ہیں۔ آپ نے دیکھ لیا کہ دوسری دنیا کا کیا حشر ہو رہا ہے یعنی پہلی دنیا نے دوسری دنیا کا بھی استحصال کیا اور اس کے نتیجے میں دوسری دنیا کے

بعد تیسری دنیا کا اس سے بھی زیادہ استحصال ہوا۔ اب جو استحصال کی کہانی ہے وہ آپ کو معلوم ہے میں نے آپ کو کئی بار سنائی ہے کہ جب افریقہ کا ایک ملک آزاد ہوا تو اس نو آزاد مملکت کے نو آزاد صدر سے یا وزیر اعظم سے جب سوال کیا گیا کہ اس Out going Colonialism کے بارے میں یا اس جاتی ہوئی سامراجی طاقت کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے تو اس بیچارے نے یہی کہا کہ آج سے سو سال پہلے یہ ہمارے ملک میں چلے آتے تھے اور سفید بادبانی کشتیوں سے اپنی بغلوں میں بائبل دبائے ہوئے اترے تھے تو ہم سمجھے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ہماری امداد کی ہے اور فرشتے ہماری اصلاح کے لئے بھیج دیئے ہیں۔ لیکن یہ رات دن ہمارے ملک کا سونا اپنی کشتیوں میں ڈھوڈھو کے اور لادلاد کے اپنے ملک پہنچاتے رہے۔ اب ہمارے ملک کے سونے کی آخری کشتی بھی ان کے ملک کو جاچکی ہے تو ان کی لائی ہوئی بائبلیں ہماری بغلوں میں دبی رہ گئی ہیں گویا استحصال مذہب کے نام پر بھی ہوا' مذہب کے راستے سے بھی ہوا' معیشت کے راستے سے بھی ہوا اور اصل استحصال ہوا معیشت کا۔ یہ استحصال اس ملک میں بھی ہوا اور ہو رہا ہے جو پہلی دنیا کا حصہ ہے یعنی امریکہ۔ کیونکہ اگر وہاں فلک بوس عمارتیں ہیں تو اسی کے پہلو بہ پہلو Slums بھی ہیں اور ان Slums میں رہنے والے افریقی بھی ہیں اور کچھ امریکن بھی ہیں جو پس خوردہ پر اسی طرح گزر بسر کرتے ہیں جیسے ہم اور پھٹا پرانا کپڑا بھی پہنتے ہیں۔ تو یہ تیسری دنیا یہاں سے وہاں تک آباد ہے۔ گویا یہ معیشت ہے کہ جس نے تیسری دنیا پیدا کی۔ تو یہ جو ناول میں نے لکھا ہے یہ تیسری دنیا کے تناظر میں تو ہے مگر میں تو ایک معمولی لکھنے والا ہوں۔ بڑے بڑے لکھنے والے بہت سا مزاحمتی ادب تخلیق کر رہے ہیں اور تخلیق کیا جاچکا ہے۔ یہ عمل افریقہ میں بھی ہندوستان میں بھی اور پاکستان میں بھی جاری ہے۔ اب مسئلہ یہ رہ جاتا ہے کہ اس ادب کو ہم ہی لکھتے ہیں یعنی تیسری دنیا والے اور ہم ہی اس کو پڑھ لیتے ہیں' اگر اشک شوئی کے طور پر کہیں سے کوئی چھوٹا موٹا انعام بھی مل جاتا ہے اور ہم تھوڑا بہت خوش بھی ہو لیتے ہیں تو دیکھتے یہی ہیں کہ پرنالا وہیں پر ہے یعنی حالات وہیں پر ہیں۔ استحصال ویسے ہی جاری ہے اور استحصال کی جو کیفیت ہے وہ بھی جوں کی توں موجود ہے۔ آپ دیکھ لیجئے ابھی

حال ہی میں آپ کے سامنے کیا ہوا یعنی اگر عراق نے کویت کو اپنے قبضے میں لے لیا تو امریکہ اور اس کے حواری کسی صورت سے آ کے جمع ہو گئے ہیں اور یہ حواری جو جمع ہوئے ہیں تو یہ اب نہیں نکلیں گے۔ یہ سعودی عرب میں ہوں یا عرب امارات میں ہوں یہ آکر موجود ہو گئے۔ اس کے نتیجے میں تیسری دنیا میں جو خلفشار پیدا ہوا وہ آپ کے سامنے ہے اور جو نتائج نکلیں گے وہ بھی آپ کے سامنے ہیں۔ تو یہ جو تیسری دنیا کے حوالے سے آپ نے میرے ناول کا ذکر کیا تو یہ میری چھوٹی سی معمولی اور بہت ادنیٰ سے کوشش ہے کہ میں بھی احتجاج کروں اور یہ احتجاج یا مزاحمت کی چھوٹی سی شکل ہے اللہ جانے کیا ہے کیا نہیں ہے؟ یہ تو قارئین فیصلہ کریں گے یا نقاد۔ میرے جواب کا آخری حصہ یہ ہے کہ تیسری دنیا کے ممالک عموماً۔ مفلس اور مفلوک الحال ہیں الاماشاء اللہ' اور اگر مفلس نہیں تو ان کے ذرائع آمدنی کے جملہ مفادات پر پہلی دنیا بالعموم اور اسرائیلی سرمایہ دار بالخصوص پھن کاڑھے ہوئے سانپوں کی طرح بیٹھے ہیں اور ان کا منافع ان تک نہیں پہنچنے دیتے۔ یہ استحصال کسی صورت بھی ختم ہونے میں نہیں آ رہا ہے اور فی الحال اس کے آثار بھی نہیں ہیں۔ اس استحصال کے نتیجے میں تیسری دنیا محض اقتصادی لحاظ سے کمزور نہیں بلکہ اس کے تہذیبی مضمرات بھی سامنے آ رہے ہیں۔ امریکہ جس بہانے سے سعودی عرب کے اندر گھس کر بیٹھ گیا ہے اس سے مستقبل کے لئے خطرات پیدا ہو چکے ہیں اور ان خطرات سے نبرد آزما ہونے کے لئے تیسری دنیا کے ممالک میں مطلوبہ توانائی موجود نہیں ہے بالخصوص جبکہ دوسری دنیا بھی پہلی دنیا کی دست نگر بن چکی ہے یا دوسرے لفظوں میں امریکی سرمایہ داری اسرائیلی لابی کے سامنے گھٹنے ٹیک چکی ہے۔ تاہم بہت دنوں تک یہ صورت حال باقی نہیں رہ سکتی۔ شاید اس صورت حال کو جاپان بہت لمبے عرصے تک برداشت نہ کر سکے اور ایک زیادہ توانا اقتصادی قوت بن کر ابھرے اور اپنا صحت مند کردار ادا کر سکے۔ یہ موضوع بہت اہم اور وقیع ہے اور اس وقت شمال اور جنوب کی قوتیں اور مفکرین اس کے بارے میں سوچ بچار کر رہے ہیں کتابیں لکھی جا رہی ہیں۔ شاید اکیسویں صدی میں داخل ہوتے ہوتے اس کی صورت حال زیادہ واضح ہو سکے۔

طاہر تخلیقی معیار کی بہتری کے پیش نظر کیا تخلیق کار میں اپنی تحریر کو قلم زد کرنے کا حوصلہ ہونا چاہئے اور کتنے لوگ ایسا کرتے ہیں۔ آپ کے خیال میں اردو ادب کا کتنے فیصدی حصہ قلم زد کرنے کے قابل ہے؟

آغا سہیل صاحب قلم زد تو بہت کچھ ہونا چاہئے اور لوگوں میں ہمت بھی ہونا چاہئے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے ۳۸ء سے جو افسانے لکھنا شروع کئے تو ۵۴ء تک کے سب افسانوں کو میں نے قلم زد کر دیا۔ یہاں تک کہ وہ نام جو سہیل ادیب کا میں استعمال کرتا تھا اس کو بھی رد کر دیا' کیونکہ اس میں بھی تصنع تھا اور جو افسانے منتخب کئے تھے وہ اس طرح کہ میں نے اپنے تمام افسانوں کو اپنے دوستوں کے سامنے جن میں محمد علی صدیقی' حسن عابد اور تاج سعید تھے رکھ دیا اور کہا کہ اس میں سے مجھے کوئی پچیس افسانے چھانٹ دو۔ انھوں نے پچیس کے بجائے مجھے چوبیں چھانٹ کر دیئے۔ جو میرے پہلے افسانوی مجموعے "بدلتا ہے رنگ آسماں" میں شامل ہے۔ بہت ممکن ہے کہ رد کرنے کے بعد جو کچھ میں نے منتخب کیا یہ سارے کا سارا بھی رد ہو جائے تو بھی مجھے کوئی ملال نہیں ہوگا۔ میری تحریروں میں سے چند تحریریں بھی جاندار نکلیں اور وہ کسی قابل ہو سکیں اور لوگوں کے کام آسکیں تو سمجھوں گا کہ بہت خدمت انجام دی اور باقی سب رد بھی ہو جائیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ دوسرے یہ کہ خود زمانہ بھی رد کرتا ہے اور پورے پورے مصنف اور پورے پورے شاعر اور شاعروں کی اور مصنفوں کی کھیپ کی کھیپ خود بخود رد ہو جاتی ہے۔ ویسے کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن میں رد کرنے کی ہمت ہوتی ہے مثلاً- غالب نے اپنا بہت سا کلام رد کیا ہے اور رد کرنے کی ہمت واقعی سب میں ہونا چاہئے۔

(راقم الحروف نے یہ انٹرویو ۲۳۔ اگست ۱۹۹۰ء کو ڈاکٹر آغا سہیل کے دولت کدے ۳۵۵۔ اے جوہر ٹاؤن لاہور میں لیا۔)

ڈاکٹر آغا سہیل سے چند باتیں

(ترقی پسند تحریک اور حلقہ ارباب ذوق کے حوالے سے)

سعدیہ شفقت

س: آپ کے خیال میں ترقی پسند تحریک کے بنیادی مقاصد کیا تھے؟

ڈاکٹر آغا سہیل: کوئی بھی تحریک اپنے تاریخی تناظر سے الگ نہیں ہو سکتی۔ تاریخی، عمرانی، سیاسی اور اقتصادی تقاضے ہوتے ہیں، جن کی بناء پر کوئی تحریک بنتی ہے اور چلتی ہے۔ ترقی پسند تحریک کا سب سے پہلا، سب سے اہم اور بنیادی مسئلہ یہ تھا کہ ایک طرف تو تمام دنیا میں استعماری اور سرمایہ دارانہ نظام پھیل رہا تھا۔ اس کے خلاف ایک تحریک جو سب سے پہلے اٹھی، وہ روس میں تھی اور روس میں لینن نے مارکس اور اینجلز کے خیالات اور نظریات کو سامنے رکھ کر ۱۹۱۷ء میں ایک انقلاب برپا کیا۔ وہ یہ دیکھ رہا تھا کہ جاگیردارانہ نظام اور سب سے بڑھ کر یہ کہ آمرانہ نظام نے عام آدمی کی، جو مزدور تھا یا کسان تھا، زندگی اجیرن کر رکھی تھی اور اس کے اقتصادی حالات بہت خراب تھے۔ جب روس میں یہ انقلاب برپا ہوا تو برصغیر کے بہت سے لوگوں میں، جو انگلستان میں تعلیم کے سلسلے میں گئے ہوئے تھے، ان میں سجاد ظہیر بھی تھے، تاثیر بھی تھے اور ملک راج آنند بھی تھے۔ خاص طور پر یہی تین آدمی تھے، جو آپس میں ملتے رہتے تھے، اور وہ یہ دیکھتے اور سمجھتے تھے کہ ہمارے برصغیر میں (جس میں آج بنگلہ دیش، پاکستان اور بھارت شامل ہیں) استعماری نظام ہے، کلونیلزم (Colonialism) ہے۔ جس وقت یہاں ایسٹ انڈیا کمپنی آئی، وہ آئی تو تجارت کی غرض سے تھی۔ رفتہ رفتہ اس نے اپنے پاؤں پھیلائے اور یہاں کے سیاسی حالات کو اور یہاں کی سیاسی کمزوریوں کو سامنے رکھ کر انہوں نے اپنے استعماری نظام کے پنجے گاڑ لئے اور یہاں کی جتنی دولت تھی، خواہ وہ دولت روپے پیسے کی شکل میں تھی، خواہ یہاں کے خام مال کی شکل میں اور خواہ یہاں کا وہ نظام جو محنت و مشقت سے بنتا تھا اس کا وہ استحصال کرتے تھے۔ ان سب باتوں کو سامنے رکھ کر انہوں (سجاد ظہیر، ملک راج آنند، ڈاکٹر تاثیر) نے کہا کہ ایک طرف تو ہمیں استعماریت سے نجات چاہئے اور پھر ہمارے اندر جو

خرابیاں ہیں' یعنی جاگیردارانہ نظام ہے' اس کو بدلنے کی ضرورت ہے۔ ہمارے زرعی معاشرے کو صنعتی معاشرے میں بدلنے کی اور اس پر سے سرمایہ دار کا کنٹرول ختم کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمارے یہاں کتنی باتیں تھیں کہ ایک طرف جاگیردارانہ نظام تھا۔ دوسری طرف استعماری نظام تھا۔ ہم غلام تھے۔ تیسرے ہمارا زرعی معاشرہ بیمار تھا۔ اس کو تبدیل کرنے کی ضرورت تھی۔ ان سب باتوں نے ان لوگوں کو مجبور کیا اور اپنے لندن کے زمانہ قیام میں انہوں نے اس کا باقاعدہ مشاہدہ کیا کہ ان تمام چیزوں کو دور کرنے کے لئے ہمیں ایک تحریک چلانے کی ضرورت ہوگی۔ جو ادب کے راستے سے چلے۔ ادب کے راستے سے جب یہ تحریک چلے گی تو ہم کو تینوں بیماریوں کو' جن میں استعماریت بھی ہے' اس بوجھ کو بھی اتار پھینکنا ہے۔ فرسودہ جاگیردارانہ نظام کو ختم کرنا ہے۔ کسانوں اور مزدوروں کے لئے (جیسا کہ روس میں ہوا ہے) ہم ایک انقلاب لانا چاہتے ہیں اور اس کے حوالے سے یہ تحریک چلی۔

۱۹۳۰ء میں علی سردار جعفری' سبط حسن اور اسرار الحق مجاز وغیرہ نے "نیا ادب" (لکھنؤ) وغیرہ کے حوالے سے ترقی پسند ادب کا ایک باقاعدہ تصور پیش کیا۔ اختر حسین رائے پوری نے ایک کتاب "ادب اور انقلاب" کے عنوان سے لکھ کر ترقی پسند تحریک کی بنیاد رکھ دی۔

۱۹۳۶ء میں لکھنؤ میں "انجمن ترقی پسند مصنفین" کی ایک کانفرنس ہوئی جس کی پریم چند نے صدارت کی۔ پریم چند کے صدارتی خطبے کو اگر سامنے رکھیں تو یہ واضح ہو جاتا ہے کہ وہ برصغیر میں ادب کے ذریعے سے لوگوں کو باشعور بنانا چاہتے تھے۔ ادیبوں کو احساس دلانا چاہتے تھے کہ ادب میں مقصدیت بہت ضروری ہے۔ اور ادب برائے زندگی ہوتا ہے۔ ادب برائے ادب نہیں ہوتا۔ ادب میں مقصدیت کا مسئلہ ۱۹۳۶ء کا نہیں تھا۔ ادب میں مقصدیت کا تصور' اگر آپ مقدمہ شعر و شاعری کو سامنے رکھئے تو اس وقت بھی تھا۔ سرسید احمد خان کی تحریک کے زمانے میں بھی ادب کا ایک مقصد متعین ہو چکا تھا اور اسے مقصدیت سے قطع نظر نہیں کیا جا سکتا' کیونکہ زندگی کبھی بھی بے مقصد نہیں ہوتی۔

چاہے وہ اجتماعی ہو' یا انفرادی اور انفرادی زندگی کی اتنی زیادہ اہمیت نہیں ہوتی' کیونکہ یہ تو ایک فرد اپنے لئے جیتا ہے اور اپنے لئے مرجاتا ہے۔ لیکن وہ افراد جو معاشرے پر اثر انداز ہوتے ہیں اور معاشرے کی تعمیر و تشکیل میں حصہ لیتے ہیں' وہ دراصل ایک مقصد سامنے رکھ کر آتے ہیں اور اس مقصد کو آگے بڑھاتے ہیں۔ ادب بھی اس کی تکمیل کرتا ہے۔

انجمن ترقی پسند مصنفین میں دو دھڑے تھے۔ ایک وہ دھڑا تھا' جو ترقی پسندی کو صرف اتنا سمجھتا تھا کہ روس اور روس کی تمام انجمنوں کے مینی فیسٹو کو سامنے رکھ کر اس کے بموجب ادب تخلیق کیا جائے اور ایک دھڑا ان لوگوں کا تھا' جو کہتے تھے کہ ہم ماضی کو پورے طور پر خارج نہیں کرسکتے' اس میں بھی صحت مند ادب پیدا ہوا ہے' اور صحت مند رجحانات موجود ہیں۔ سماج میں ترقی پسند اور صحت مندی کا ایک تصور ہوتا ہے۔ اور جب ایسا رجحان ہو تو ہم اسے اپناتے ہیں اور وہ حصہ جو صرف استعماری نظام پر قائم ہے' اس کو ہم چھانٹتے ہیں۔ ہم یہ نہیں کرسکتے کہ اس کو مکمل طور پر رد کردیں۔

روس میں جو انقلاب آیا تھا' اس کے بعد روس نے پرانے ادب کو مکمل طور پر رد نہیں کیا جو پرانے لوگوں نے لکھا تھا' اسے اس نے اپنایا۔ اس کے پیچھے مارکس اور اینجلز اور اس زمانے اور اس دور کے ادب کی باقاعدہ تفسیریں ہمارے سامنے ہیں' اسی لئے مکمل طور پر بہت سی چیزوں کو رد نہیں کیا گیا۔ ان کے قول کے مطابق جمالیات کا بھی ادب میں ایک تصور ہے۔ جسے ہم مارکسی جمالیات کہتے ہیں۔ مارکسی جمالیات کے بہت سے دبستان موجود ہیں۔ اس کے لحاظ سے آپ ادب کی تفسیر کریں۔ نفسیات کو ہم اپناتے ہیں۔ نفسیات کے بغیر انسان کی شخصیت کی تفہیم نہیں ہوسکتی۔ فرائیڈ کا بھی نظریہ ہے' ژونگ کا بھی اور ایڈلر کا بھی۔ فرائیڈ اگر صرف انسان کی شخصیت کو سامنے رکھتے ہیں۔ تو ژونگ آرکیٹائپل نظریات تنقید کو سامنے رکھتا ہے اور عمرانیات کو رد نہیں کرتا بلکہ یہ دیکھتا ہے کہ ہماری جو سائیکی ہے' شعور ہے' لاشعور ہے' قبل شعور ہے' ما قبل شعور ہے اس کا سماج سے کیا تعلق ہے۔ اس لحاظ سے یہ بڑی منضبط تحریک تھی۔ ہمہ گیر اور ہمہ جہت تھی۔ اس کا ماضی سے بھی تعلق تھا' حال سے بھی تھا اور مستقبل سے بھی تھا' کیونکہ مستقبل کی طرف تو ہم اس

کا رشتہ سینٹ بیو کے شاگرد طین (Taine) سے جوڑتے ہیں۔ طین کے خیال میں یہ امر ضروری تھا کہ تاریخیت (روح عصر) کا احاطہ کیا جائے اور پھر باقاعدہ تاریخیت کے حوالے سے جو تحریک چلی' وہ بہرحال کامیاب ہو گئی۔ علاوہ ازیں کچھ عرصے کے بعد مارکس اور اینجلز کے حوالے سے باقاعدہ ایک ترقی پسندی کا رجحان آیا ہے۔ لینن نے یہ نظریہ اپنے ہاں ۱۹۱۷ء میں استعمال کیا اور روس میں انقلاب برپا کیا۔ یہ انقلاب اقتصادی تھا۔ یہ آمریت' جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف تھا۔ برصغیر میں چونکہ آمریت اس شکل میں موجود تھی کہ استعماریت وہاں مکمل طور پر مسلط تھی۔ استعماریت اور جاگیردارانہ نظام کے خلاف اس تحریک کو منظم کیا گیا اور اس کے ساتھ ساتھ ترقی پسندوں نے کہا کہ ہمارے ہاں ایک اور شکل میں جو صنعتی سرمایہ داری ہے' جاگیردارانہ نظام اور استعماریت قائم ہے' ان کو بھی ختم کرنا ہے۔ یہ تحریک ان تینوں چیزوں کے خلاف تھی' لہٰذا اس کی اقتصادی' تاریخی اور معاشرتی حیثیت بھی ہے۔ اس وسیع تناظر میں یہ تحریک شروع ہوئی۔ یہ لوگ ادب کے ذریعے فکری' تہذیبی و تمدنی' سیاسی اور معاشرتی' غرض کہ ہر شعبہ زندگی میں انقلاب برپا کرنا چاہتے تھے لہٰذا یہی ان کے وسیع تر مقاصد تھے۔

س: آپ کے نزدیک حلقہ ارباب ذوق کے بنیادی مقاصد کیا تھے؟

ڈاکٹر آغا سہیل: ترقی پسند تحریک ۱۹۳۰ء سے شروع ہو کر ۱۹۳۶ء تک مکمل ہو جاتی ہے اور باقاعدہ تحریک کی صورت اختیار کر لیتی ہے' جب کہ حلقہ ارباب ذوق کی بنیاد ۱۹۳۹ء میں لاہور میں پڑی اور اس کے چند کارکنوں کے سامنے یہی مقصد تھا کہ ایک جگہ بیٹھ کر' جمع ہو کر کچھ اپنی تخلیقات کو پڑھ لیا جائے' کسی فن پارے پر تبصرہ ہو جائے اس کے سوا حلقے کی کوئی حیثیت نہیں۔ حلقے والوں نے اگرچہ اپنے مینی فیسٹو میں یہ کہا کہ سب کے لئے یعنی ہر مکتبہ فکر کے دانشوروں کے لئے اس کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ جس کا جی چاہے' اس میں شریک ہو کر اپنی چیزیں پڑھ سکتا ہے اور اس پر تنقید ہو گی۔ لیکن اس میں ایک عجیب بات یہ بھی تھی' جو انجمن ترقی پسند مصنفین کی نشستوں میں نہیں تھی وہ یہ کہ جو صاحب تصنیف ہے وہ خاموش رہے گا جب کہ انجمن ترقی پسند مصنفین نے مصنف کو اپنے نقطہ نظر

کی بھی وضاحت کرنے کا حق دیا۔ یہ ادب برائے ادب کا نعرہ لگانے والے لوگ تھے' جو جذبے' خیال اور وجدان کے حوالے سے بات کرتے تھے۔ آنکھیں بند ہیں' چلے جا رہے ہیں۔ کوئی مقصد نہیں' ایسی بے مقصد اور بے سمت تخلیق کا فائدہ کیا ہے؟ چنانچہ یہ زندگی بے مقصد ہو گئی۔ دنیا میں جو بڑے بڑے ادیان آئے ہیں اور اللہ کی طرف سے آسمان سے جو صحیفے اترے ہیں' ان کا بھی کوئی نہ کوئی مقصد تھا اور جو کتابیں اللہ کی طرف سے آئیں' وہ بھی اور جو پیغمبر آئے وہ بھی بے مقصد' تو بہ' معاذ اللہ نہ تھے۔ تو پھر تو یہ زندگی بے معنی ہے۔ جنگل کا کوئی قانون نہیں ہوتا' یہ نہیں ہونا چاہئے کہ "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" نہ پھر جاگیرداری میں کوئی عیب ہے۔ نہ سرمایہ دارانہ نظام میں کوئی عیب ہے۔ پھر تو ہم جدھر چاہیں نکل جائیں۔ جو چاہیں سو کریں' ہمیں کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں۔ کسی قسم کا قانون نہیں' ہر چیز بے مقصد جو ہے' زندگی بے لگان ہے۔ لہذا ادب کا بھی ایک مقصد ہونا چاہئے۔ تمام فنون لطیفہ کا کوئی نہ کوئی مقصد ہوتا ہے۔ اس تناظر میں انجمن ترقی پسند مصنفین قائم ہوئی اور اس نے ادب کا ایک مقصد متعین کیا اور اس اختلاف کی بنیاد پر ۱۹۳۹ء میں لاہور میں حلقہ ارباب ذوق کی بنیاد رکھی گئی۔ اس کا مقصد تو صرف اتنا تھا کہ ہمارے سامنے کوئی مقصد نہیں' بس ادب ہونا چاہئے۔ ظاہر ہے کہ اس سے پہلے بھی ادب تخلیق ہوتا رہا ہے۔ کسی شخص میں بھی وہ شاعر ہے یا ادیب اگر تخلیقی صلاحیت ہے تو وہ ادب تخلیق کرے گا۔ وہ شعر کہے گا اور نثر لکھے گا اور جدھر اس کی متخیلہ اس کو لے جائے گی' وہ چلا جائے گا۔ اس کے بموجب جیسا کہ فرائڈ نے کہا کہ اس کا لاشعور بہت طاقتور ہے اور شعور اس کے مقابلے میں کچھ بھی اہم نہیں ہے اور یہ کہ لاشعوری طور پر انسان جو کچھ کرتا ہے' وہ نیوراتیت کے تحت کرتا ہے اور ذہنی مریضیت کے تحت سب کچھ تخلیق کرتا ہے۔ لہذا اس کو کھلے عام چھوڑ دیا جائے؟ آپ کسی گھوڑے کو یوں چھوڑ دیجئے' وہ دوڑ لگاتا پھرے گا۔ کبھی آبادیوں پر چڑھ دوڑے گا تو کبھی لوگوں کو کچلے گا' مارے گا' ختم کرے گا' تو اسے بے لگام چھوڑ دیا جائے؟ حلقہ ارباب ذوق کے سامنے کوئی مقصد نہیں تھا۔ ایک تو ردعمل کے طور پر حلقہ وجود میں آیا' یعنی حلقہ والوں نے کہا کہ انجمن ترقی پسند مصنفین ہر طرف مقبول ہو رہی ہے اور اس

کے تحت ادب تخلیق ہو رہا ہے۔ ہم اس کے خلاف ہیں۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ ادب برائے ادب کا کوئی تصور نہیں۔ ہم جاگیردارانہ نظام کے حق میں ہیں۔ یا ہم مزدوروں کے بھی حق میں ہیں' کسانوں کے بھی حق میں' تو یہ کیا بات ہوئی؟۔ سچ' سچ ہے اور جھوٹ' جھوٹ ہے یا کالا' کالا اور سفید' سفید ہے۔ یہ تو نہیں ہو سکتا کہ کالا بھی اچھا ہے اور سفید بھی درست ہے۔ جھوٹ اور سچ میں سے کسی ایک کو پسند کر لیجئے' جو آپ کے زیادہ کام کا ہے۔ جو انسانی فلاح و بہبود کے لئے زیادہ بہتر ہے' لیکن حلقہ ارباب ذوق کے سامنے ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ وہ صرف انجمن ترقی پسند مصنفین کے ردعمل کے طور پر سامنے آئی تھی۔

حلقہ ارباب ذوق والے یہ کہتے تھے کہ وہ سیاسی تحریک نہیں ہیں' لیکن اس کے پس منظر میں سیاست موجود تھی۔ اس لئے کہ جب انجمن ترقی پسند مصنفین کے رجحان کو ہر طرح سے مطعون کرنا ٹھہرا تو سیاسی مقاصد تو سامنے آ گئے۔ زبان سے کہنے سے تو کوئی فرق نہیں پڑتا' بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ اس کا پس منظر سیاسی ہے۔ کیونکہ ان لوگوں کو وہ پسند نہیں کرتے تھے' جو انجمن ترقی پسند مصنفین سے وابستہ تھے' کیونکہ یہ ترقی سے خائف رجعت پسند تھے یا ان کے نظریات سے بدکتے تھے۔ شروع شروع میں حلقہ ارباب ذوق میں ایسے لوگ بھی تھے' جن کی اپنی کوئی آواز جانی پہچانی نہیں جاتی تھی اور ان کا اپنا کوئی تشخص ہی قائم نہیں ہوا تھا اور اس طرح سے وہ احساس کمتری میں مبتلا تھے۔ پھر جب پاکستان معرض وجود میں آیا تو انہیں لوگوں نے انجمن کے خلاف حلقہ ارباب ذوق کو ایک رجحان کے طور پر استعمال کیا۔ اس کے خلاف پروپیگنڈا کرنے کے لئے کہ یہ رشین لابی ہے اور ترقی پسند کمیونسٹ ہیں۔ یہ دین اور خدا کے خلاف ہیں' وغیرہ وغیرہ' یہ تمام لاحاصل اور فضول باتیں ترقی کے نظریے کے برخلاف تھیں۔ چونکہ حلقہ ارباب ذوق کے سامنے کوئی مقصدیت نہیں' وہ یہ برملا کہہ رہے ہیں کہ ہمارا کوئی مقصد نہیں ہے۔ یہ ایک ادبی انجمن ہے' لہٰذا اس کے دروازے سب کے لئے کھلے ہیں' کیا یہ بھی ایک مقصد نہیں ہے؟ کیا کوئی بات بغیر مقصد کے بھی درست ہو گی کہ وہ آنکھیں بند کر کے چلتا رہے کہ میں تو چلنے کے لئے چل رہا ہوں' بھئی آپ کو کہیں جانا ہے' کسی منزل پر پہنچنا ہے' اگر کسی منزل پر نہیں پہنچنا ہے' تو

آپ کیوں چل رہے ہیں۔ آپ اپنے آپ کو کیوں تھکا رہے ہیں۔ یعنی آپ کو چلنے سے پہلے یہ سوچنا چاہئے کہ آپ کی کیا منزل ہے؟ آپ کو کہاں جانا ہے؟ یہ تو ایک فرد کی بات تھی کیا قوموں کو بغیر سمت کے تعین کئے سفر کرنا چاہئے؟ اور کیا وہ سفر مفید ہو گا؟ لہٰذا اگر حلقہ ارباب ذوق والے یہ کہتے ہیں کہ ہمارے سامنے کوئی مقصد نہیں ہے' بس ہم ادب کے لئے کام کریں گے۔ کیا کام کر رہے ہیں؟ ادب کو کس طرف لے جائیں گے؟ مقصدیت کا تعین تو سرسید احمد خان کے زمانے میں ہی ادب میں قائم ہو گیا تھا۔ اگر ہم اسی کی اصلاح کرتے رہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے اپنی منزل کا تعین کر لیا۔ اس لئے میرے نزدیک حلقہ ارباب ذوق کا بنیادی مقصد سوائے اس کے اور کچھ نہیں تھا کہ ہم یہاں جمع ہوں گے اور اپنی تخلیقی چیزیں پڑھیں گے اور وہ چیزیں خواہ جیسی بھی ہوں بس ہوں گی' یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ اس لئے میں یہ سمجھتا ہوں کہ انجمن ترقی پسند مصنفین اور ترقی پسند تحریک دونوں ایک ہی چیز تھیں اور اس کے سامنے وسیع تر مقاصد تھے۔ اس کا باقاعدہ ایک وسیع تر پس منظر تھا۔ وہ اقتصادی بھی تھا اور تہذیبی' تمدنی اور ٹیکنیکل تھا اور اس کے سامنے سمتیں تھیں اور ان سمتوں کے لحاظ سے وہ آگے بڑھنا چاہتے تھے۔ جب کہ حلقہ ارباب ذوق بے مقصد اور بے سمت تحریک تھی اور اگر اس کے کچھ مقاصد تھے تو وہ منفی تھے اور انجمن ترقی پسند مصنفین کے رد عمل میں قائم ہوئے تھے۔

س: آپ کے نزدیک ان دونوں تحریکوں کے مشترکہ رجحانات کیا تھے؟

ڈاکٹر آغا سہیل: ان دونوں تحریکوں میں مشترکہ رجحان تو یہ تھا کہ یہ ایک جگہ جمع ہو کر اپنا کچھ تخلیقی ادب پڑھنا چاہتے تھے۔ ادب کی ترویج و ترقی چاہتے تھے۔ اگرچہ ادب کی ترویج و ترقی کے مقاصد دونوں کے سامنے مختلف تھے' لیکن کسی حد تک اشتراک اور اشتراک عمل یہاں کھل کر سامنے آ رہا ہے۔ سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ اس برصغیر میں' صرف پاکستان میں (ہندوستان میں نہیں) قیام پاکستان کے بعد ہمارے ادب پر' ہماری ثقافت پر' ہماری قومی اور تہذیب نظریات پر بنیاد پرستوں کا قبضہ ہو گیا اور بنیاد پرستوں نے اس کو ایک سیاسی رنگ دیا اور اس سیاسی رنگ دینے کی بناء پر بڑا فرق پڑ گیا۔ ایک زمانے میں

انجمن ترقی پسند مصنفین کو تو یہاں بین کر دیا گیا تھا اور حلقہ ارباب ذوق کو باقی رکھا گیا۔ بہرحال دونوں کے مابین مشترک اقدار بہت ہی کم رہے ہیں۔

س: وہ کون سے اختلافات تھے جن کی بناء پر دونوں تحریکیں علیحدہ علیحدہ رجحانات کی علمبردار تحریکیں بنیں؟

ڈاکٹر آغا سہیل: ان دونوں تحریکوں میں بہت بڑا اور بنیادی فرق ہے۔ دونوں بعد مشرقین کے بموجب الگ الگ راستوں پر چلنے والی تحریکیں رہی ہیں۔ کیونکہ ترقی پسند تحریک کے سامنے وسیع تر مقاصد تھے۔ اس کے سامنے نظریات تھے اور باقاعدہ تسلسل کے ساتھ چل رہے تھے۔ جس کی ایک کڑی کا تعلق ایشیاء سے تھا کہ وہاں پر ایک انقلاب برپا ہو چکا تھا' جو آمریت کے خلاف تھا۔ جاگیردارانہ نظام کے خلاف تھا۔ فرسودگی اور رجعت پسندی کے خلاف تھا اور اس کے علاوہ وہاں پر سرمایہ داری ایک خاص شکل میں موجود تھی کہ صنعتی نظام سے وابستہ تھی' اس کے خلاف تھا۔ حلقہ ارباب ذوق کے سامنے اس طرح کی کوئی تحریک نہ تھی اور نہ کوئی عالمگیر اور ہمہ گیر نظریہ تھا۔ یہ ایک چھوٹے سے مقام کے چھوٹے سے حلقے سے پیدا ہونے والا چھوٹا سا ادبی حلقہ تھا اور اس کے سامنے مقصدیت کسی قسم کی نہیں تھی۔ دوسری کڑی اس کی یہ تھی کہ خود اس برصغیر میں استعماری نظام اور جو تھوڑی بہت صنعت تھی' اس کے پیچھے سرمایہ دارانہ نظام بھی موجود تھا۔ یہاں پر ایک اور بھی نظام تھا' جس کو ہم بینکنگ سسٹم کہہ سکتے ہیں' یعنی مہاجنوں کا جو استحصالی نظام تھا وہ بھی موجود تھا۔ ترقی پسند تحریک ان سب کے خلاف تھی اور یہ چاہتی تھی کہ انسان کو کسی قسم کے استحصال یا جبر کا شکار نہ بنایا جائے۔ وہ آزاد رہے' اس کو ترقی کرنے کا موقع ملے۔ اس کے اوپر کسی قسم کا دباؤ نہ ہو' بلکہ آزادی کے ساتھ بغیر کسی تناؤ یا دباؤ کے فرد بھی ترقی کرے' معاشرہ بھی ترقی کرے اور جتنے بھی استحصال کے طریقے ہیں ممکنہ طور پر ان سب سے ان کو نجات مل جائے۔ حلقہ ارباب ذوق کے سامنے اس طرح کی کوئی بات موجود نہیں تھی۔ وہ صرف اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ چار آدمی اکٹھا ہو جائیں اور جس کسی نے کچھ تخلیق کیا ہے' خواہ وہ نثر کا ادب ہو' خواہ نظم کا' پڑھ دیا جائے اور اس پر تنقید ہو جائے' بلکہ تخلیق کرنے والا

خاموش بیٹھا رہے' گویا اس کی موجودگی ہی میں اس کی غائبانہ نماز جنازہ پڑھا دی جائے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین جو ترقی پسند تحریک کے زیر اثر معرض وجود میں آئی اس کی جو ادبی نشستیں ہوتی تھیں' ان میں یہ بات نہیں تھی۔ اس صورت میں ہم دیکھتے ہیں کہ ان دونوں میں کسی قسم کا کوئی اشتراک نہیں ہے' بلکہ بہت وسیع تر اختلافات کی خلیج موجود ہے۔

ایک اختلاف اور بھی ہے۔ وہ یہ کہ ترقی پسند تحریک کے سامنے چونکہ ایک مقصد تھا اور ایک مطمح نظر تھا۔ ان کے سامنے سب سے پہلے بھی مقصد یا مطمح نظر ہی ہوتا تھا' جب کہ حلقہ ارباب ذوق کے سامنے کوئی مقصد نہیں تھا' لہٰذا وہ ہیئت پر تجربے کرتے تھے اور ہیئت کو اولیت دیتے تھے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کے سامنے ہیئت ثانوی حیثیت رکھتی تھی' اور مواد اولیت رکھتا تھا۔ دوسری بات یہ کہ وہ سمجھتے رہے اور آج تک سمجھتے ہیں کہ جو مقصد ہوتا ہے' ہیئت اس کے لحاظ سے اپنی شکل خود اختیار کر لیتی ہے' لیکن حلقہ ارباب ذوق کے سامنے ہیئت کے تجربے ہی اہم تھے۔ یہ آپ اس طرح سمجھ لیں' جس صورت میں اگر پانی ہے تو پانی مقصد ہے کسی پیاسے کے لئے کہ وہ پانی پیتا ہے تو پیاس بجھالیتا ہے۔ اب یہ چیز ہے کہ پانی کس ظرف میں ملتا ہے۔ ظرف کی حیثیت ثانوی ہے۔ وہ اسے پیالی سے پیتا ہے' گلاس میں پیتا ہے' شیشے کے یا مٹی کے گلاس میں پیتا ہے' یہ تو کوئی چیز نہیں ہے' اصل چیز تو پانی ہے۔ پانی کسی ظرف میں بھی پیش کیا جائے۔ جب کہ حلقے میں صورت حال یہ تھی کہ بسا اوقات بعض لوگ تو ہیئت ہی کو کل سمجھ لیتے تھے۔ ترقی پسند تحریک کے سامنے ہیئت جزوی حیثیت رکھتی تھی۔ حلقے میں میراجی وغیرہ یا اور لوگ جو شامل ہوئے' ان کے سامنے ہیئت بڑی اہم چیز ہوا کرتی تھی اور بسا اوقات ہیئت کے لئے ہی سارے تجربات کئے جاتے تھے۔ اس لئے بھی اس طرح کی کوئی بات نہیں تھی۔ اصل میں جب مقصد نہ ہو' کوئی مضبوط اور منضبط نظریہ اور خیال نہ ہو تو ادب بے راہ رو ہو جاتا ہے' پھر اس کی حیثیت وہی ہوتی ہے' جیسے خود رو پودے ہوتے ہیں۔ جھاڑ' جھنکاڑ ہوتا ہے۔ ہم باغبان یا مالی کس لئے رکھتے ہیں' وہ تو اسی لئے رکھا جاتا ہے کہ جھاڑ جھنکاڑ سے باغ کو صاف کر کے اور عام روشوں کو قطع و برید کر کے اسے خوبصورت اور حسین بنائیں' سو ترقی پسند تحریک کے

سامنے یہی چیزیں تھیں۔

تحریک یہ چاہتی تھی کہ دنیا میں جس قدر بھی سائنس اور ٹیکنالوجی کے تجربے ہو رہے ہیں اور جس سے انسان کو من حیث الفرد یا من حیث الجماعت یا قوم معاشرتی سطح پر فائدے پہنچ رہے ہیں' ان کو اپنایا جائے۔ ہم رجعت پسندی' اختیار نہ کریں۔ یعنی اگر یہ جیٹ کا زمانہ ہے تو کوئی بیل گاڑی پر نہیں چلے گا۔ اگر کوئی بیل گاڑی پر چلے گا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے صنعتی دور سے سمجھوتا نہیں کیا۔ وہ پیچھے چلنے پر آمادہ ہے۔ آگے نہیں جانا چاہتا۔ یعنی یہ تحریک رجعت پسندی کے خلاف تھی' جب کہ حلقے کے سامنے ایسی کوئی بات نہیں تھی' وہ آگے بھی چلتے تھے اور پیچھے بھی۔ وہ یہ بات بھول جاتے تھے کہ ہماری قومی' ملکی اور اجتماعی زندگی کیا ہونی چاہئے۔ یعنی منزل کا کوئی تعین ان کے سامنے نہیں تھا۔ اس لحاظ سے ہم یہ کہتے ہیں کہ ان دونوں میں بنیادی فرق تھا۔ اس بنا پر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ترقی پسند تحریک زیادہ کارآمد رہی۔ اس کا اپنا ایک مقام تھا۔ اگرچہ پاکستان میں کچھ عرصہ کے بعد تحریک پر بھی اور ترقی پسند مصنفین کی انجمن پر بھی پابندی عائد ہو گئی اور اس پابندی کے عائد ہو جانے کی وجہ سے ایک پلیٹ فارم چونکہ ختم ہو گیا' اس لئے بہت سے ترقی پسندوں کو اپنے ادبی مشاغل جاری رکھنے اور لوگوں تک پہنچانے کے لئے کبھی کبھی اس پلیٹ فارم کو استعمال کرنے کا موقع ملا۔ یا انہوں نے اس کو استعمال کیا۔ بدرجہ مجبوری اس کو استعمال کیا۔ یعنی جب کوئی گاڑی کسی اور پلیٹ فارم سے نہ جا رہی ہو تو آپ کو کسی نہ کسی پلیٹ فارم سے چلنا تو ہے۔ دوبارہ اس پلیٹ فارم کو اس صورت سے یہ جبر و اکراہ استعمال کیا گیا' ورنہ اس کی تجدید کو جو مسدود کر دیا گیا' وہ ترقی پسندوں پر بخوبی عیاں ہے۔

س: آپ ترقی پسند تحریک سے بھی متاثر رہے ہیں اور حلقہ ارباب ذوق کے بہت سے اجلاس کی صدارت بھی فرما چکے ہیں' کیا یہ دونوں صورتیں محض ادب پروری کے لئے ہیں' یا آپ کے خیال میں ان دونوں ادبی تحریکوں میں کوئی فرق نہیں؟

ڈاکٹر آغا سہیل: صدارت کرنے سے کوئی ایسی بات نہیں۔ انجمن یا تحریک اس کے لئے رکاوٹ نہیں بنتی۔ میرے نظریات وہی ہیں۔ میں حلقے کو ایک معمولی اور ادنیٰ درجے کی

محدود تحریک سمجھتا ہوں۔ اس سے ادب کو اگر کوئی فائدہ پہنچا ہے تو بہت تھوڑا اقل قلیل اور بہت وقتی اور یہ ایک متبادل صورت حال کے تحت پہنچا ہے۔ تحریک کو روک دینے کا جو خمیازہ ہم نے بھگتا ہے۔ اس میں یہ بھی ہے کہ بنیاد پرستوں نے ہمارے لئے بہت سی رکاوٹیں پیدا کر دیں اور ذہانت و فطانت اور ترقی و ارتقاء کے سرچشمے کو روک دیا گیا اور اس کی وجہ سے ہمارے معاشرے میں خرابیاں پیدا ہوئیں۔ ہر قسم کے فسادات پیدا ہو رہے ہیں۔ لوگوں کی سوچ محدود ہو گئی ہے اور اس بناء پر اب ہماری ترقی کی رفتار وہ نہیں' جو ہونا چاہئے تھی۔ ہماری تربیت صحیح خطوط پر نہیں ہو سکی۔ ہمارے تعلیمی اداروں سے جو بچے نکل رہے ہیں' وہ دنیا کے تعلیم نظام سے لگا نہیں کھاتے اور ان کا ذہن ان کے مقابلے میں پس ماندہ اور بہت پیچھے رہ گیا ہے۔ یہ سب ذہانت و فطانت کے چشمے کو روک دینے کے نتیجے میں ہوا ہے۔ حلقہ ارباب ذوق کے سامنے کوئی مقصد نہ تھا۔ اس لئے اس کو اس پر اصرار تھا کہ خارجی چیزوں کو دیکھیں کہ لفظ کیا ہے؟ عبارت کیا ہے؟ تشبیہ و استعارے' علم بدیع و بیان کے چکر میں پھنسے رہیں یا ہم سکتوں' مسوتوں کے چکر میں' یعنی سافتیات کے چکر میں پڑے رہیں' گویا تخلیق کے اصل مقاصد سے ہماری توجہ ہٹا دی جائے تو اس بناء پر میں یہ سمجھتا ہوں کہ اگر کبھی کسی ادبی انجمن میں مجھے صدارت کرنا پڑی تو حلقے کی بھی صدارت کر دی۔ حلقے کے کسی اجلاس میں چلے جانے میں کوئی مضائقہ نہیں' اس لئے کہ دوسرا کوئی اور پلیٹ فارم موجود نہیں۔ پلیٹ فارم اگر کوئی موجود ہو تو یقینی طور پر دو چیزوں سے کسی ایک کا انتخاب انسان کر سکتا ہے۔ مگر یہاں پر کوئی دوسری چیز ہی موجود نہیں۔ اس کے راستے ہی کو روک دیا گیا ہے۔ بالکل اسی صورت میں جیسے کسی راستے میں آپ رکاوٹ کھڑی کر دیں کہ یہ گاڑی آگے نہیں جائے گی۔ دوسرے راستے بنے ہیں' وہاں چلے گی۔ ہم چلنا تو چاہتے ہیں مگر راستہ بند ہے۔ اس بناء پر میں سمجھتا ہوں کہ یہ کوئی بدعت نہیں ہے۔ کیونکہ اگر کوئی متبادل صورت حال نہیں ہے اور کوئی راستہ نہیں ہے' کسی نہ کسی راستے پر تو چلنا پڑتا ہے اور کسی نہ کسی صورت سے اپنی بات کو پہنچانا پڑتا ہے' چاہے جس صورت میں بھی۔ آپ نے دیکھا کہ کبھی پابندیاں لگ جاتی ہیں تو علامت کی صورت میں یا کسی اور شکل میں۔ جو

تخلیق کار ہوتا ہے' وہ اپنی بات کہنا چاہتا ہے' دوسروں تک پہنچانا چاہتا ہے۔ خیال کو تو وہ پہنچا دیتا ہے' بالکل اسی صورت میں ہمارے لئے بھی یہ مجبوری ہے کہ جب انجمن یہاں موجود ہی نہیں اور اس کا پلیٹ فارم بند ہو چکا ہے تو کسی نہ کسی پلیٹ فارم سے جا کے اپنی بات کو دوسروں تک پہنچانا ہمارے لئے ضروری ہو جاتا ہے۔

س: ایک زمانے میں ترقی پسندوں نے حلقہ ارباب ذوق کا علمی و ادبی سطح پر بائیکاٹ کر دیا تھا۔ کیا آپ اس طرز عمل اور طریق کار سے متفق ہیں؟

ڈاکٹر آغا سہیل: میں بالکل متفق ہوں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جب حلقے کے رجعت پسند اس پلیٹ فارم کو استعمال کرنا چاہیں' جیسا کہ فرض کریں کہ گاڑی مغرب کی طرف جا رہی ہے اور وہ کہیں کہ ہم کو مشرق کی طرف جانا ہے تو گاڑی کا انجن پلٹایا تو نہیں جا سکتا۔ میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ پلیٹ فارم ہی دوسرا تھا۔ یہاں رجعت پسندی کی ضرورت نہیں تھی۔ گاڑی پیچھے کی طرف نہیں چل سکتی تھی۔ ریورس گیئر میں نہیں چل سکتی تھی۔ آگے کی طرف چل سکتی تھی' تو وہ ادب جو عوام کی فکر کو زنگ لگاتا ہو' یا اس کی فکر کو آگے بڑھنے سے روکتا ہو' یا ایسی تحریک اس پلیٹ فارم سے شروع ہو' جو پیچھے کی طرف دیکھ رہی ہے' آگے کی طرف نہیں بڑھتی' تو ایسے موقع پر پابندی لگانے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ ترقی پسند تحریک کے جو مقاصد تھے' ان مقاصد کی خلاف ورزی کرنے والے اسی پلیٹ فارم سے اگرچہ اپنی بات کہنا چاہتے ہیں تو یہ ناز یبا بات ہے اور اسی لئے ترقی پسندوں نے بائیکاٹ کیا اور یہ درست تھا۔ اب اگر یہ کہا جائے کہ حلقے والوں نے ترقی پسندوں کو اپنی محفلوں میں آنے سے نہیں روکا' اس کے دروازے تو ہر ایک کے لئے کھلے ہوئے تھے' تو یہ بھی ان کی مجبوری تھی۔ دونوں کی مجبوری تھی۔ ایک تو یہ مجبوری تھی کہ ترقی پسند تحریک کے ذریعے ہی صحیح اور صالح ادب پیدا ہوا اور وہ جو ادیب و شاعر فعال تھے' اگر وہ اپنی بات کہنا چاہتے ہیں تو انہیں کہنے کا موقع انہیں فراہم کرنا ہی چاہئے تھا' ایک تو یہ' پھر دوسرے یہ کہ اگر وہ ان کو جگہ نہ دیتے تو پھر حلقے میں اور کتنے تھے' جو حلقہ چلا سکتے تھے اور وہ ادبی تحریکیں کسی صورت سے آگے بڑھ سکتی تھیں۔ ادب کے نام پر ہی سہی' ان کو یہاں جگہ دینا پڑتی تھی

اور ان کے لئے کوئی اور متبادل راستہ نہیں تھا۔ کیونکہ سارے پلیٹ فارم بند ہو چکے تھے۔ اس لئے بہرصورت اس میں کوئی مضائقہ نہیں تھا۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ اگر انہوں نے بائیکاٹ کیا تھا تو وہ بھی درست تھا اور انہوں نے اگر بائیکاٹ نہیں کیا اور ان لوگوں کو آنے دیا' تو یہ بھی درست تھا۔ اس لئے کہ حلقے میں وہ بہت سے لوگ شامل نہیں تھے یا بعد کو شامل ہو گئے جن کے پاس کوئی بھی پلیٹ فارم نہیں تھا۔ اپنی بات کو کہنے کا اور پہنچانے کا۔ ایک زمانے میں لاہور کی حد تک دو حلقے تھے' ایک ادبی اور دوسرا سیاسی' جس کو سیاسی کہا جاتا تھا' وہی حلقہ ترقی پسند تھا اور جس کو ادبی کہا جاتا تھا۔ وہ رجعت پسندوں کا حلقہ تھا۔ یعنی وہ خالص اس حلقے کی تحریک کو باقی رکھنا چاہتے تھے' جس میں قیوم نظر وغیرہ شامل تھے' تو اب ایسی صورت میں کہ جو سیاسی حلقہ تھا اور اس میں ترقی پسند شامل تھے' وہی اس بات کی نشاندہی کر رہا ہے کہ وہ سمجھتے تھے فرد کو بھی اور معاشرے کو بھی ترقی کرنا ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کو اپنانا ہے۔ ادب میں اس کو جذب کرنا ہے اور وہ ورثہ جو ماضی سے ہم کو منتقل ہوا ہے' اس کو سنبھال کر بھی رکھنا ہے' آگے بھی بڑھانا ہے اور دوسری نسلوں تک اس کو پہنچانا ہے۔

س: عصر حاضر میں ترقی پسند تحریک اور حلقہ ارباب ذوق کس حد تک اپنا کردار ادا کر رہی ہیں؟

ڈاکٹر آغا سہیل: ترقی پسند تحریک تو کسی نہ کسی شکل میں جاری ہے' اگرچہ منظم نہ سہی' اپنے پلیٹ فارم سے نہ سہی' کسی بھی پلیٹ فارم سے آگے رسالوں' کتابوں اور اخباروں کی صورت میں تحریک جاری ہے۔ یہ عمل جاری رہتا ہے' کیونکہ یہ فطری عمل ہے جس صورت میں دریا کے بہاؤ کو کوئی نہیں روک سکتا' اسی صورت سے ترقی پسند تحریک کو بھی کوئی روک نہیں سکتا۔ البتہ حلقہ ارباب ذوق' جیسا کہ میں نے کہا' اب اس میں بہت سے ترقی پسند عناصر موجود ہیں کہ اب ان کے پاس متبادل کوئی پلیٹ فارم نہیں ہے اور انجمن پر قدغن لگے ہوئے ہیں' صرف کراچی میں انجمن اپنا کردار ادا کر رہی ہے۔ پابندی بدستور جاری ہے' اس لئے وہ کبھی جمہوریت پسند' کبھی سیاسی اور کبھی ثقافتی شکل میں اپنے منشور کو

پیش کرتے رہتے ہیں اور یہ عمل بہرحال جاری رہے گا۔ نام پر پابندی لگا دینے سے کچھ نہیں ہوتا' کیونکہ یہ انسان کا اپنا ذاتی مسئلہ نہیں ہے۔ کسی فرد کی پسند و ناپسند کا مسئلہ نہیں' بلکہ نوعِ بشر کا مسئلہ ہے اور نوعِ بشر کے مفادات بہرحال جاری رہتے ہیں۔ تحریک تو جاری ہے اور جاری رہے گی' البتہ ترقی پسند تحریک کے زیر اثر انجمن کا جو کردار تھا' وہ پاکستان میں اب جاری نہیں ہے۔ ہندوستان' بنگلہ دیش اور دوسرے ملکوں میں یہ عمل تحریک کی شکل میں بھی جاری ہے۔

اصل میں قصہ یہ ہوتا ہے کہ جب تحریک کو پھلنے پھولنے کا موقع فراہم ہوتا ہے' تو اس قوم کو' ملک کو ترقی کا موقع ملتا ہے اور قوم بڑی استواری اور مستعدی کے ساتھ چل سکتی ہے۔ چونکہ اسی سے ایک اچھا' صحت مند معاشرے بھی بنتا ہے اور سائنس و ٹیکنالوجی کی ترقی کا عمل بھی جاری رہتا ہے۔ زرعی معاشرہ' صنعتی معاشرے میں ڈھلتا ہے اور صحیح طور پر جمہوری نظام بھی قائم ہوتا ہے اور اگر اس عمل کو روک دیا جائے' یا اس پر بند باندھ دیئے جائیں تو پھر اس کی منفی قوتیں اس کے خلاف پنپنے لگتی ہیں۔ نتیجتاً ان لوگوں کو موقع ملتا ہے' جو بنیاد پرست ہوں' رجعت پسند ہوں یا معاشرے میں ابتری پیدا کرنے والے لوگ ہوں یا جو معیشت کو اپنے کاروبار کے طور پر استعمال کرتے ہوں یا جو اسمگلر ہوں' ڈرگ مافیا کا کاروبار کرتے ہوں۔ ان کو موقع ملتا ہے۔ آپ کو خیال ہوگا' ایک تو ہمارے یہاں تبدیلیاں ہوتی ہیں' جن تعلق ان قوتوں سے ہوتا ہے' جو ہم کو استعمال کرتی ہیں۔ یعنی ہم تو تیسری دنیا کے ممالک میں شامل ہیں۔ لہٰذا ہم پہلی دنیا کے ہدف بنتے ہیں۔ پہلی دنیا سرمایہ داروں کی دنیا ہے اور سرمایہ داروں کی دنیا جو ہے' وہ ہمارا استحصال کرتی ہے اور ہماری حیثیت ایسی ہی ہے کہ استعمار کے ذریعے ہمارے جسم سے سارا خون نکالا جاچکا ہے۔ پھر بھی جونکیں چمٹی ہوئی ہیں اور جسم سے برابر خون نکال رہی ہیں۔ منفی قوتوں کے آنے سے' استعماری نظام کے آنے سے' سرمایہ داری کے پنپنے سے' غلط قوتوں کے پنپنے سے' اسمگلنگ کے جاری رہنے سے' منشیات کا کاروباری جاری رہنے سے کہ یہ سب منفی قوتیں ہیں' معاشرے کو داغدار بناتی ہیں۔

ایک تو خلیج کی جنگ نے ہمیں کہ ہم ویسے ہی پسماندہ تھے' نقصان پہنچایا اور یہ جنگ پہلی دنیا نے کرائی اور مزے کی بات یہ ہے کہ "میاں کا جوتا اور میاں کا سر" ساری جو قوت و طاقت تھی' اس کا سرچشمہ سعودی عرب تھا اور سعودی عرب ایک مسلمان ملک تھا' انہیں کی تمام چیزیں تھیں اور مسلمانوں کے خلاف ہی استعمال ہو رہی تھیں۔ مجموعی طور تیسری دنیا کو نقصان پہنچ رہا تھا۔ اس کے اثرات ہم تک بھی پہنچے' جو منفی ہیں اور ہماری ترقی جو تھوڑی سی ہوئی تھی' اس کو سخت نقصان پہنچا۔ ہمارے محنت کش طبقے کو بھی اور وہ لوگ جن کے ذریعے تھوڑا بہت پیسہ ملک میں آ جاتا تھا۔ وہ رستہ بھی رک گیا' لیکن اسمگلنگ کے راستے کھلے رہے۔ کالے دھندوں کا کاروبار چلتا رہا۔ منشیات کا کاروبار چلتا رہا۔ ۱۹۹۷ء میں ہانگ کانگ کا جزیرہ جو فری پورٹ ہے' یہ چائنا کے حوالے کر دیا جائے گا۔ یہ جو فری پورٹ میں تمام کالے دھندے ہوتے ہیں' قحبہ خانے بھی کھلے ہوئے ہیں' شراب خانے' منشیات کے اڈے' سمگلر بھی موجود ہیں' سارے کالے دھندے ہو رہے ہیں۔ یہ تمام سرگرمیاں دھیرے دھیرے جو کراچی میں منتقل ہو رہی ہیں' ان کی وجہ یہی ہے کہ وہ تمام منفی قوتیں اپنے مرکز کی تلاش میں ہیں اور اپنے مرکز کو ہانگ کانگ سے کراچی کی طرف منتقل کرنا چاہتی ہیں۔ آج جو سوکالڈ (Socalled) یا نام نہاد جمہوری قوتیں ہیں' جو اسمبلیوں میں بھی موجود ہیں اور جو کالے دھندوں میں ملوث ہیں۔ جن کے چہرے نظر کچھ اور آ رہے ہیں' لیکن انہوں نے اپنے چہروں پر نقابیں اوڑھ رکھی ہیں اور اپنے چہروں پر بنے چہرے چڑھا رکھے ہیں کہ بظاہر وہ بڑے معصوم نظر آتے ہیں' مگر درپردہ وہ کالے دھندے کر رہے ہیں۔ وہی اس کے محرک ہیں' ڈاکے بھی وہی ڈلواتے ہیں۔ ڈاکوؤں کے ذریعے لوگوں کو یرغمال بنانے والی بات ہے' یہ بھی وہی لوگ کر رہے ہیں۔ انہیں کے اڈے چل رہے ہیں۔ انہیں کی تمام کالی چیزیں جاری و ساری ہیں تو یہ نتیجہ اس بات کا ہے کہ ہمارے ہاں صحت مند ترقی پسند تحریک موجود نہیں ہے۔ معاشرہ بیمار اور مفلوج ہے۔ لوگوں کے ذہن بیمار ہیں۔ لوگ' معاشرے' قوم اور ملک کے مفادات کو پیچھے ڈال کر اپنے ذاتی مفادات کا سوچ رہے ہیں' کیونکہ ترقی پسند تحریک یہاں موجود نہیں ہے۔ رجعت پسند تحریک یہاں جاری ہے۔ اس

لئے اگر دیکھا جائے تو جو ادبی انجمنیں ہیں' ان کا کوئی کردار نہیں ہے ان کا اس لئے کوئی رول نہیں ہے کہ ان کی تعداد بھی کم ہے۔ ان کی بات بھی ان تک نہیں پہنچتی' جو معاشرے کی تشکیل کرتے ہیں۔ لوگوں کے پاس تعلیم بھی نہیں ہے۔ لوگوں کی صحیح تربیت بھی نہیں ہوئی ہے' تو خواہ وہ ترقی پسند تحریک ہو' خواہ حلقہ ارباب ذوق ہو' یہ دونوں ہی اگر فعال ہو جائیں' اس صورت حال میں' اس مجبوری میں اور ان مواقع میں اپنا صحیح کردار ادا نہیں کر رہی ہیں اور کر بھی نہیں سکتیں' اگر اپنا کردار ادا کرنے کے قابل ہو جائیں تو جمہوری قدروں کو فروغ ہو سکتا ہے۔

س: آپ کے خیال میں ان دونوں تحریکوں میں سے کس نے علم و ادب کے میدان کارہائے نمایاں انجام دیئے۔

ڈاکٹر آغا سہیل: حلقہ ارباب ذوق ایک بہت ہی محدود قسم کا حلقہ ہے۔ ہمارے پاکستان میں ایک چھوٹا سا یونٹ ہے' اس نے بہت ہی کم مثبت کردار ادا کیا ہے۔ اس لئے کچھ لوگوں نے اس کو لندن اور بیڈ فورڈ وغیرہ میں چلانے کی کوشش کی' تو ان کو خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی۔ لیکن انجمن ترقی پسند مصنفین اس پورے برصغیر میں پہلے بھی موجود تھی اور اب بھی پھیلی ہوئی ہے۔ سوائے پاکستان کے۔ پاکستان میں اس کے لئے اب تک کوئی مناسب پلیٹ فارم نہیں ہے' لیکن ہندوستان میں اس کے لئے پلیٹ فارم ہے یا لندن وغیرہ میں ہے۔ جہاں اس کے لئے پلیٹ فارم ہے' وہاں وہ اپنا کام جاری رکھے ہوئے ہے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین اور حلقے کا کوئی مقابلہ نہیں۔ سوائے اس کے کہ چند پڑھے لکھے لوگوں نے حلقے کا لیبل لگا کر چند چیزیں تخلیق کر دیں جو انجمن کے کسی صورت بھی مدمقابل نہیں ہیں۔

تبصرے

٭ تبصرے

آغا سہیل کی منتخب تصانیف کے حوالے سے

رئیس امروہوی

احمد ندیم قاسمی

خدیجہ مستور

ڈاکٹر محمد علی صدیقی

ڈاکٹر سلیم اختر

ڈاکٹر سہیل احمد خان

ڈاکٹر انور سدید

سحر انصاری

زرینہ اجمل

آغا سہیل کی منتخب تصانیف پر تبصرے

مرتب

ڈاکٹر آغا سہیل عصر حاضر کے ایک معتبر تخلیق کار ہیں یہی سبب ہے کہ برصغیر پاک و ہند کے تمام معروف ادیبوں اور نقادوں نے ڈاکٹر آغا سہیل کی شخصیت اور فن کے ساتھ ساتھ ان کی تصانیف پر بھی گراں قدر آرا پیش کی ہیں۔ ذیل میں آغا سہیل کی تصانیف پر کئے گئے بے شمار تبصروں میں سے چند نمونے کے طور پر پیش کئے جا رہے ہیں۔ ان منتخب کردہ تبصروں کی دو جہتیں اہم ہیں اول یہ کہ یہ عہد بہ عہد لکھے گئے تبصرے آغا سہیل کے ارتقائی سفر کو سمجھنے میں ممد و معاون ہو سکتے ہیں اور دوم یہ کہ ان مبصرین میں عصر حاضر کے نامور ناقدین رئیس امروہوی' احمد ندیم قاسمی' ڈاکٹر سہیل احمد خاں' ڈاکٹر انور سدید' پروفیسر سحر انصاری' ڈاکٹر محمد علی صدیقی' ڈاکٹر سلیم اختر اور زرینہ اجمل شامل ہیں اس کے ساتھ ساتھ خدیجہ مستور کے تبصرے نے اس حصے کی وقعت میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔ (مرتب)

<u>غبار کوچہ جاناں</u>

خدیجہ مستور

بازار میں ناولوں کی گرمی بازار ہے' مگر ان تصانیف میں خواتین کا حصہ زیادہ ہے "اداس نسلیں" کے بعد "غبار کوچہ جاناں" نے مرد ناول نگاروں کے جمود کو توڑا ہے جس سے فکر و نظر کی روشنی میں تخلیق کے نئے راستے متعین کئے جا سکتے ہیں۔ جن لوگوں کو آج کل کے ادب سے کھوکھلے پن کی شکایت ہے' ان کی تشفی آغا سہیل نے اس یقین کے

ساتھ کرادی ہے کہ ادب میں نظریوں کے اظہار کے باوجود اس کے جمالیاتی پہلو کو برقرار رکھا جاسکتا ہے۔

یہ ناول ایسے دور کی کہانی ہے جو پاک و ہند کے مسلمانوں کے لئے ذہنی کشمکش، کرب اور اضطراب کا دور تھا۔ خاص طور سے اس علاقے کے مسلمانوں کے لئے بے یقینی اور بے اعتباری کی کیفیت پیدا کر دی تھی، جو اب بھارت کا حصہ ہے۔ ایک طرف مدتوں کے بعد آزاد فضا میں جینے کا مسرت افزا تصور تھا اور دوسری طرف وہ مٹی دامن پکڑ رہی تھی، جس کی بو باس رگ رگ میں سما چکی تھی۔ شک اور گمان کے اس راستے پر آدرش پرست اور انٹلکچوئل افراد گومگو کے عالم میں تھے۔ جس مٹی سے ان کا خمیر اٹھا تھا جس کی ملک زندگی سے ہم آہنگ ہو چکی تھی، وہ بھی پیروں تلے سے کھسک رہی تھی۔ مسلمانوں پر ایک دور یہ بھی آیا کہ آسمان سخت اور عرصہ زمین تنگ ہو گیا اور انہوں نے اس ذہنی خلفشار کے بدلے آزاد سرزمین میں ذہنی من مانی کر کے لئے۔ "غبار کوچہ جاناں" ایسے ہی نفسیاتی مسئلوں کی ادبی توجیہہ ہے۔ ایک طرف وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے آدرش کی خاطر زندگی کے ہر لاحصے کو توڑ لیا اور تہی دستی قبول کر لی اور دوسری طرف معاش کے ستائے ہوئے وہ لوگ ہیں کہ جن کی بھوک نے جائز و ناجائز کی تمیز اٹھا دی۔ آغا سہیل نے اپنے کرداروں میں ان مسئلوں کو مجسم کر دیا ہے اور پھر اس خوبصورتی سے نبھایا ہے کہ کردار اور اس کی تجسیم میں کوئی فاصلہ باقی نہیں رہا۔ معیاری ادب وہ ہے جہاں در چہ ادب نظریات کو اپنے رنگ میں جذب کر لے۔ غبار کوچہ جاناں اس معیار پر پورا اترتا ہے۔ جہاں تک ناول کی زبان و بیان کا تعلق ہے وہ اردو کے بدلتے ہوئے رجحان کی علم بردار بھی ہے اور خالص تہذیبی ورثہ سے متعلق بھی۔ اس بات کی امید کی جاسکتی ہے کہ آغا سہیل اس ناول کو چراغ راہ سمجھ کر ادب میں نئی نئی منزلوں کا تعین کریں گے۔

(روزنامہ امروز لاہور، ۱۳ اکتوبر ۱۹۶۸ء)

<u>بدلتا ہے رنگ آسماں</u>

احمد ندیم قاسمی

آغا سہیل کے چودہ افسانوں کا یہ مرقع شاید اس لئے فوری طور پر درخور اعتنا نہ سمجھا جائے کہ آغا سہیل کا ذکر نئے افسانہ نگاروں کی فہرست میں ذرا کم ہی دیکھنے میں آتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ آغا سہیل فیشن ایبل افسانہ نگار نہیں ہیں' صرف افسانہ نگار ہیں۔ وہ ایک سچے اور کھرے افسانہ نگار ہیں۔ اس لئے نہ علامت بازی کے فتنے میں پڑتے ہیں اور نہ ماورائی قسم کا انداز اختیار کر کے اپنے قاری کو کہانی سنانے کی بجائے اس چکر میں ڈالتے ہیں کہ بوجھو تو جانیں!انہوں نے افسانہ نگاری کا فن مغرب کے اساتذہ کے علاوہ منشی پریم چند' سعادت حسن منٹو' کرشن چندر' عصمت چغتائی اور ہاجرہ مسرور سے سیکھا ہے۔ چنانچہ وہ اردو افسانے کی عظیم روایات کے سلسلے کی ایک ایسی کڑی ہیں جس کو نظرانداز کر کے ہم افسانے کے ارتقائی سفر ہی سے انکار کا ارتکاب کریں گے۔

آغا سہیل کے یہ افسانے موضوعات' کہانی کی بنت' زبان و بیان اور سلیس انداز اظہار کے لحاظ سے جدید افسانہ نگاری کے سنگ میل ہیں۔ ابھی کچھ عرصے بعد جب افسانے کو پھر سے افسانہ سمجھا جانے لگے گا تو ناقدین ادب کو احساس ہوگا کہ اس ہیجانی دور میں بھی ایک ایسا نوجوان افسانہ نگار تخلیق فن میں مصروف تھا جو افسانے کی روایت کو انتہائی خود اعتمادی کے ساتھ آگے بڑھا رہا تھا اور جس نے ثقافت مشہور ہو جانے کے ٹوٹکوں سے ایک فنکارانہ استغنا کے ساتھ اجتناب برتا تھا مگر افسانہ ایسا لکھتا تھا کہ ہر افسانے کے ساتھ اردو افسانہ نگاری کی روایت چمک دمک اٹھتی تھی۔

بظاہر ننھے ننھے مگر معاشرتی' معاشی' تہذیبی اور سیاسی لحاظ سے نہایت بلیغ موضوعات کو اپنے افسانوں میں سمو کر آغا سہیل نے ایک باشعور فنکار ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ کردار نگاری اس کے فن کا جوہر خاص ہے۔ اس کے تخلیق کئے ہوئے کردار "بدلتا ہے رنگ آسماں" کے صفحات میں سے جیتی جاگتی صورت میں برآمد ہوتے اور قاری کے دل کے پاس آبیٹھتے ہیں۔ ہمیں باقاعدہ ان کے جسم کی گرمی تک محسوس ہوتی ہے۔ پھر اردو زبان پر آغا سہیل کو جو قدرت حاصل ہے اس سے ان افسانوں میں نفسیاتی کیفیتوں اور ڈھکے چھپے

جذبوں کی انتہائی نازک پرتوں کا اظہار بھی بڑے سلیقے کے ساتھ ہوا ہے۔ یہ ہمیشہ زندہ رہنے والی کہانیاں ہیں۔ اردو افسانے کے قارئین اگر یہ افسانے نہیں پڑھیں گے تو اپنے آپ پر ظلم کریں گے۔

(رسالہ فنون دسمبر ۱۹۷۵ء)

بدلتا ہے رنگ آسماں

ڈاکٹر محمد علی صدیقی

آغا سہیل کو برصغیر کی زوال پذیر مسلم اشرافیہ کی مرقع نگاری پر بڑا عبور حاصل ہے۔ جس طرح عصمت چغتائی یوپی کے مسلم متوسط طبقے کی تصویر کشی کے لئے اور احمد ندیم قاسمی' بلونت سنگھ' جمیلہ ہاشمی اور غلام الثقلین ہاشمی پنجاب کے دیہات کی زندگی کو "زندہ" پیش کرنے کے لئے اور سعادت حسن منٹو اور کرشن چندر شہری زندگی کی چیرہ دستیوں کو سمجھنے اور ہماری زندگی میں "لمحہ" کو سماجی تاریخ کے مناظر میں دیکھنے کے لئے مشہور ہوئے اسی طرح آغا سہیل اور ان کے چند اور ہم عصر زوال پذیر مسلم اشرافیہ کی جھٹ پٹے وقت TWILIGHT کی تصویر کشی کے لئے خاصے اہم نام بنتے جا رہے ہیں۔ البتہ انہوں نے اب تک پرانی یادوں کے کھنڈروں پر تعمیر نو کی آس نہیں چھوڑی ہے۔

آغا سہیل نے اودھ کے زوال پذیر جاگیرداری اور زمینداری نظام کی باقیات پر اپنی مضبوط گرفت سے اردو افسانہ کو چند ایسے کردار دیئے ہیں جو بہت سے قارئین کے لئے "غیر حقیقی" ہوں تو ہوں لیکن ان کرداروں سے دور کی شناسائی رکھنے والوں کے لئے یہ کافی حقیقی ہیں۔

آغا سہیل نے اپنے ادبی سفر کا آغاز پروفیسر احتشام حسین مرحوم کی رہنمائی میں شروع کیا تھا۔ اور ہر چند کہ پروفیسر احتشام حسین اور ان کے شاگردوں کے درمیان مکمل ذہنی وابستگی رہی اور ہے لیکن آغا سہیل اپنے افسانوں میں جس "ماحول" کو یاد کرتے ہیں اور جن کرداروں کو اسٹیج پر لاتے ہیں ان سے احتشام صاحب اپنے انتقال سے کچھ سال پہلے

ہی مانوس ہوئے۔ جب انہیں یادوں' کے بطن سے امید اور رجائیت کی کونپلیں پھوٹتی ہوئی نظر آنے لگیں۔

آغا سہیل کی فکر کا اندازہ ان کے ناول "غبار کوچہ جاناں" سے لگایا جاسکتا ہے۔ یہ ناول ہم عصری تاریخ سے متعلق ہے۔ قبل از تقسیم اور بعد از تقسیم برصغیر کی روشنی میں ایک شخص اور ایک انجمن کے بدلتے ہوئے رنگ ہیں۔ اس ناول کی مدد سے آغا سہیل کے بہت سے افسانوں سے زیادہ بہتر انداز میں لطف اندوز ہوا جاسکتا ہے۔ افسانہ بہر حال زندگی کا ایک رخ اور ایک جز ہوتا ہے۔ اس سے بہت زیادہ ہم جہتی اور کلیت کی توقع خود قاری کا ذہن رسا پوری کر سکتا ہے لیکن ناول کے کردار اپنی پوری زندگی اور اپنے پورے World Outlook کے ساتھ ہمارے سامنے آتے ہیں۔ احتشام حسین صاحب نے اس ناول کے بارے میں تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا:۔

"ناول (غبار کوچہ جاناں) میں بعض نظریات کے باوجود ہنر مندی اور ناول کی تکنیک پر مضبوط گرفت سے میں متاثر ہوا۔ زبان و بیان کی خوبیاں بھی ہیں اور کردار نگاری میں نفسیاتی الجھنوں کو مناسب مقام دیا گیا ہے۔ ناول کا انداز' منظر نگاری وغیرہ سب بہت خوبصورت ہیں۔ بحیثیت مجموعی مجھے ناول پسند ہے۔"

ڈاکٹر محمد حسن نے احتشام صاحب کی تنقید پر "شاہراہ" کے احتشام حسین نمبر میں شائع شدہ اپنے مضمون میں ان خصوصیات کا بہت خوبصورتی سے ذکر کیا ہے جو احتشام صاحب کو دیگر ترقی پسند نقادوں سے مختلف بناتی ہیں۔ احتشام صاحب میکانکی ترقی پسند نقاد نہیں تھے بلکہ وہ ہر فن پارہ کو مصنف کی شخصیت اور زیر مطالعہ تخلیق میں پیش کردہ جذبہ اور تجربہ کی پہنائیوں میں اتر کر دیکھنا چاہتے تھے۔

زیر نظر مجموعہ میں جو ۱۹۵۰ء سے ۱۹۷۵ء پر محیط ہے ۲۳ افسانے ہیں۔ جن میں روایتی' بیانیہ اور ترقی پسندانہ افسانوں کے علاوہ جدید تاثراتی اور علامتی افسانے بھی شامل ہیں۔ ان افسانوں میں بطور خاص "موئے آتش دیدہ"' "بدلتا ہے رنگ آسماں"'

"من ماں راکھوں من جرے" "کنجی" "سہ پہل" "شگاف در" "ٹوٹی چٹنی" اور چنگا میں افسانے کو تکنیک کی بڑی مشاقی اور دھیمے پن سے برتا گیا ہے اور اس دور میں جب کہ کچھ حضرات اپنے تئیں "بیانیہ" افسانہ کو تاریخ کے Junkyard کے سپرد کرچکے ہیں زندگی کی تپش کو اس طور اجالا کیا ہے کہ کہانی میں دلچسپی باقی رہتی ہے۔

آغا سہیل کے افسانوں میں اگر "موئے آتش دیدہ" جیسا سوانحی افسانہ ہے جس سے مصنف کا خاندانی پس منظر اجاگر ہوتا ہے اور "بدلتا ہے رنگ آسماں" جیسا افسانہ ہے جس سے یہ پس منظر اندھیرے سے اجالے کی طرف آتا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کے یہاں صرف یادیں ہیں اور کچھ نہیں۔ وہ اردگرد کے حالات سے شدید متاثر ہوتے ہیں۔ ان کے افسانہ "کنجی" کا کردار مکھن سنگھ اگر پرمیشر سنگھ کے قبیلہ کا انسان دوست فرد نہیں ہے تو کیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ساتھ ہی ساتھ انہوں نے "ٹھکانہ کہیں نہیں" جیسا افسانہ بھی لکھا ہے۔ جہاں وہ ایک بڑے المیہ کے آشوب میں بہہ گئے ہیں اور کافی جذباتی ہوگئے ہیں لیکن جو شخص اس افسانے کی طاہرہ باجی کے المیہ پر افسوس نہیں کرسکتا وہ شاید گناہ سے محبت اور گناہ گار سے نفرت کرتا ہے۔ وہ ایک بہت چھوٹی سی جذباتیت کو اپنی دانش ورانہ تنگ نظری کی وجہ سے وسیع تر سیاق و سباق سے الگ کرکے بہت میکانکی انداز سے مظلوم انسانیت سے محبت میں بھی کوتاسسٹم کو روا رکھتا ہوگا۔

"سہ پہل" "ٹوٹی چٹنی" "شگاف در" جدید افسانے ہیں اور ان افسانوں کا طرہ امتیاز شکست و ریخت ہے۔ اور وہ غیر محسوس سا احساس اجنبیت ہے جس سے اختلاف تو کیا جاسکتا ہے لیکن اغماض نہیں۔

آغا سہیل کو افسانہ نگاروں کی صف میں یہ مقام ایک عمر کی دشت پیمائی اور کاوش کے بعد تحقیق و تدقیق کی عزلت نشینی میں میسر آیا ہے۔

(پاکستانی ادب 'اگست ۱۹۷۵ء)

<u>بدلتا ہے رنگ آسماں</u>

سہیل احمد خاں

آغا سہیل کے افسانے دو قسم کے تجربات سے تشکیل پاتے ہیں ان افسانوں کا خاص الخاص موضوع ایک ایسے طریقہ زندگی سے متعلق ہے جو فنا پذیر ہے اور جس میں لکھنؤ کے ادب اور ادیبوں کی خصوصیات اور ثقافتی ماحول کے اقدار کی یادیں تھیں۔

آغا سہیل کے افسانے ماضی قریب کی معاشرتی تبدیلیوں سے متعلق ہیں اور انہیں نمایاں کرتے ہیں۔ آغا سہیل اندوہ گیں نگاہوں سے ان اخلاق گراوٹوں' ہجرتوں اور تصادموں کو دیکھتے ہیں جو برصغیر کی تقسیم کے نتیجے میں رونما ہوئے۔ کتاب کا عنوان بھی اسی طوفانی انقلاب کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

آغا سہیل زندگی کو سنجیدگی کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ وہ بہترین نثر نگار ہیں اور ان کے پیش کردہ کردار زندہ ہیں لیکن افسانوں کے مجموعہ کا تاثر زیادہ گہرا اور تابناک نہیں ہے۔ ان کی مشکل خود ان کا ایک طرفہ طرز عمل ہے۔ وہ اس قدر حساس ہیں کہ جدید دور کے بھیانک واقعات کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ انہوں نے ایک شریف انسان کی طرح بدلتی ہوئی معاشرتی حقیقتوں پر تنقید کی ہے لیکن معاشرتی حقیقتیں بڑی پیچیدہ ہیں اور ہلکے اور معمولی طرز عمل سے وہ حل نہیں ہو سکتیں۔ جدید افسانہ نگاروں کو قدروں کی طرح کی ہیجانی کیفیتوں کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ آغا سہیل میں یہ نئی حساسیت نہیں ہے یہ ایک ایسا نقص ہے جس کی وجہ سے وہ موجودہ معاشرتی ماحول کی صحیح تصویر کشی نہ کر سکے۔ ان کی ذہانت فقط ان کہانیوں میں نمایاں ہوئی جن کا تعلق لکھنؤ کے ادبی اور معاشرتی پس منظر سے ہے۔ (ترجمہ)

روزنامہ پاکستان ٹائمز ۱۳ اگست ۱۹۷۵ء

بدلتا ہے رنگ آسماں

ڈاکٹر انور سدید

آغا سہیل گزشتہ ربع صدی سے افسانے لکھ رہے ہیں۔ ان کی ادبی شخصیت کا نقش اس وقت نکھر کر سامنے آیا جب انہوں نے سید احتشام حسین اور سجاد ظہیر پر خاکے

لکھے۔ تب اردو کے نقاد محمد علی صدیقی نے توجہ دلائی کہ آغا سہیل کی بنیادی حیثیت تو افسانہ نگار کی ہے اور وہ ایک عرصے سے اس دشت کی سیاحی کر رہے ہیں۔ ثبوت "بدلتا ہے رنگ آسماں" ہے جو ان کے چودہ افسانوں کا مجموعہ ہے یہ گزشتہ پچیس برس میں لکھے گئے ہیں۔ چنانچہ اس مجموعے میں اردو افسانے کے بیشتر نئے اور پرانے رجحانات کی جھلکیاں موجود ہیں۔ بعض افسانے خالصتاً معاشرتی ہیں اور ان میں مصنف کا اصلاحی جذبہ صاف دکھائی دیتا ہے۔ چند ایک افسانوں پر ترقی پسندیت غالب ہے اور ان میں افسانہ پروپیگنڈا کی سطح کو چھوتا ہوا نظر آتا ہے۔ کچھ افسانوں میں صرف ایک لمحاتی تاثر کو گرفت میں لینے کی کوشش کی گئی ہے۔ جب کہ چند ایک افسانے علامتی طرز اظہار میں بھی لکھے گئے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آغا سہیل ادب کو کسی ایک خانے میں مقید نہیں کرتے بلکہ ہر نئے تجربے کو اپنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں ایک خاص تہذیبی ماحول جو اب خواب و خیال ہو چکا ہے' اپنی جھلکیاں خوب دکھاتا ہے اور آغا سہیل کا قلم اس ماحول کی عکاسی میں زیادہ رواں نظر آتا ہے۔ زیر نظر مجموعے کے افسانے "موئے آتش دیدہ" ۔ "شگاف در" ۔ "ٹوٹی چمنی" ۔ "بدلتا ہے رنگ آسماں" ۔ "ٹھکانہ کہیں نہیں" وغیرہ کو قاری عرصے تک یاد رکھے گا۔

(رسالہ اوراق لاہور۔ نومبر ۱۹۷۵ء)

<u>بدلتا ہے رنگ آسماں</u>

سحر انصاری

آغا سہیل ایک افسانہ نگار' نقاد محقق اور معلم کی حیثیت سے کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ برصغیر کے ثقہ اور معیاری ادبی رسائل میں ان کی تحریریں بالالتزام شائع ہوتی رہی ہیں۔ آغا سہیل کے افسانے اور تنقیدی آراء جو ان کے مضامین اور تبصروں میں ظاہر ہوئی ہیں ادبی حلقوں میں گفتگو کا موضوع بنتی رہی ہیں لیکن ہمارے یہاں تحریروں میں خاطر خواہ بلکہ از سر نو توجہ اس وقت دی جاتی ہے جب ان کا کوئی مجموعہ کتابی صورت میں مرتب کر دیا گیا ہو۔

آغا سہیل کے افسانے "بدلتا ہے رنگ آسماں" کے نام سے شائع ہوئے ہیں۔ اس سے قبل ان کا ایک ناول غبار کوچہ جاناں منظر عام پر آچکا ہے اور ارباب علم و ادب سے خراج تحسین حاصل کرچکا ہے۔ ان کے مقالات کا مجموعہ "معارف سہیل" حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ سرور سلطانی کی ترتیب و تالیف نیز دبستان لکھنؤ کا داستانی ارتقاء' آغا سہیل کی تحقیقی صلاحیتوں کے آئینہ دار ہیں۔

آغا سہیل کی تحریروں سے صحیح انصاف کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ان کا ادبی و ذہنی پس منظر نگاہ میں رہے۔ آغا سہیل کا تعلق لکھنؤ سے ہے۔ ان کی ساری تعلیم لکھنؤ ہی میں ہوئی اور پروفیسر احتشام حسین جیسے استاد کی خصوصی توجہ انہیں حاصل رہی۔

آغا سہیل نے ایک ذہین' حساس اور ارادت مند شاگرد کی طرح احتشام صاحب سے بہت کچھ سیکھا۔ آغا سہیل کی تنقیدی آراء اور انداز نگارش میں احتشام صاحب کے سے توازن تک پہنچنے کی کوشش ملتی ہے جو بلاشبہ ایک فال نیک ہے۔

لکھنؤ سے گہری اور طویل وابستگی کا شاید یہ نتیجہ ہے کہ آغا سہیل کے افسانوں تحریروں کی فضا اور ان کے کردار لکھنؤ سے نکلنے نہیں پاتے۔ کہیں کہیں ناسٹلجیا کی کیفیت ہے۔ لیکن زیادہ تر ایک تہذیبی سفر کی داستان ہے جسے عہد حاضر کی تلخ حقیقتوں کے آئینے میں دیکھا اور دکھایا گیا ہے۔

آغا سہیل نے چونکہ نثر کی بعض اہم اصناف پر توجہ دی ہے اور ان کے امکانات کو علمی طور پر برتا ہے۔ اس لئے ان کے یہاں تحریر کی لفظی و معنوی ساخت کا گہرا شعور ملتا ہے وہ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں بآسانی کہہ جاتے ہیں کیونکہ اس آسانی تک پہنچنے کے لئے انہوں نے اسالیب بیان کی دشوار گزار وادیوں کا سفر طے کیا ہے۔ لکھنؤ قرۃ العین حیدر کے یہاں بھی ہے۔ لیکن آغا سہیل نے اپنے افسانوں میں جس لکھنؤ کو پیش کیا ہے۔ وہ منتخب اور محدود گوشوں کے بجائے پوری تہذیب تک پہنچا دیتا ہے۔ اس ضمن میں ان کے افسانے "ہار" ٹھکانہ کہیں نہیں۔ من ماں راکھوں من جرے" "موئے آتش دیدہ" اور "گل سرا" بطور خاص قابل مطالعہ ہیں۔

آغا سہیل نے گردو پیش کی زندگی کو لکھنؤ کے حوالے سے جس طرح دیکھا اور محسوس کیا اس کی جھلک ان افسانوں میں نظر آتی ہے جن کا ابھی ابھی میں نے ذکر کیا ہے۔ لیکن پاکستان کی سماجی' قومی اور اجتماعی ہیئت سے جو مسائل پیدا ہوئے ہیں ان کا شعور بھی آغا سہیل کے بعض افسانوں میں بڑی خوبی سے ظاہر ہوا ہے بعض سماجی حقائق مختصر افسانوں میں ڈھل گئے ہیں۔ ان میں بازی گر' آخری مورچہ' سہ پہل' رشوت' سور دار کوٹ اور شگاف ور ایسے افسانے ہیں جو آغا سہیل کے فنی معیار اور تکنیک کی دسترس کو ظاہر کرتے ہیں۔

افسانے میں اب جو باتیں مسلمات کا درجہ حاصل کر چکی ہے مجھے ان کے بارے میں کچھ نہیں کہنا۔ کیونکہ آغا سہیل ان افسانہ نگاروں میں سے ایک ہیں جو یہ جانتے ہیں کہ معیاری زبان و بیان' منظر نگاری' کردار کشی اور نفسیاتی و سماجی نزاکتوں کے تخلیقی اظہار کے بغیر افسانہ نگاری کی خواہش بے سود ہے۔ آغا سہیل کہانی کے فن پر بھرپور دسترس رکھتے ہیں۔

(ماہنامہ افکار کراچی۔ فروری ۱۹۷۶ء)

<u>بدلتا ہے رنگ آسماں</u>

ڈاکٹر سلیم اختر

کچھ لوگ ایسے خاموش گوشوں میں رہتے ہیں اور ایسے شریف ہوتے ہیں کہ کبھی ان کی شخصیت باعث نزاع نہیں بنتی اور نہ کبھی ان کی تحریریں متنازعہ ہوتی ہیں۔ اس کا فائدہ ہو یا نہ ہو۔ نقصان البتہ یہ ہوتا ہے کہ یہ Instant Coffee کی مانند ان لوگوں کو کبھی بھی Instant Fame نہیں مل سکتی۔ ایسے لوگ تعلقات عامہ کے فن لطیف کے بھی اہل نہیں ہوتے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ عمر بھر لکھنے اور چھپنے کے باوجود بھی یہ لوگ اس لحاظ سے ہمیشہ "نئے" رہتے ہیں کہ کبھی کالموں کا موضوع نہ بن سکے۔ ہمارے ملک میں ایسے شریف اہل قلم کی کمی نہیں اور آغا سہیل بھی اس زمرے میں آتے ہیں گو افسانوں کے اس مجموعے

سے پہلے "غبار کوچہ جاناں" کے نام سے ناول چھپ چکا ہے اور اسے ناقدین نے سراہا بھی تھا لیکن بات وہی رہی کہ اب دو درجن افسانوں کے اس مجموعے کی صورت میں افسانہ نگار نے عمر بھر کی کمائی پیش کر دی لیکن ناقد یہ سوچ رہا ہے کہ اس مجموعہ کو کس ادبی گروپ یا خانے میں فٹ کرے کہ اب معاصر ناقدین کا اہم ترین منصب تخلیقات کو خانوں میں فٹ کرنا ہی قرار پاتا ہے۔

آغا سہیل کے افسانوں اور تدبیر کاری کا مطالعہ دشوار نہیں کیونکہ اس نے کہیں بھی اپنے فنی منصب کو چھپانے کی کوشش نہیں کی۔ وہ ایک حقیقت پسند اور حقیقت نگار افسانہ نگار ہے۔ چنانچہ وہ اپنے مشاہدات کو ریزہ ریزہ جمع کرتا ہے اور پھر ان سے زندگی کے کسی ایک پہلو کسی ایک گوشے' کسی ایک خوشی' کسی ایک المیہ کی تصویر کشی کرتا ہے۔ چنانچہ وہ "چینگا" لکھے یا "رشوت" "خون چمن" ہو یا "آخری مورچہ" یا پھر "قوم" "زبان خنجر" یا "آخری ہاتھ" ایسے افسانوں میں اس نے زندگی کے بارے میں اپنے فنی رویہ کو غیر مبہم اور قطعی انداز میں پیش کرنے کی سعی کی ہے اور اس میں وہ کامیاب بھی رہا ہے۔

اس کامیاب حقیقت نگاری کی غالباً یہ وجہ ہے کہ جس وقت آغا سہیل کے ادبی ذوق نے آنکھیں کھولیں اور فنی شعور نے پختگی حاصل کی تو یہ ترقی پسند ادب کی تحریک کے عروج اور مقبولیت کا زمانہ تھا۔ اس تحریک کے مثبت اور منفی پہلوؤں سے قطع نظر اس بات پر یقیناً زور دیا جاسکتا ہے کہ اس نے زندگی کے بارے میں حقیقت پسندانہ رویہ اپنانے اور اسلوب و تکنیک سمجھانے میں نئے لکھنے والوں کی رہنمائی کی۔ چنانچہ ایسے افسانہ نگاروں کی کمی نہیں جو اس تحریک کے مخصوص عقائد اور سیاسی مقاصد کے تو مخالف تھے لیکن اسلوب' تکنیک اور انداز ابلاغ میں ان سے ہم آہنگ سمجھے جاسکتے ہیں اور آغا سہیل کو بھی باآسانی افسانہ نگاروں کے اس گروہ میں شامل کیا جاسکتا ہے۔ وہ زندگی کو غیر ضروری طور پر نہ تو بد صورت اور کریہہ منظر دکھاتا ہے اور نہ ہی اسے خوش رنگ تصویر کی طرح پینٹ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ چنانچہ افسانہ "سوور دار کوٹ" کا آغاز جس طرح سے کیا ہے اس سے آغا سہیل کی تدبیر کاری واضح ہوتی ہے۔

"ہوا بھی یہی کہ اڈے پر اب جو رکشے آنا شروع ہوئے۔ جس ڈرائیور کو دیکھو وہی بھڑکیلے اور چمکدار اصلی اون کے سویٹر جھاڑے اونچی بنا کر اکڑا ہوا اپنی نشست پر جما ہوا ہے۔ ہر رکشے والا ایک سے ایک اچھا سویٹر اور ایک سے ایک بڑھیا گرم پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ٹھونس کر رکشے کی سیٹ پر سے اٹھ کر یوں سڑک پر اینٹھتا چلتا ہے جیسے کوئی مغل شہزادہ شالا مار میں گشت کے لئے نکلا ہے۔ بھئی حد ہو گئی اب تو بے حیائی کی اچھی بھلی اونچے اونچے گھرانوں کی بیگمات اور بہو' بیٹیاں ٹھسے سے اپنی لمبی لمبی کاروں سے اترتیں اور سیدھی دو روپے' چار روپے سویٹروں پر ٹڈی کی طرح ٹوٹتیں۔ اسے یاد آیا کہ آج دوپہر جب رکشا روک کر دو چار نوالے زہر مار کرنے کو وہ اپنے گھر گیا تو گھر کی بھنگن کیا بڑھیا سویٹر پہنے ہوئے جھاڑو دے رہی تھی کہ وہ ٹھٹھک کر رہ گیا۔"

اس کردار کی مانند افسانہ نگار بھی زندگی کے ایسے گوشوں کو دیکھ کر ٹھٹھک کر رہ جاتا ہے اور یہ افسانے اس ٹھٹھک جانے کی ادا کا ثمر ہیں۔

(ماہنامہ کتاب لاہور۔ دسمبر ۱۹۷۵ء)

بدلتا ہے رنگ آسماں

زرینہ اجمل

آغا سہیل اردو کے جانے پہچانے ادیب ہیں۔ افسانوں کے اس مجموعے سے پہلے ان کا ایک ناول "غبار کوچہ جاناں" اور کئی علمی تصانیف شائع ہو کر قبول عام کی سند پا چکی ہیں اور علم و ادب کی دنیا میں نئے انداز اور افق روشناس کروا چکی ہیں۔ آغا سہیل اس عہد کے جواں سال افسانہ نگاروں میں سے ہیں۔ جن کی شعور کی عمر میں ترقی پسند افسانہ

اپنے عروج پر تھا اور روایتی افسانہ دم توڑ چکا تھا پھر اس کے بعد جب وہ ادب میں اپنا نام و مقام بنا رہے تھے تو علامتی افسانے کا ظہور ہوا۔ آغا سہیل نے ان میں سے کسی بھی سٹائل کو اپنے لئے مخصوص نہیں کیا بلکہ کہانی کے انداز میں افسانہ لکھنے کی کوشش جاری رکھی اور اس میں وہ اپنا اسلوب بھی بنانے میں کامیاب ہوئے اور ادب کی دنیا میں انفرادیت بھی ہوئی۔

آغا سہیل مکمل آگہی کا افسانہ نگار ہے اور جو وہ دیکھتا ہے اسے اپنے فن میں سمو کر قارئین کے سامنے پیش کر دیتا ہے یوں اسے حقیقت نگار افسانہ نویس بھی کہا جا سکتا ہے جو زندگی کے بھیانک پہلوؤں کو بھی اسی ذہانت سے سامنے لاتا ہے جیسے اس کے خوب صورت رخ کی عکاسی کرتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کے افسانے فنی نقطہ نگاہ سے غیر مبہم اور قطعی انداز لئے ہوتے ہیں۔

قیام پاکستان کے بعد اگرچہ بے شمار لوگ اپنا سب کچھ لٹوا کر پاکستان میں داخل ہوئے تھے مگر وہ اپنے ساتھ اپنی اپنی تہذیب اور معاشرت کی گمبھیر یادیں ضرور بچا لائے تھے۔ آغا سہیل بھی اسی قافلے کا مسافر ہے۔ اور اس کے افسانوں میں ایک مخصوص تہذیبی روایت اور اخلاقی قدروں کا رچاؤ اور نئے پنپتے ہوئے معاشرے کی دھندلی دھندلی تبدیلیوں کا امتزاج جھلکتا ہے اس کی مثال "پرچم" "بازی گر" اور "ٹھکانہ کہیں نہیں" قسم کے افسانے بنتے ہیں۔ کتاب کی کتابت و طباعت عمدہ اور سرورق معنی خیز ہے۔

(ماہنامہ تخلیق لاہور دسمبر ۱۹۷۵ء)

معارف سہیل

رئیس امروہوی

آغا سہیل کا شمار اردو زبان کے معروف اہل قلم میں ہوتا ہے۔ معارف سہیل ان کی تازہ کاوش فکر و تراوش قلم ہے۔ یہ چند مقالات خاکوں اور مضامین کا مجموعہ ہے۔ خاکوں میں احتشام حسین، سید سجاد ظہیر، اثر لکھنوی، ابوالاثر بہزاد، اور سید آل رضا کی

شخصیتوں کے بعض پہلوؤں کی عکاسی کی گئی ہے۔ مضامین و مقالات میں جدید اردو غزل کی دروں بینی' انار کلی پر ایک نظر اور تنقید کا ارتقاء وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ یہ کتاب ہلکے پھلکے شگفتہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس کے مطالعے سے دماغ بوجھل ہو جانے کی بجائے دل شگفتہ ہو جاتا ہے۔ اس میں مصنف کے حسن وبیان کو بھی دخل ہے۔

(روزنامہ جنگ ۷ ستمبر ۱۹۷۵ء)

معارف سہیل

احمد ندیم قاسمی

افسانہ نگار اور ناول نگار آغا سہیل اردو کے ایک نہایت عمدہ نقاد بھی ہیں۔ "معارف سہیل" میں انہوں نے اپنے تنقیدی مضامین اور بعض شخصیات کے کرداری خاکے جمع کر دیئے ہیں۔ شروع ہی میں عرض کر دیں کہ ہم کتاب کے اس انداز ترتیب سے متفق نہیں ہیں۔ اگر مصنف کچھ مدت اور انتظار کر لیتے تو تنقیدی مضامین اور کرداری خاکوں کے دو الگ الگ مجموعے مرتب کئے جا سکتے تھے۔ اب "معارف سہیل" کو تنقیدی مضامین کا مجموعہ قرار دیا جائے تو اس میں شامل خاکے ایسا نہیں کرنے دیتے اور اگر خاکوں کا مجموعہ قرار دیا جائے تو تنقیدی مضامین راستہ روکتے ہیں۔ البتہ یہ بات طے ہے کہ تنقیدی مضامین ہوں یا کرداری خاکے آغا سہیل نے دونوں اصناف کا حق ادا کر دیا ہے۔ آغا صاحب بنیادی طور پر تخلیقی فنکار ہیں اس لئے ان کی تنقیدی صلاحیتوں میں ان کے تخلیقی رویے کا بڑا ہاتھ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مضامین تنقید کو تخلیق کے مرتبے پر پہنچا دیتے ہیں۔ "جدید اردو غزل کی دروں بینی" "انار کلی پر ایک نظر" اور "اردو تنقید کا ارتقاء" ہمارے آج کل کے ترقی یافتہ تنقیدی معیاروں کے بلیغ ثبوت ہیں۔ آغا سہیل کا تنقیدی رویہ نہایت درجہ منصفانہ اور غایت درجہ غیر متعصبانہ ہے۔ وہ زندگی کی توانائی اور انسان کی عظمت کے قائل ہیں لیکن اگر انہیں اپنے نقطہ نظر کے مخالف عناصر میں بھی کہیں اعلیٰ فنکاری کی جھلک نظر آتی ہے تو وہ نہایت دیانت کے ساتھ اس کا اعتراف کرتے ہیں۔ یہ وسیع القلبی بہت کم نقادوں کے حصے میں آتی ہے۔ پروفیسر سید احتشام حسین' سید سجاد ظہیر' اثر لکھنوی اور

ابوالاثر بنزاد کے کرداری خاکے' اردو میں خاکہ نویسی کے مستقبل کے تابانی کے نقیب ہیں۔ ان خاکوں میں مصنف کا رویہ بیشتر عقیدت مندانہ ہے مگر انہوں نے سچی بات کہنے سے قطعی گریز نہیں کیا اور یوں اپنے موضوعات کی مکمل شخصیت پیش کر کے اپنے منصب سے نہایت سلیقے کے ساتھ عمدہ برآ ہوئے ہیں۔ آغا سہیل کی تنقیدی صلاحیتوں سے بہترین توقعات وابستہ کی جاسکتی ہیں اور "معارف سہیل" کو ان کی تنقید نگاری اور خاکہ نویسی کے امکانات سے پر آغاز قرار دیا جاسکتا ہے۔

(رسالہ فنون لاہور دسمبر ۱۹۷۵ء)

معارف سہیل

پروفیسر سحر انصاری

آغا سہیل کی دوسری کتاب "معارف سہیل" مقالات پر مشتمل ہے معارف سہیل میں گیارہ مقالات شامل ہیں۔ ان میں شخصیات سے متعلق مقالات ادبی خاکہ نگاری اور محاکمہ فن کے امتزاج کی بڑی عمدہ مثال ہیں در بغل دارد کتاب (احتشام حسین) سجاد ظہیر' اثر لکھنوی اور ابوالاثر بنزاد معارف سہیل کے غیر رسمی اور منفرد مقالات ہیں۔ غیر رسمی اور منفرد میں نے اس لحاظ سے کہا ہے کہ ان سے تعلق رکھنے والی ہر شخصیت سے آغا سہیل کو ذاتی دلچسپی بھی رہی ہے اور انہوں نے اپنی ذاتی تعلق اور انہماک سے کام لے کر ان شخصیات کے باب میں ایسے ادبی حقائق یکجا کر دیئے ہیں۔ جو صرف آغا سہیل ہی کا حصہ ہیں۔ آغا سہیل کی ان تحریروں میں تنقیدی رویئے کے ساتھ ساتھ شخصیتوں سے ایک معروضی وابستگی بھی نظر آتی ہے جس کی وجہ سے تحریریں رسمی ہونے کے بجائے تخلیقی اور پر تاثیر ہو گئی ہیں۔

احتشام حسین اور سجاد ظہیر کے بارے میں جو تاثرات ہیں وہ یادوں کا مجموعہ بھی ہیں اور وہ اہم شخصیتوں کے کارناموں کا جائزہ بھی ہے بعض ایسے چھوٹے چھوٹے واقعات بھی اس طرح جزو عبادت بنا دیئے گئے ہیں کہ ان میں شخصیتوں کی محبت' خلوص'

رواداری اور روشن خیالی کی تصویریں اپنے دل کش خدوخال کے ساتھ نظر آنے لگتی ہیں۔

اثر لکھنوی پر مقالہ نسبتہ۔طویل اور مفصل ہے۔ اثر صاحب پر کم لکھا گیا ہے اور ادبی حلقوں میں ان کی اہمیت کو اس سے بھی کم محسوس کیا گیا ہے۔ آغا سہیل نے بڑی خوبی سے اثر صاحب کی شخصیت اور ان کے فن پر روشنی ڈالی ہے۔

"معارف سہیل" میں محمد حسین آزاد پر دو مقالات ہیں جو ان کی طرز نگارش سے تعلق رکھتے ہیں۔ جدید اردو غزل کی دروں بینی' اردو تنقید کا ارتقاء اور غالب کی ظرافت۔ آغا سہیل کی نظری و عملی تنقید کے نمونے ہیں۔ غزل پر ہمارے یہاں تاریخی نوعیت کے مضامین کثرت سے لکھے گئے ہیں۔ لیکن کسی خاص موضوع یا تھیم کو بنیاد بنا کر غزل یا شاعری کی دیگر اصناف پر کم لکھا گیا ہے۔ آغا سہیل نے اس ضمن میں دروں بینی کا موضوع چھیڑ کر ایک نئی جہت پر توجہ دی ہے۔

جدید مرثیہ نگاری میں سید آل رضا کو میر کارواں کی حیثیت حاصل ہے۔ آغا سہیل نے جدید مرثیہ کا پس منظر بیان کرتے ہوئے آل رضا اور ان کے معاصرین کی مرثیہ گوئی کا جائزہ لیا ہے اور آل رضا کی مرثیہ گوئی کی اہمیت واضح کی ہے۔ زیر نظر کتاب میں امتیاز علی تاج کے ڈرامے "انار کلی" کا تنقیدی جائزہ بھی شامل ہے۔ مغرب میں ڈرامے کی جو تفسیر و تعبیر پیش کی گئی ہے اس کی روشنی میں تاج کے ڈرامے کا مطالعہ کر کے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ فنی اعتبار سے ڈرامے میں جن اجزائے ترکیبی کی ضرورت ہوتی ہے۔ امتیاز علی تاج نے ان کا ہر طرح لحاظ رکھا ہے اس مقالہ کے ضمن میں ایک ضمنی سی بات جملہ معترضہ کے طور پر کہنا چاہوں گا۔ ڈرامے کی تین وحدتوں (Three Unities) کا تصور ارسطو سے منسوب کیا گیا ہے۔ مغرب میں بھی خاصی مدت تک یہ غلط فہمی رہی ہے۔ ان وحدتوں کا ارسطو سے کوئی تعلق نہیں' یہ نوکلاسیکی نقادوں کی اختراع ہے۔ جس پر بیشتر لکھنے والوں نے آنکھ بند کر کے صاد کیا ہے۔

ہمیں امید ہے کہ "معارف سہیل" کے مقالات اپنے موضوعات کی انفرادیت' تنوع اور معنوی خوبیوں کی وجہ سے تنقیدی ادب میں ایک خاص مرتبہ حاصل

کریں گے۔

(ماہنامہ افکار' کراچی فروری ۱۹۷۲ء)

شہرنا پرساں

ڈاکٹر سلیم اختر

ایک باذوق ادبی نقاد کی حیثیت سے ڈاکٹر آغا سہیل نے جو شہرت حاصل کی ہے اسے بطور خاص اجاگر کرنے کی ضرورت نہ ہونی چاہئے کہ اب دنیائے نقد میں ان کی حیثیت مسلمہ ہے لیکن یہ سنجیدہ فکر نقاد بہت اچھا افسانہ نگار بھی ہے۔ اس کا اندازہ ان کے افسانوں کے دوسرے مجموعے "شہرنا پرساں" کا مطالعہ کرتے وقت ہوتا ہے۔ ویسے آغا سہیل کے افسانوں کا پہلا مجموعہ "بدلتا ہے رنگ آسماں" بھی ادبی حلقوں میں سراہا گیا تھا۔ آغا سہیل ایسے افسانہ نگار ہیں جن کا قلم خوب سے خوب تر کی جستجو میں رواں رہتا ہے اور جن کی تخلیقی شخصیت ہمعصر معاشرے سے یوں ہم آہنگ رہتی ہے کہ ان کا افسانہ اپنے عصر کے لئے ایک بلیغ استعارے میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

آغا سہیل نے "بدلتا ہے رنگ آسماں" میں بنیادی طور پر فرد کے جذباتی المیوں کی تصویر کشی کی تھی' ایسے المیے جو معاشرے کے جبر کے باعث جنم لیتے ہیں جبکہ "شہرنا پرساں" میں آغا سہیل نے اس صورت حال کا تجزیاتی مطالعہ کیا ہے جس نے پہلے معاشرے کو مفلوج کیا اور پھر جس کے زیر اثر افراد بے دست وپا ہو کر رہ گئے "نئی بستی" گیوی اے بے بی (جس کا اشفاق نقوی نے انگریزی بے حد خوبصورت ترجمہ بھی کیا) "لمس دیوار" "ہاتھی کے دانت" "سانچ کی آنچ" اور انا اللہ جیسے افسانے اس ضمن میں بطور مثال پیش کئے جاسکتے ہیں۔ ان سب افسانوں میں آغا سہیل نے معاشرے اور فرد کی اس Equation کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی ہے جس میں اگر نقطہ اعتدال نہ رہے تو یہ دونوں میزان کے دو پلڑے بننے کے برعکس چکی کے دو پاٹوں میں تبدیل ہو کر انفرادی خوشی' اقدار' عزت اور عزت نفس سب کو پیس ڈالتے ہیں۔ اسی انداز کے افسانوں میں آغا سہیل

کا فن خوب نکھرتا ہے کیونکہ وہ اس انداز سے بات کرتا ہے گویا بات کی ہی نہیں جاری اور یہی وجہ ہے کہ ان سیدھے سبھاؤ کے افسانوں میں غضب کی کاٹ ملتی ہے۔

ہمارے ہاں علامتی اور تجریدی افسانے کی بحث خاصی پرانی ہو چکی ہے اور اس کی موافقت اور مخالفت میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے' اس لئے ان سب پر تبصرہ کرنا تو لاحاصل ہے تاہم اس پر یقیناً زور دیا جا سکتا ہے کہ جو دور "افشا" کی بجائے "اخفا" کے تقاضے کرتا ہو اس دور میں استعارہ اور علامت اچھی خاصی نعمت ثابت ہوتی ہے چنانچہ عصری صورت کی تصویر کشی کے لئے آغا سہیل نے بھی استعارہ اور علامت کا سہارا لیا ہے۔ آغا سہیل کی ذہنی تربیت حقیقت نگاری کے افسانے سے ہوئی تھی اور انہوں نے زیادہ تر اسی روایت ہی میں افسانے قلمبند کئے' اس لئے استعارہ اور علامت کو اپناتے وقت وہ ابلاغ کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کرتے۔ اسی لئے انہوں نے اپنے قاری کو کبھی بھی تجرید کی بھول بھلیوں میں بھٹکنے کے لئے نہیں چھوڑ دیا۔ "شہر نا پرساں" کا آخری افسانہ "کھڑکی" کو اسی انداز کی ایک کامیاب مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے ناگفتنی کے دریا کو چار صفحے کے اس افسانے کے کوزے میں بند کر دیا ہے۔ اس افسانے کا فنی کمال یہ ہے کہ باشعور قاری کے لئے اس افسانے میں بہت کچھ ہے جبکہ اس کے برعکس قاری بھی اس میں سے اپنے لئے معانی اخذ کر سکتا ہے' البتہ یہ وہ معانی نہ ہوں گے جن کا ابلاغ افسانہ نگار کا مقصود ہے۔

مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ "کھڑکی" لکھنے کے بعد آغا سہیل نے اپنی تکنیک حاصل کر لی ہے کیونکہ اس کے بعد شائع شدہ افسانوں میں بھی اس نے یہی انداز اور اسلوب اپنایا ہے اس لئے آغا سہیل سے یہ توقع بے سود نہ ہوگی کہ اس کے افسانوں کا نیا مجموعہ وہاں سے شروع ہوگا جہاں پر "کھڑکی" بند ہوتی ہے یا پھر "کھڑکی" کھلتی ہے؟ کون جانے؟؟

(رسالہ فنون لاہور)

ڈاکٹر شبیہ الحسن کی تصانیف

مطبوعہ

آلِ رضا کا فنِ غزل گوئی

(تحقیق و تنقید)

مفاہیم

(مقالات)

ترجیحات

(مقالات)

شام و سحر کی باتیں

(اداریے)

زیرِ طبع

آلِ رضا کا غیر مطبوعہ کلام

(تدوین)

لکھنؤ کی اردو شاعری (۱۹۰۰ء سے ۱۹۴۷ء تک)

(تحقیق و تنقید)

ڈاکٹر شبیہ الحسن کی مرتّبہ کُتب

بُجھی وہ شمع ... (نسیم امروہوی کی شخصیت وفن)

بیسویں صدی کا شعری ادب (شعراء کے کلام کا انتخاب)

العطش (اوّل، دوم، سوم) (سیّد وحید الحسن ہاشمی کے مرثیوں کی تدوین)

منتخب مرثیے (قیصر بارہوی کے مرثیے)

معتبر مرثیے (قیصر بارہوی کے مرثیے)

آیاتِ آمنہ (قیصر بارہوی کا مرثیہ، تنقید)

کلّیاتِ حبیب (حبیب جونپوری کا کلام)

آغا صاحب (ڈاکٹر آغا سہیل کی حیات وفن)



ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نے ڈاکٹر آغا سہیل کی شخصیت اور علم و فن کے بارے میں، متعدد صائب الرائے اہل قلم کے افکار کو کتابی صورت میں یکجا کر کے پاکستان کی ادبی تاریخ کا ایک اہم تقاضا پورا کیا ہے۔ ڈاکٹر آغا سہیل کے علم و فضل اور فکر و فن کی متنوع جہات ہیں۔ ان سب کو ایک کتاب میں اس سلیقے سے سمیٹنا' آغا صاحب سے مرتب کی عقیدت کے علاوہ' ان کی توانا اور ہمہ گیر لگن کا بین ثبوت ہے۔ انہوں نے آغا صاحب کی شخصیت کے علاوہ ان کے افسانوں' سفرناموں' ناول' تنقید اور تحقیق کے الگ الگ عنوانات کے تحت دور حاضر کی بڑی بڑی شخصیات کے وقیع مضامین اس مجموعے میں شامل کئے ہیں۔ یوں یہ مجموعہ آغا صاحب کی سوانح عمری کا کردار بھی ادا کر رہا ہے اور دور حاضر کی ایک اہم ادبی شخصیت کے کمالات فن کے متوازن اذکار سے تاریخ ادب کا ایک الگ باب بھی تکمیل پذیر ہو گیا ہے۔ اس کامیابی کے لئے ڈاکٹر سید شبیہ الحسن بھرپور تحسین کے مستحق ہیں۔

احمد ندیم قاسمی

مجلس ترقی ادب
کلب روڈ' لاہور